شبیہ

سلمیٰ اعوان

الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب

غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

عزیز ترین ہستی

زینب میر حسن

کے نام

جو

محبت وشفقت صبر و تحمل اور ایثار و وفا میں اپنی مثال آپ ہیں

سلمیٰ اعوان

مجھے کچھ کہنا ہے

سارک رائٹرز کانفرنس میں میری ملاقات جواہر لال یونیورسٹی میں شعبہ International languages and cultural ڈپارٹمنٹ کے پروفیسر جناب خواجہ اکرام سے ہوئی۔بہت نفیس اور مخلص سی اس شخصیت نے چھوٹتے ہی کہا۔

ہمارے ڈپارٹمنٹ کی طالبہ پاکستانی خاتون سفرنامہ نگاروں پر پی ایچ ڈی کرنا چاہتی ہے۔آپ سے انہیں ملانا بہت ضروری ہے۔کتابیں بھی ہونی چاہئیں۔

میں سارک رائٹرز کی انتظامیہ کے کہنے پر اپنی چند کتابیں لائی تھی۔رُوس اور مصر کے سفرنامے دیکھ کر اُن کی آنکھیں چمکیں۔ایک اچھے اُستاد کی پہچان۔میری طالبہ کی تو مشکل آسان ہوگئی۔اُنہوں نے کتابیں مجھ سے لے لیں اور یونیورسٹی آنے کی دعوت بھی دے ڈالی۔

آنے سے ایک دن قبل میں یونیورسٹی گئی۔مسرور صغرا سے ملاقات ہوئی۔اُس نے فوراً گلہ کیا۔آپ کے بارے میں انٹرنیٹ پر بہت تھوڑا مواد ہے۔میں تو سخت مشکل

میں تھی۔ کتابیں دیکھ کر حیرت ہوئی ہے کہ اتنا کام کیسے بیٹھی ہیں۔

چند لمحوں کیلئے میں نے سوچا۔ اپنے آپ سے کہا۔

واقعی اِن کاموں میں کتنی پھسڈی ہوں۔

لاہور واپس آئی تو ایجوکیشن کالج کی دو لڑکیاں آگئیں۔ ایک کو سفر ناموں پر تھیسس کرنا تھا اور دوسری کو ناولوں پر۔

چلو سفر نامے تو کچھ تھے ہی۔ مگر پرانے ناول تو میں بھلائے بیٹھی تھی۔ پلیز ہم لوگوں نے نیٹ کھولا تو آپ کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔

اب واقعی سوچنا پڑا۔ ویب سائٹ بنی چاہیے۔ آغاز کے لکھے گئے ناولوں شیبہ، ثاقب اور زرغونہ تقریباً عنقا تھیں۔ بڑی تگ و دو کے بعد ایک ایک نُسخہ کستوری کی مانند ملا۔ گرد آلود، پھٹے پرانے صفحات، ٹوٹی ہوئی جلدیں۔

ورق گردانی کی۔ ظاہر ہے سیدھے سادے رومانی قسم کے ناول تھے۔ درمیان میں گزرے وقت اور ڈھیروں ڈھیر مطالعہ نے ذہن کو کچھ بالغ کر دیا تھا۔ دو تین دن اسی سوچ و بچار میں گزار دیئے۔ پھر سوچا۔

یار جب بندہ نیا نیا جوان ہوتا ہے، جب آسمان پر کمندیں ڈالنے کو جی چاہتا ہے، جب پسینہ گلاب کی سی خوشبو دیتا ہے، جب بندہ خواہ مخواہ ہی رومانوی سا ہو جاتا ہے۔ اُس دور کیلئے بھی تو کچھ ہونا چاہیئے۔ ذہنی بلوغت تو پھر دھیرے دھیرے ہی آتی ہے۔ تو ان دنوں جب جی چاہتا ہے خوبصورتیوں کی باتیں ہو۔ رنگوں اور خوشبوؤں کا ذکر ہو۔ کپڑوں کے تذکرے ہوں اور سب سے بڑھ کر ہیرو اور ہیروئنوں کا کثرت سے میل ملاپ اور محبتوں کے اظہار ہوں۔

اب سچی بات ہے ہمارا تو وہ حال تھا کہ ناول پڑھتے ہوئے ملاقاتوں میں ذرا

تعطل آجاتا۔ بیچ میں کچھ اور قصے شروع ہو جاتے تو خیر سے صفحات پلٹ پلٹ کر دیکھے جاتے کہ اے ہے یہ دونوں کہاں مر گئے ہیں؟ آنہیں پا رہے۔

یقیناً الیکٹرونک میڈیا کی دھواں دھار قسم کی تیز رفتاری نے نئی نسل کو جذبات کے اظہار کیلئے بڑا کھلا ڈلا ماحول دے دیا ہے۔ اور انہیں شاید وہ ڈھکے چھپے جذبات اور باتیں مضحکہ خیز لگتی ہوں۔ جو ہماری رگوں میں سنسنی دوڑانے کا باعث بنتی تھیں۔

سو میں نے تینوں کتابوں کو جھاڑ پونچھ کر انہیں اُسی طرح دوبارہ چھپوا دیا ہے کہ یہ میرے ابتدائی دَور کی یادگاریں ہیں اور انہیں اپنی اصل حالت میں ہی رہنا چاہیے۔

سلمیٰ اعوان

لاہور گیریژن گرامر سکول

اعوان ٹاؤن، ملتان روڈ، لاہور

0301-4038180

042-35961344

باب نمبر: 1

گھر میں داخل ہوتے ہی اسے گہما گہمی کا احساس ہوا۔مشرقی لان کی طرف نگاہ کی جہاں نوکر میزیں سجانے میں مصروف تھے۔ان کے شوروغل اور چیزوں کے باہمی ٹکراؤ سے عجیب بے ہنگم سا شور پیدا ہو رہا تھا۔

''تقریبات کا یہ لامتناہی سلسلہ کبھی ختم بھی ہوگا؟اس نے خود سے پوچھا۔''

''کبھی نہیں''وہ تلخ سی ہنسی ہنس دی۔''

''آخر ختم بھی کیسے ہوں۔می کا تو جیون ہنگاموں سے وابستہ ہے۔گھریلو سکون انہیں بوریت کا احساس دلاتا ہے۔اور پھر بوریت کا یہ جمود ہنگاموں کی شکل میں ٹوٹتا ہے۔بقول ان کے یہ زندگی کی حرارت سے بھرپور محفلیں انہیں حیاتِ نو بخشتی ہیں۔ان کا وجود ہی اگر ختم ہو جائے تو می بھلا کیسے زندگی زندہ رہیں گی''؟

کمرے میں پہنچ کر اس نے کتابیں میز پر پٹخ دیں۔وہ بے پناہ تھکن محسوس کر رہی تھی۔مسلسل تین گھنٹے تک کھڑی ہو کر پریکٹیکل کرنے سے اس کی ٹانگوں میں شدید درد ہو رہا تھا۔

اتنے میں بوڑھی خادمہ چائے لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔اسے یوں لیٹے دیکھ کر محبت سے بولی۔''شیبہ بیٹی تھک گئی ہو۔لو اٹھو چائے پیئو۔پھر تمہیں تیار ہو کر پارٹی میں بھی شرکت کرنی ہے۔اس خادمہ سے شیبہ بہت مانوس تھی۔تقریباً تیرہ چودہ سال سے وہ ان کے ہاں مقیم تھی۔

ذمہ دار اور فرض شناس خاتون تھی۔ اس کا شوہر اور بچے ۱۹۴۷ء کے فسادات کی نذر ہو چکے تھے لیکن کیا مجال جو کبھی آہ بھی ہونٹوں پر لائی ہو"۔

"لو اٹھو بیٹی۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے"۔

"ننکو یہ آج پارٹی کا اہتمام کس سلسلہ میں ہو رہا؟" شیبہ نے کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے پوچھا۔"

"معلوم نہیں بیٹا۔ لو میں اب چلی تم تیار ہو کر نیچے آ جانا"۔

تبھی عمر کرکٹ کا بلا ہاتھ میں پکڑے کمرے میں داخل ہوا۔

"یہ محفل رنگ و بو؟" شیبہ نے بھائی کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔"

"سیٹھ ہاشم کے اعزاز میں۔" کیونکہ وہ حج کے لیے یورپ جا رہے ہیں۔" عمر نے بلا فضا میں لہراتے ہوئے جواب دیا۔"

"حج کے لیے یورپ؟" شیبہ نے حیرانی سے یہ الفاظ دہرائے اور پھر مفہوم سمجھتے ہوئے ہنس دی "آوارہ اور بد چلن انسان ...... لعنت برستی ہے چہرے پر۔ لیکن یہ نئی تہذیب پر اندھا دھند مرنے والی لڑکیاں" جانے کیا نظر آتا ہے انہیں اس میں۔ وہ ایس۔ امی کی بڑی بیٹی ندیمہ اور ڈاکٹر عالم کی بہن رابعہ میں تو باقاعدہ رقابت چل رہی ہے۔" عمر کے لہجے میں زہر گھلا ہوا تھا۔

"ویسے پارٹی کی شان آج نرالی ہے۔" شیبہ نے دریچے سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ بھئی اتنے بڑے لینڈ لارڈ بہ نفسِ نفیس تشریف لا رہے ہیں۔ مذاق ہے" عمر نے لفظ "لینڈ لارڈ" پر خصوصی زور دیا۔"

"اچھا شیبہ آپی ہم تو چلے" عمر نے جانے کے لیے قدم اٹھائے۔

کہتے ہیں کہ عورت شادی کے بعد خود کو شوہر کے سانچے میں ڈھال لیتی ہے۔ بچوں کے رجحانات کے پیشِ نظر اپنی دلچسپیوں کے محور بدل دیتی ہے۔ لیکن جانے وہ عظیم عورتیں کون سی ہیں۔ ان کی ممی کے ساتھ تو ایسا ہرگز نہ تھا۔ طبیعت میں تضاد، خیالات میں بُعد، نظریات میں

اختلاف جو طرزِ زندگی ماں کے مطمع نظر تھی۔بچوں اور شوہر کو اس سے کوئی رغبت نہ تھی۔

کاروں کا شور بڑھ رہا تھا۔تیار ہونے کا سوچتی ہوئی وہ ملحقہ باتھ روم میں چلی گئی۔دل تو چاہتا تھا کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر سو جائے لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی کبھی کبھار اسے ان تقریبات میں شامل ہونا ہی پڑتا۔اس لیے کہ وہ ہر قیمت پر گھریلو سکون بحال رکھنا چاہتی تھی۔باپ کی زندگی اس کیلئے مشعلِ راہ تھی۔انہوں نے بچوں کی کس طرح تربیت کی، بیوی کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھا، کتنے ایثار اور تحمل سے کام لیا۔یہ ایک قابلِ قدر مثال تھی۔بچوں کے ذہن جہاں باپ کے لیے احترام، عقیدت اور محبت کے جذبات سے لبریز تھے وہاں ان کی نگاہیں ماں کی اہمیت سے عاری تھیں۔

سیڑھیاں اتر کر وہ دھیرے دھیرے رنگ و بو کے اس طوفان کی طرف بڑھنے لگی جہاں حُسن اپنی تابانیوں سے جلوہ افروز تھا۔سورج کی نارنجی کرنیں رنگین آنچلوں میں سے چھن چھن کر عجیب دلفریب سماں پیدا کر رہی تھیں۔سڈول و خوبصورت جسم بیش قیمت ملبوسات میں گرفتار اِدھر اُدھر تھرک رہے تھے۔

"شکر ہے کہ کیمیادان کو آج اپنے کیمیائی تجربات سے فرصت مل گئی"۔یہ میجر ضیاء کی آواز تھی۔

گردن کو قدرے خم دیتے ہوئے اس نے پلٹ کر دیکھا۔میجر ضیاء ہاتھوں کو پشت پر رکھے پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھے۔اتنی گہری نظروں کو یکدم اپنے چہرے پر محسوس کرتے ہوئے اس کے رخسار تمتما سے گئے۔خود پر تیزی سے قابو پاتے ہوئے بولی!

جی ہاں فرصت ملی ہے تو آپ یہاں دیکھ رہے ہیں۔نگاہیں اٹھا کر اپنے سامنے دیکھا تو ہاشم کو تیز تیز قدموں سے اپنی ہی طرف آتے پایا۔

"آج کل آپ کبھی دکھائی ہی نہیں دیتیں۔کس دنیا میں گم رہتی ہیں؟ ہاشم نے نیم وا آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہا۔"

دائیں طرف میجر ضیاء اور سامنے ہاشم، ایک طرف ہٹتے ہوئے وہ بولی وقت ہی نہیں ملتا۔یونیورسٹی سے شام کو آنا ہوتا ہے۔

''یونیورسٹی میں ایسی کیا کشش ہے جو اس دنیا سے نکل کر آپ کسی کی پیار بھری دنیا میں جھانکنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتیں۔کچھ یوں لگتا ہے جیسے ان رنگین فضاؤں میں دل کھو بیٹھی ہوں۔'' انتہائی ڈھٹائی سے ہاشم نے قہقہہ لگایا۔

اسے یوں لگا جیسے کسی نے گرم گرم سیسہ اس کے کانوں میں انڈیل دیا ہو۔''آئینے میں اپنی ہی صورت نظر آتی ہے۔'' اس کی نگاہوں میں شعلے تھے۔چہرہ تمتما رہا تھا اور آواز میں کڑک تھی۔

''یہ نازیبا انداز واقعی حسن ہر رنگ میں حسین ہے'' وہ اتنے لفنگے پن سے قہقہے لگا رہا تھا کہ اس کا خون کھول اٹھا۔

''بند کرو اپنی یہ بکواس'' نفرت سے بھرپور نگاہیں اس پر پھینکتے ہوئے وہ واپس جانے کے لیے مڑی۔وہ اس ماحول سے جلد از جلد بھاگ جانا چاہتی تھی۔ابھی راستے میں ہی تھی کہ بیگم اشرف کی آواز نے اس کے تیزی سے اٹھتے ہوئے قدموں کو رکنے پر مجبور کر دیا۔اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑتے ہوئے دیکھ کر وہ بولیں۔''

''کیوں شیبہ واپس کہاں جا رہی ہو۔''؟

زخمی نگاہوں سے اس نے ماں کی طرف دیکھا۔ایک بار شدت سے اس کا جی چاہا کہ اس سینے سے چمٹ جائے۔ان بازوؤں میں سما جائے جو اسے دنیا جہان کی آفات سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔لیکن آرزو ابھی سینے میں ہی تھی کہ ممی کی تیز آواز نے اس کا گلا گھونٹ دیا۔وہ وہی کچھ کہہ رہی تھیں جو اس کے کان پہلے بھی بار ہا سن چکے تھے۔

''اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرو شیبہ! آخر تمہیں سوسائٹی کے ایٹی کیٹس کب آئیں گے؟ تم ان لوگوں کے نقشِ قدم پر چل رہی ہو جنہیں سوسائٹی جانتی تک نہیں

جن کا معاشرے میں کوئی بلند مقام نہیں ۔مجھے تمہاری شادی بھی کرنی ہے ۔ایسے ہی کٹی پتنگ کی طرح رہو گی تو سوچو تمہیں کون پسند کرے گا؟ اچھے رشتے ویسے ہی نایاب ہیں ۔اتنا کہہ کر وہ کچھ دیر خاموش رہیں اور پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولیں ۔

''تم نہیں جانتیں ہاشم تمہیں کتنا پسند کرتا ہے ۔''؟

یہ ایک ایسا انکشاف تھا جس نے اس کے تن بدن میں آگ لگا دی ۔زخم پہلے ہی کھا کر چلی آ رہی تھی ۔اس پر نمک بھی چھڑک دیا ۔آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وہ انتہائی غصیلی آواز میں بولی ۔

''مجھے نہیں سیکھنے یہ ایٹی کیٹس اور جہنم میں جائے وہ ذلیل ہاشم ،میرے لیے چنداں فکر کی ضرورت نہیں ۔''

برق کی سی تیز رفتاری سے وہ سیڑھیاں چڑھ گئی ۔کمرے میں پہنچ کر خود سے بڑبڑائی ''ہوں''!لنگور جیسی صورت والے کو پسند کرنے چلی ہیں ۔جس کی شخصیت انسانیت کے جوہر سے ہی محروم ہے ۔لیکن دولت کے پجاری انسان کو صرف اس کی دولت ہی نظر آ سکتی ہے ۔ممی کو بھی آخر پسند کیوں نہ؟ ہو بہت سی جائیداد کا تنہا وارث جو ہوا ۔بلا سے اگر کثرتِ شراب نوشی سے اس کی آنکھوں کے گرد مستقل حلقے ہوں ۔مغربی تہذیب کا دلدادہ ماحول اسے کوئی برائی تصور نہیں کرتا ۔اور یہ بھی معیوب بات نہیں کسر کہ ہر شب اس کی بانہوں میں نئی نئی بانہیں لہراتی ہوں ۔ماڈرن کہلانے کے لیے یہ اوصاف تو شخصیت کا لازمی جزو ہیں ۔

وہ بڑا سلجھا ہوا، باوقار اور مہذب انسان متصور ہوتا ہے اور آخر ایسا کیوں نہ ہو؟ اس کے پاس تمام برائیوں کا علاج دولت جو ہے ۔دولت جو آج کے معاشرے کی جان ہے ۔'' وہ اندر ہی اندر کھول رہی تھی ۔غصے سے بل کھا رہی تھی ۔

نگاہیں اٹھیں ، کھلے دریچے سے سورج مغرب کے دامن میں روپوش ہوتا دکھائی دے رہا تھا ۔اتنا دلفریب سماں تھا کہ چند لمحوں کے لیے وہ کھو سی گئی ۔کبھی کبھی اس کا دل چاہتا کہ وہ کہیں دور

چلی جائے۔دُور پہاڑیوں کے درمیان کسی چھوٹے سے خوبصورت مکان کی مکین بن جائے۔جس کی دیواروں پر عشق پیچاں کی بیلیں اپنا جلوہ دکھا رہی ہوں اور جہاں وہ زندگی کے چند دن کسی ایسے انسان کی رفاقت میں گذار دے جو بہترین کردار کا حامل ہو۔زندگی کی اخلاقی و روحانی اقدار پر ایمان رکھتا ہو۔اس کی بانہوں میں بانہیں دیئے چہرے پر دنیا بھر کی خوشیاں سمیٹے وہ فطرت کے حسین مناظر سے لطف اندوز ہوتی رہے۔تصور ڈوبتا اور ابھرتا رہا۔لیکن اپنا یہ خیالی پیکر مطلوبہ شکل میں اسے دُور دُور تک نظر نہ آیا۔"

ننھیالی خاندان اُسے قطعاً پسند نہ تھا۔آزادروی میں وہ لوگ اس کی ممی سے بھی دو چار ہاتھ آگے تھے۔اسے تو بس اپنے سیدھے سادھے ددھیالی خاندان سے ہی محبت تھی۔جو زخمی ہونے کے باوجود بھی ان کے لیے بے پایاں محبت رکھتے تھے۔"آہ" لیکن ممی نے کبھی ان شکستہ قلوب کو جوڑنے کی کوشش نہ کی۔دل کے نہاں خانوں میں کبھی جھانک کر نہ دیکھا کہ یہاں کتنے زخم ہیں۔کتنے گہرے گھاؤ ہیں۔کتنی حسرتیں دفن ہیں۔ڈاکٹر اشرف کی ڈائری کی وہ تحریر ہمیشہ کی طرح آج بھی اسے بے چین کر گئی تھی۔

"خودغرض صاحب ثروت لوگ جب کسی غریب کے جوان بیٹے کو اغراض کے جال میں پھانس لیتے ہیں۔مکروفریب کے ہتھکنڈوں سے اسے بے بس بنا دیتے ہیں۔اس وقت امیدوں کے محل بنانے والی ماں کے ارمانوں کا خون ہو جاتا ہے۔تب بہنوں کی آرزوئیں اپنی موت آپ مر جاتی ہیں اور کسی سیدھی سادھی دوشیزہ کے سُندر سپنے بکھر جاتے ہیں۔وہ وقت بڑا نازک ہوتا ہے میں جو کسی مجبور ماں کا سہارا بننے والا تھا۔کسی غریب باپ کا عصا بننے والا تھا اور اس ہستی کا سہاگ بننا چاہتا تھا۔جس نے زندگی کے سترہ سال میرے تصور میں گذار دیئے تھے۔انسانی خودغرضی نے اس بازو کو توڑ دیا۔اس سہاگ کو لوٹ لیا۔"

اس کے پاپا کا ماضی کتنا بھیانک تھا۔کہ بے اختیار دل پھٹنے لگتا تھا۔عالمِ تصور میں اس کے ہاتھوں نے اس ڈائری کو پکڑا۔جہاں ماضی کے راز دفن تھے۔ذہن نے زقند لگائی انگلیوں نے

ورق الٹائے اور ماضی کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں گم ہوگئی۔

جالندھر سے کوئی دس بارہ میل کے فاصلے پر تاج پور ایک چھوٹی سی بستی ہے۔آبادی یہی کوئی ڈیڑھ دو ہزار نفوس پر مشتمل ہوگی۔نہر کے کنارے کنارے خوبصورتی اور نفاست سے پلے پختہ کچے مکانوں والا یہ گاؤں دور سے کسی قدیم تاریخی شہر کا پتہ دیتا ہے۔صاف ستھری کشادہ گلیاں،عمدہ مکان،جن میں پانی کے نکاس کے لیے پختہ نالیاں ہیں،مشرق کی طرف سے نہر کے پل پر کھڑے ہو کر اگر گاؤں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو سامنے برگد کا بوڑھا درخت نظر آتا ہے۔برگد کے درخت سے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر ایک کشادہ گلی ہے۔جس کے دائیں ہاتھ ایک صاف ستھرا کچا مکان ہے۔یہاں زمیندار شہاب الدین اور اس کے تینوں بھائی امیر دین، جمال دین اور دین محمد اپنے اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہتے ہیں۔باپ کی چھوڑی ہوئی چند بیگھہ زمین کو چاروں بھائی مل کر کاشت کرتے ہیں اور زندگی کی گاڑی گھسٹم گھسٹم چلاتے ہیں۔لیکن ان کا باہمی پیار اور بے پایاں خلوص اس گھرانے کا امتیازی وصف ہے۔

رات کا آخری پہر تھا،ستاروں کی تابانی ماند پڑ گئی تھی۔چاند کی روشنی زرد ہوگئی تھی۔گھر کے صحن میں ایک طرف شہاب الدین اس کی بیوی فاطمہ بچے اور دیگر افراد میٹھی نیند سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔اچانک فاطمہ اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اُف خدایا میں نے کیسا ڈراؤنا خواب دیکھا ہے؟ کتنا ڈراؤنا خواب؟ میرے معبود تو ہم گناہگاروں پر اپنا کرم کرنے والا ہے،ہمیں تیرے رحم کی آس ہے، یہ میرا دل کیوں ڈوب رہا ہے۔"؟

پسینے کے ننھے ننھے قطرے اس کی پیشانی پر جھلملا رہے تھے۔حلق خشک ہو رہا تھا۔ اضطراب سے وہ بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گردوپیش کا جائزہ لینے لگی۔وہ وقت کا اندازہ لگانا چاہتی تھی۔گاؤں کی مسجد میں مؤذن کی آواز نے اس کی پریشانی میں مزید اضافہ کر دیا۔

''خدایا تو عائشہ کو ہر آفت سے محفوظ رکھو! میرے مالک تو اس کا نگہبان ہے اس کے سہاگ کا رکھوالا ہے۔''

عائشہ شہاب الدین کی اکلوتی بہن تھی جس کی شادی چھ ماہ قبل ہوئی تھی۔ عائشہ جس سے فاطمہ کو بے تحاشہ پیار تھا۔

گھڑونچی کی طرف پانی پینے کے لیے بڑھی۔ لیکن پانی پی کر بھی اضطراب میں کمی نہ ہوئی۔ دل عجیب انداز میں دھڑک دھڑک کر یقین دلا رہا تھا کہ کوئی سانحہ پیش آنے والا ہے۔

بستر پر دوبارہ لیٹ گئی۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور دیکھا خواب کسی خوفناک حقیقت کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگا۔

جیسے وہ عائشہ کے گھر اپنے بیٹے اشرف کے ہمراہ گئی ہے۔ اچانک اسے آسمان پر گہری سیاہ گھٹائیں نظر آتی ہیں۔ خیر کی بارش ہو۔ وہ اپنے ہاتھ دُعا کے لیے پھیلا دیتی ہے۔ تبھی بارش شروع ہو جاتی ہے۔ وہ فوراً کمرے کی طرف لپکتی ہے۔

ہر لحظہ بارش کی تیزی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اچانک عائشہ کے کمرے کی چھت میں سوراخ ہو جاتا ہے۔ وہ چلاتی ہے ''عائشہ! عائشہ چھت میں سوراخ ہو گیا ہے۔ پانی اندر آ رہا ہے باہر نکل چلو' عائشہ بے بسی سے اس کی طرف دیکھتی ہے۔ دھیرے دھیرے سوراخ بڑا ہوتا جاتا ہے کسی انجانے خطرے کو محسوس کرتے ہوئے وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر گھسیٹ لاتی ہے۔

چھت ایک زوردار دھماکے سے گر جاتی ہے۔ ملبہ فرش پر آ جاتا ہے اس کی اور عائشہ کی چیخ نکل جاتی ہے اور اسی وقت اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

خواب کے ڈراؤنے تصور نے اس کے سارے وجود کو ہلا ڈالا تھا۔

معبود ہمیں ہمارے گناہوں کی اتنی بڑی سزا نہ دینا۔ وہ خوف زدہ آواز میں چیخی۔

شہاب الدین کھیتوں پر جانے پر کیلئے بیدار ہو چکا تھا بیوی کے منہ سے خوف و معبود و اضطراب میں ڈوبی ہوئی آواز سن کر تیر کی طرح اٹھ کر قریب آیا اور اُس پر جھکتے ہوئے بولا۔''

فاطمہ کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟

لیکن وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔

''فاطمہ کیا بات ہے؟اس نے بیوی کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔''

چارپائی سے اٹھتے ہوئے اس نے دھیمے اور گلوگیر لہجے میں کہا۔

''میں نے عائشہ کے متعلق بہت بھیانک خواب دیکھا ہے۔''

شہاب الدین اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولے۔''یونہی پریشان ہو رہی ہو خواب تو تمہارے دن بھر کے خیالات کا عکس ہوتے ہیں۔''

''لیکن یہ تو بڑا عجیب اور ڈراؤنا خواب ہے۔ میں نے تو کبھی وہم وگمان میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا۔'' فاطمہ نے آزردگی سے کہا۔

''خواہ مخواہ سوچ سوچ کر اپنا ذہن خراب مت کرو۔ہمیں اللہ کی ذات پر پورا بھروسہ رکھنا چاہیے۔'' شہاب الدین نے بیوی کی دلجوئی کرتے ہوئے کہا۔

شہاب الدین کھیتوں پر چلا گیا اور فاطمہ نماز کے لیے کھڑی ہوگئی۔آج اس کی نماز میں خضوع وخشوع پہلے سے کہیں زیادہ تھا۔رو رو کر اس نے سب کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگیں۔

سارا دن کام میں مصروف رہنے کے باوجود اس کی ذہنی پریشانی دُور نہ ہو سکی۔یوں جیسے آنے والے واقعات پہلے سے ہی انسان کے دل پر سایہ ڈال دیتے ہیں۔کچھ یہی حال فاطمہ کا بھی تھا۔دل کو لاکھ سمجھاتی لیکن یہ تسلی یہ تسکین بالکل عارضی ثابت ہوتی۔اس کا دل غم کے اتھاہ سمندر میں پھر ڈوبنے لگتا۔

شام ہو گئی تھی وہ رات کے لیے سبزی بنا رہی تھی۔قدموں کی چاپ پر نگاہیں اٹھیں تو عائشہ کا دیور احمد آتا دکھائی دیا۔آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔احمد کو اس حالت میں دیکھ کر اس کا دل یکبارگی سینے میں پورے زور سے دھڑکا۔

''احمد کیسے آنا ہوا؟'' وہ چارپائی سے اُٹھ کر تیزی سے اس کی طرف بھاگی۔

''افضل بھائی فوت ہو گئے ہیں'' یہ کہتے ہی آنے والے نے منہ کو کپڑے سے چھپا کر دلدوز چیخ ماری۔

یوں لگا جیسے کسی نے آسمان سے اٹھا کر زمین پر دے مارا ہو۔ دماغ یوں سن کر رہا تھا جیسے اس میں سوچنے اور سمجھنے کی ساری صلاحتیں مفقود ہو چکی ہوں۔ وہ چاقو جس سے وہ سبزی کاٹ رہی تھی۔ جانے کیسے انگلیوں کو چیر گیا لیکن اُسے درد کا احساس تک نہ ہوا۔

سارا گھر آنے والے کے گرد اکٹھا ہو کر چیخیں مارنے لگا۔

''کیا ہوا''؟ کس ظالم کی نظر کھا گئی اسے؟'' امیر دین کی بیوی رقیہ نے ہچکیاں لیتے ہوئے پوچھا۔

''گاؤں کی مسجد تعمیر کی جا رہی ہے۔ آج ان کی باری تھی ایک طرف کی دیوار جانے کس طرح گر گئی اور وہ اس کے نیچے آ گئے۔ جب اینٹیں ہٹا کر نکالا گیا تو روح جسم کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔''

احمد نے آہوں اور آنسوؤں کے درمیان ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں تفصیلات بتائیں۔

ایک پل میں قیامت آ گئی تھی۔ کوئی سر پر دوہتڑ مار رہا تھا۔ کوئی گریبان پکڑ کر بین کر رہا تھا۔ کسی کو عائشہ کی معصومیت یاد آ رہی تھی۔ کسی کو نئی نویلی دلہن کے بیوہ ہو جانے کا افسوس تھا۔ لیکن فاطمہ سب سے الگ تھلگ دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی نہ گرا تھا۔ یوں جیسے سکتہ ہو گیا ہو۔

دماغ کے کسی کونے سے فکر کی تیز لہر اُبھری!

عائشہ کا سہاگ لٹ گیا۔ عائشہ کا جیون ساتھی بچھڑ گیا۔ یہ لہر پھیلتی چلی گئی، حتیٰ کہ اس کا لاشعور اسی لہر میں ڈوبتا چلا گیا۔ پھر جو وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی تو کلیجے دہل گئے۔

عائشہ کو اس نے بھاوج بن کر نہیں ماں بن کر پالا تھا۔ وہ اس کی نند نہیں بیٹی تھی۔ آج وہ زندگی کے لق و دق صحرا میں اکیلی رہ گئی تھی۔ وہ ہاتھ وہ مضبوط بازو جنہیں اس نے عائشہ کی دائمی

حفاظت کے لیے چنا تھا آج اس سے دامن چھڑا چکے تھے۔

مرد گھر آ چکے تھے۔بہن کی اس بے وقت بیوگی پر اُن کے دل غم سے پھٹے جا رہے تھے۔آنسو اُبل اُبل کر ان کے دامن بھگو رہے تھے۔

روتے دھوتے گھر کے مردوں اور عورتوں کا یہ قافلہ عائشہ کے گھر پہنچا۔ایک خلقت جمع تھی۔کون سی آنکھ تھی جو پُرنم نہ تھی۔لوگوں کی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔

''وہ کب مرا ہے؟ وہ تو شہید ہوا ہے اور شہید کو رونا گناہ ہے۔''

لیکن یہ جانتے ہوئے بھی کہ اُسے شہادت کا بلند مرتبہ نصیب ہوا ہے۔آنسوؤں پر کسی کا بس نہیں تھا۔

باب نمبر: 2

وہ زخم وہ غم اور وہ درد جو مشیت ایزدی سے انسان کو ملتے ہیں اور جن سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اب زندگی غموں کا ایک ہار بن جائے گی۔ وقت ان زخموں کے لیے مرہم بن جاتا ہے اور وہ محبوب انسان جو دلوں پر حکومت کرتے ہیں جن کی رفاقت کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا وقت خود بخود ان کے بغیر جینا سکھا دیتا ہے۔

عائشہ کا حال بھی کچھ اس سے مختلف نہ تھا۔ قسمت نے اس کی پیشانی سے سہاگن کی بندیا چھین کر بیوگی کی مہر ثبت کر دی تھی۔ الہڑ سی دوشیزہ جو غم کے حقیقی مفہوم سے بھی نا آشنا تھی۔ غموں کے گہرے سمندر میں گر پڑی تھی۔ کہنے کو تو وہ بن ماں باپ کی بچی تھی۔ لیکن شعور کی آنکھ کھلتے ہی اس نے ہر طرف محبت و پیار ہی پایا۔ ماں باپ تو تبھی اسے داغ مفارقت دے گئے تھے جب وہ آٹھ نو سال کی کم سن بچی تھی۔ تب شہاب الدین کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ معصوم سی اس بچی کو نئی نویلی دلہن فاطمہ نے جب اُداس اُداس اِدھر اُدھر پھرتے دیکھا تو تڑپ اٹھی۔ ممتا کے جذبات پوری شدت سے اس کے دل میں مچل اُٹھے۔ اور پھر عائشہ کبھی محسوس نہ کر سکی کہ وہ والدین سے محروم ہے۔

ابھی دوشیزگی کی دہلیز پر قدم رکھے کچھ زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ اس کی قسمت افضل سے وابستہ کر دی گئی۔ صحت مند جسم اور با وقار شخصیت کا مالک افضل جسے پا کر عائشہ کی حیات شوخ شوخ

رنگوں سے بھر گئی۔یوں اس نے اپنی ہستی اس کے پیار میں گم کر ڈالی۔پیار کے اس گہرے سپنے سے وہ اس وقت بیدار ہوئی جب افضل زندگی کی بازی ہار بیٹھا۔خوشی کے جن ہنڈولوں میں وہ جھولے جھول رہی تھی۔ان کی رسیاں یوں ٹوٹیں کہ وہ منہ کے بل زمین پر آ رہی لیکن وقت بہت بڑا مرہم تھا۔وہ جی رہی تھی۔

افضل کو اس سے جدا ہوئے آٹھ سال کا طویل عرصہ گذر چکا تھا۔اس کی شہادت کے تقریباً چار ماہ بعد اس کے ہاں اسما پیدا ہوئی۔ہو بہو افضل کی تصویر،من موہنی سی صورت جس نے کسی حد تک اس کے زخموں پر پھاہا سا رکھ دیا تھا۔یوں اسے جینے کا ایک سہارا مل گیا۔

شام ہو رہی تھی شہاب الدین کا چودہ سالہ بڑا بیٹا اشرف صحن میں بیٹھا مطالعہ میں محو تھا۔اسما باہر سے کھیلتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی۔اشرف کو بیرونی دروازے کی طرف پشت کیے بیٹھے پایا۔تو ننھے سے دل میں شرارت پیدا ہوئی۔آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے قریب پہنچ کر اس نے اپنے ننھے منے ہاتھوں سے اشرف کی آنکھیں بند کر لیں۔محویت سے پڑھتے ہوئے اشرف کو یہ مداخلت ناگوار گذری۔انگلیوں سے آنکھیں بند کرنیوالے ہاتھوں کو ٹٹولا تو سمجھ گیا۔

تیز آواز میں چلایا۔

''اسما کیا مجھ سے پٹنے کا ارادہ ہے۔''

''واہ بڑا پیٹنے والے۔''اس نے ٹھنک کر کہا۔

ننھیالی پیار نے اسے بہت ضدی،خودسر اور شرارتی بنا دیا تھا کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔

مزید کچھ کہنے کی بجائے اشرف اپنے دونوں ہاتھ پشت کی طرف لے گیا۔نازک نازک کلائیاں مضبوطی سے پکڑتے ہوئے اس نے ایک جھٹکے سے اسے پیچھے سے کھینچ کر اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔

''ٹھہرو ابھی تمہاری درستی ہو جاتی ہے۔''اور ساتھ ہی اشرف نے بلند آواز میں پھوپھی

کو پکارا۔عائشہ کمرے کی صفائی کر رہی تھی۔بھتیجے کی آواز سن کر سب کام چھوڑ چھاڑ ''جی اشرف خاں کہتی ہوئی باہر نکلی۔''

پھوپھی پر نظر پڑتے ہی اشرف نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''دیکھے نا بوجی اسما مجھے پڑھنے نہیں دیتی۔کبھی آنکھیں بند کرتی ہے کبھی بال کھینچتی ہے کبھی کتابیں پھاڑتی ہے۔''

''ہائے اللہ! میری توبہ آشی بھائی کتنا جھوٹ بولتے ہیں؟ میں کب ان کے بال کھینچتی ہوں اور ان کی کتابوں کو تو ہاتھ تک نہیں لگایا۔''

چہرے پر معصومیت لیے وہ تیزی سے پلکیں جھپک جھپک کر کہہ رہی تھی۔''اسما تو ان شرارتوں سے باز نہیں آئے گی۔ہزار بار منع کر چکی ہوں۔لیکن تیرے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔''

عائشہ نے بیٹی کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

ماں کی جھڑکیوں سے اسما منہ بسورنے لگی۔پھوپھی کو یوں برہم ہوتے دیکھ کر اشرف نے اسما کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا اور اس کے شانے پیار سے تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

''دیکھو اسما مجھے پڑھتے ہوئے تنگ نہ کیا کرو۔پڑھوں گا نہیں تو بڑا آدمی کیسے بنوں گا؟''

معصوم سا ایک روٹھا ہوا اور دوسرا مناتا ہوا یہ پیارا سا جوڑا عائشہ کی تمناؤں کا مرکز تھا۔ جسے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں انجانی سی خوشیاں ابھر آتیں۔کانوں میں فاطمہ کے کہے ہوئے وہ الفاظ گونجتے جو اس نے اسما کی پیدائش پر کہے تھے۔

''اسما میرے اشرف کے لیے ہے۔''

''اسما اگر میری آنکھوں کا نور ہے تو اشرف آنکھیں۔جیسے نور آنکھوں کے بغیر اور آنکھیں نور کے بغیر بیکار ہیں۔اسی طرح اسما اور اشرف میں سے کسی ایک کی عدم موجودگی میرے

لیے نا قابلِ برداشت ہے۔"

وہ خیالوں سے چونکی تو اسما اشرف سے باتیں کر رہی تھی اور اشرف اس کی بھولی بھالی باتوں پر ہنس رہا تھا۔

"اشرف خان تمہارے امتحان میں کتنے دن باقی رہ گئے ہیں؟" عائشہ نے پوچھا۔

"بس بو جی آج سے پورے پندرہ دن بعد شروع ہو جائے گا" اس نے جواب دیا۔

"اللہ تجھے کامیاب کرے اشرف خان۔ تو اتنا بڑا آدمی بن جائے کہ اس گاؤں اور شہر میں کوئی تجھ جیسا نہ ہو"......... عائشہ نے بڑے پیار سے دعائیں دیں۔

"اچھا اب تو پڑھ۔ چل اسما اُٹھ۔"

بیٹی کی انگلی پکڑتے ہوئے وہ جاتے ہوئے بولی۔

اشرف عائشہ کی جان تھا۔ اپنے اس بھتیجے سے اسے والہانہ پیار تھا۔ کہنے کو اور بھی بھائیوں کے بچے تھے۔ لیکن اس کی محبت اشرف کے لیے بے پایاں تھی۔ اس پیار میں اضافہ کچھ اس وجہ سے بھی تھا کہ اس نے اشرف کو گودیوں میں کھلایا تھا گرمیوں کی لمبی لمبی دوپہروں میں جب لوگ اپنے اپنے گھروں میں آرام کر رہے ہوتے تو وہ اسے گود میں اٹھائے جامنوں اور آموں کے درختوں تلے سہیلیوں کے ساتھ پھرا کرتی۔

اور جب اس کی منگنی ہو گئی تو اسے اس خیال ہی سے ہول اٹھنے لگتا کہ وہ اب اشرف سے جُدا ہو جائے گی۔ رات کی تنہائیوں میں گرم گرم آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر رخساروں پر پھیل جاتے۔

اور تب وہ ساتھ سوتے ہوئے اشرف کو اپنے سینے سے چمٹا لیتی۔ اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ جو اشرف کو ایک پل کے لیے بھی اپنے سے جُدا نہیں کرتی۔ وہاں اس کے بغیر کیسے رہے گی۔

اور جب وہ بیاہ کر افضل کے پاس دوسرے گاؤں چلی گئیں۔ شروع شروع کے دنوں میں اس کی جدائی کو عائشہ نے اتنا محسوس کیا کہ افضل اور اس کے گھر والے بھی بھتیجے سے اس کی بے

پناہ محبت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ۔وہ اسے کبھی اشرف نہ کہتی ہمیشہ اشرف خان کہہ کر پکارتی ۔اس کی ذہانت پر وہ نازاں تھی ۔اس کی قابلیت پر اسے فخر تھا اور اس کے متعلق بات کرتے ہوئے اس کا سینہ مارے غرور کے تن جاتا تھا۔

باب نمبر: 3

قدرت نے اشرف کو ذہانت عطا کرنے میں بڑی فیاضی اور فراخ دلی سے کام لیا تھا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق بچپن ہی سے اس کی فطانت کے آثار نمایاں ہونے شروع ہو گئے تھے۔ تحقیق وتجسس کا جذبہ اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ہرنئی چیز سے متعلق وہ اتنے گہرے اور معنی خیز سوالات کرتا جن کے جواب اس کے سیدھے سادھے باپ اور چچاؤں کے لیے مشکل ہوجاتے۔

پانچ سال کی عمر میں اسے سکول داخل کروا دیا گیا۔ اسکول میں اس کی ذہانت کو مزید چمکنے کا موقع ملا۔ اس نے وہ سب کچھ بہت کم مدت میں سیکھ لیا تھا جسے اس کی عمر کے بچے سال کے آخر تک بھی بمشکل سیکھتے ہیں۔ فاطمہ اور عائشہ کو جب وہ فرفر سبق سناتا اور سلیٹ پر انتہائی نفاست اور خوبصورتی سے گنتی لکھ کر دکھاتا تو دونوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھتے۔

وقت کا چکر چلتا رہا۔ ماہ وسال بیتتے گئے۔ دوسری سے تیسری اور تیسری سے چوتھی یونہی ہر امتحان میں امتیازی پوزیشن حاصل کرتا ہوا وہ چودہ سال کی عمر میں ہائی جماعت کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ ہر امتحان میں اول پوزیشن وظیفے اور انعامات نے اسے سارے گاؤں میں مشہور کر دیا تھا۔ باپ چچاؤں پھوپھی اور ماں کے لیے یہ چیز باعث فخر تھی۔

ذہانت کے ساتھ ساتھ وہ ایک حساس اور محنتی لڑکا تھا۔ گھر والوں کے بلند ارادے پھوپھی اور ماں کے جذبات اس کے احساس پر تازیانے کا کام کرتے۔ جب بھی وہ امتحان

دینے کے لیے جاتا تو عائشہ اور فاطمہ اُسے دعاؤں کی چھاؤں میں رخصت کرتیں ۔اس کے لیے وظیفے پڑھتیں ،ان کے یہ جذبے اس کے آتش شوق کو اور بھی تیز کر دیتے اور وہ زیادہ لگن اور شوق سے پڑھتا۔

انٹرنس کا آخری پرچہ دے کر جب وہ گھر آیا تو دوپہر کو جمال نے اس سے پوچھا۔

''اشرف اپنے مستقبل کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟

''نتیجے سے پہلے کیا کہا جا سکتا ہے بچا جان؟''

''نتیجہ تو معلوم ہی ہے میرے شیر۔ہماری گردنیں انشاءاللہ بلند ہی رہیں گی۔''

جمال نے فخر سے کہا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا ۔

''خدا نے چاہا تو ہم تجھے ڈاکٹر بنائیں گے۔''

''ڈاکٹر بننے کے لیے بڑے سرمائے کی ضرورت ہے ۔ہم جیسے غریب لوگ کیسے ڈاکٹر بن سکتے ہیں؟''

اُس نے غمگین لہجے میں کہا۔

''پگلے ہمارے ہوتے ہوئے تو ایسی نا اُمیدی کی باتیں سوچتا ہے؟ ہم یہ زمین بیچ ڈالیں گے۔خود کو رہن رکھ دیں گے۔لیکن تجھے اس منزل تک ضرور پہنچائیں گے۔تیرا کیا خیال ہے؟ ہم تجھ جیسے قابل فخر بیٹے کے لیے اتنا بھی نہ کر سکیں گے۔''

فاطمہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''اللہ کرے اشرف تم سب کی آرزوؤں اور تمناؤں کو پورا کر سکو تم سب کا سہارا بن سکو۔''

اس نے پلو سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

شدتِ احساس سے اشرف کی آنکھیں بھی بھیگ سی گئیں ۔

جوں جوں نتیجے کے دن قریب آتے جا رہے تھے ۔اشرف کی بے چینیوں میں اضافہ

ہوتا جا رہا تھا۔ ہر چند اسے پوری پوری اُمید تھی کہ وہ اچھے نمبر حاصل کرے گا لیکن پھر بھی ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے وہ اپنا دامن ان موہوم اندیشیوں سے نہ بچا سکا۔ جو پڑھنے والوں کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔

آخر کار وہ دن بھی آ گیا۔ جس کا شدت اور بے قراری سے انتظار تھا۔ رات جوں توں کر کے کٹی اور پھر صبح ہی صبح جمال اور اشرف شہر جانے کے لیے چل کھڑے ہوئے۔ دونوں چچا بھتیجا جب سکول پہنچے تو خاصا دن چڑھ آیا تھا۔ سکول کے باہر بے شمار لڑکے کھڑے شور مچا رہے تھے۔

اشرف پر نگاہ پڑتے ہی لڑکوں نے اسے گھیرے میں لے لیا۔ خوشی سے پھولتی سانسوں کے درمیان لڑکوں نے اشرف کو ضلع میں اوّل آنے کی نوید سنائی۔

تھوڑی دیر بعد وہ چچا کے ساتھ سکول میں داخل ہو رہا تھا۔ ہیڈ ماسٹر اور دیگر اساتذہ نے جمال کو مبارکباد دی اور اشرف کی کوششوں کو سراہتے ہوئے شاباش دی اور جب وہ گھر واپس آ رہے تھے تو انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ ہواؤں کے دوش پر اُڑے چلے جا رہے ہوں۔

گاؤں کی نہر پر جب پہنچے تو امیر اور دین محمد کو انہوں نے اپنی طرف آتے دیکھا۔ امیر نے آتے ہی اشرف کو گلے سے لگا لیا۔

''تمہیں پتہ چل گیا ہے امیر؟ اپنا اشرف پورے ضلع میں اوّل آیا ہے۔

''ہاں ابھی ابھی مصطفےٰ اور غلام نے آ کر بتایا ہے۔''

چلو گھر چلیں! سب لوگ انتظار کر رہے ہیں۔'' دین محمد نے کہا۔

جونہی عائشہ نے بھائیوں اور بھتیجے کو آتے دیکھا تو خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے لپکی۔ اشرف کو گلے سے لگاتے ہوئے بے پناہ خوشی سے بولی۔

''اشرف خان تو سچ مچ میرا اشرف خان ہے۔''

گاؤں بھر میں دھوم مچ گئی۔ سیدھے سادے دیہاتی لوگوں کے لیے یہ ایک حیرت انگیز

بات تھی ۔باپ اور چچاؤں کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔

شام کو سب گھر والے بیٹھے تو اشرف کے مستقبل کو زیر بحث لایا گیا۔

جمال نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔"ہم اشرف کو ہر قیمت پر ڈاکٹر بنا ئیں گے۔

شہاب الدین نے ایک ثانیہ بھائی کو دیکھا اور دھیرے سے بولا۔

"جمال مجھے اشرف تم سے پیارا نہیں ۔ڈاکٹری پڑھانا میرے بس کا کام نہیں ۔یہ پیسے کا کھیل ہے۔اپنے حالات اور مالی وسائل تمہارے سامنے ہیں ۔تم اچھی طرح جانتے ہو۔یہ چند بیگھے زمین جس سے ہماری گذر اوقات ہو رہی ہے ۔اس سے اشرف کو ڈاکٹری کی تعلیم کس طرح دلائی جا سکتی ہے۔بیٹے کی زندگی بنانے کیلئے میں تمہیں کولہو کا بیل کبھی نہیں بننے دوں گا۔

"آپ نے کتنی عجیب بات کی ہے؟امیر، جمال اور دین محمد نے یک زبان ہو کر کہا۔ ہمیں پریشانی اور یاس کا شکار ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ اس خدائے عظیم و برتر پر اعتماد رکھنا چاہیے ۔جس نے اشرف کو یہاں تک پہنچایا ہے ۔کیا وہ آگے اس کی رہنمائی نہیں کرے گا۔اشرف کی زندگی بنانا ہمارا سب سے بڑا فرض ہے ۔اس لیے کہ وہ ہمارے خاندان کا سب سے پہلا بچہ ہے جو اس درجے تک پہنچا ہے۔اگر ہم نے اپنے فرض میں کوتاہی کی تو وہ ہمیں معاف نہیں کرے گا۔"دین محمد نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ امیر بول اٹھا۔

"اشرف جب شہرت کا چاند بن کر چمکے گا تو یہ احساس ہمیں کتنی طمانیت بخشے گا کہ اس چاند کو روشنی ہم نے دی ہے۔وہ تو ہمارے خاندان کا چراغ ہے اور خدا کے فضل سے یہ چراغ اتنا روشن کریں گے کہ اس روشنی میں دنیا ہمارے گمنام چہرے دیکھ سکے۔"

جمال کافی دیر سے دونوں بھائیوں کی گفتگو سن رہا تھا۔جونہی وہ خاموش ہوئے تو بولا۔

"آپ کو معلوم ہے کہ اس کے ہیڈ ماسٹر نے آپ کو کیا پیغام دیا ہے؟

"کیا؟"شہاب الدین نے فوراً پوچھا۔

"اس نے کہا ہے اشرف کا مستقبل سنوارنے کے لیے آپ کسی قربانی سے دریغ نہ

کریں ۔کل جہاں قوم اس کی خدمات سے مستفیذ ہوگی وہاں آپ کا مقدر بھی بدل جائے گا۔''

''میری خواہش ہے اسے پڑھنے کے لیے علی گڑھ بھیجیں۔''

امیر نے بڑی آرزو سے کہا۔

''ٹھیک ہے وہ تمہارا بیٹا ہے اور تم اس کے لیے جیسا مناسب خیال کرتے ہو...... کرو۔''

شہاب الدین نے کہا۔

بڑی خواہشات ، بڑی آرزوؤں اور بڑی تمناؤں سے اسے علی گڑھ کالج میں داخل کروا دیا گیا۔

وقتِ رخصت فاطمہ، عائشہ اور گھر کے بقیہ افراد کی آنکھوں میں آنسو تھے وہ ان سے پہلی مرتبہ جدا ہو رہا تھا۔وہ سب اداس تھے ۔لیکن اس کا مستقبل انہیں بہت پیارا تھا۔

''ماں نے بیٹے کی پیشانی چھومتے ہوئے کہا۔

''تو جانتا ہے کہ تیرے چچا تیرے لیے کتنی قربانیاں دے رہے ہیں؟میرے بیٹے وہاں جا کر شہر کی رنگینوں میں نہ کھو جانا ۔اللہ تیرا حامی وناصر ہو۔''

باب نمبر: 4

علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ اشرف کی زندگی کا ایک سنگِ بنیاد تھا۔اس سے قبل وہ ایک محدود سی دنیا کا فرد تھا۔گھر سے اسکول اور سکول سے گھر یہی اس کی مصروفیات کے مرکز تھے گو اپنی عمر اور اپنے دوسرے ساتھیوں کی نسبت وہ کہیں زیادہ معلومات رکھتا تھا۔لیکن پھر بھی اس کا دائرہ خیال ان حدوں کو نہ پھلانگ سکا جہاں پہنچ کر علم عمل کا روپ دھار لیتا ہے۔ایک چھوٹی سی دنیا چھوڑ کر وہ ایسی جگہ قدم رکھ چکا تھا جس کے متعلق وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔لیکن ہراساں اور پریشان ہونے کی بجائے اس نے بہت جلد اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈال لیا۔

علی گڑھ یونیورسٹی اپنی ایک انفرادی دنیا رکھتی تھی۔یونیورسٹی کا سارا ماحول علمی اور فکری رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔اساتذہ کی نگاہیں آفاقی ولولوں کی حامل تھیں اور محبت ان کا طرہ امتیاز تھا۔یہ وہ ہستیاں تھیں جو اپنے طرزِ عمل سے طلبہ کے دلوں میں علم کی پیاس پیدا کرتیں اور پھر مناسب رہنمائی سے اس پیاس کو بجھانے میں ان کی معاونت کرتیں۔ان کی زندگیوں کا واحد مقصد علی گڑھ کے ہر طالب علم کو ایک ایسی متوازن شخصیت کے روپ میں ڈھالنا تھا جس کے ایک ہاتھ میں شرقی اور دوسرے ہاتھ میں مغربی علوم کا خزانہ ہو اور سر پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج ہو۔وہ خوش بھی تھا اور گھر والوں کا ممنون بھی۔جنہوں نے اسے اتنے اچھے ادارے میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا۔یونیورسٹی کے مخصوص ماحول میں وہ دھیرے دھیرے رنگتا چلا جا رہا تھا۔اس

کی ذہانت اور سوچوں کے دائرے پھیلتے چلے جارہے تھے۔ فکر ونظر میں وسعتیں پیدا ہورہی تھیں اور تھوڑے ہی عرصے بعد وہ اپنی خداداد صلاحیتوں سے یونیورسٹی میں ایک خاص مقام پیدا کر چکا تھا۔

سماجی مشاغل کے ساتھ ساتھ اس نے ساتھ تعلیمی روایات کو بھی برقرار رکھا اور ایف ایس سی میں یونیورسٹی میں ٹاپ کیا۔

ڈاکٹری تعلیم کے لیے اُس کے ذہین نے لکھنو سے میڈیکل کالج کو چُنا۔ علی گڑھ چھوڑنے کا اسے سخت قلق ہوا۔ مختصر سے عرصے میں اس نے وہاں بہت کچھ سیکھا تھا۔ گھر والوں کے خواب پورے ہورہے تھے۔ امتیازی حیثیت سے امتحان پاس کر کے وہ ان کی تمناؤں کی وادی میں قدم رکھ چکا تھا۔

چچاؤں، باپ، ماں اور پھوپھی کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ بیٹے کے درخشاں مستقبل کے خوش آئند تصور سے وہ ہر لحظ لطف اٹھاتے۔

وقت گذرتے کون سی دیر لگتی ہے ابھی دن ہے تو ابھی رات۔ پلک جھپکتے دو سال بھی بیت گئے۔ اشرف میڈیکل کے تیسرے سال میں تھا۔ گرما کی تعطیلات کی آمد آمد تھی پچھلے سال وہ چھٹیوں میں گھر نہ گیا تھا۔ سوچا کہ وقت کا ضیاع ہوگا ہوسٹل میں رہ کر بہتر طریقے سے پڑھائی ہو سکے گی۔ چنانچہ اس نے اپنے اس ارادے سے گھر والوں کو بھی مطلع کر دیا اور اس کی بہتری کے پیش نظر والوں نے بھی اُسے آنے کے لیے مجبور نہ کیا۔ لیکن تعطیلات اب پھر سر پر تھیں فاطمہ اور عائشہ پریشان تھیں۔ گھر کے باقی افراد بھی اشرف سے ملنے کے لیے بے چین تھے۔ شہاب الدین دوپہر کو کھیتوں سے گھر آیا تو بیوی سے بولا۔

''فاطمہ!'' اشرف کو خط لکھوا دو کہ وہ یہ چھٹیاں گھر گذارے۔ ہم سب اس کے لیے اداس ہیں۔ گرمی زوروں پر تھی۔ بائیں ہاتھ پر اوورال ڈالے اور چند کتابیں پکڑے اشرف تیز تیز قدموں سے ہوسٹل جا رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کے روم میٹ اور جگری دوست فرخ

نے آواز دی۔

"یہ لو آشی جان ۔انتظار میں سوکھے جارہے تھے۔"

خط اُسے تھماتے ہوئے فرخ ہنستے ہوئے بولا۔

اشرف نے خط لے کر پڑھنا شروع کیا۔گھر والوں کا سیدھا سادا خط جس میں محبت و پیار کی دنیا بسی ہوئی تھی ۔گرمی کا احساس تک بھی نہ رہا جس میں جلتا ہوا وہ باہر سے آ رہا تھا۔محبت کے پرسحر نغمات میں ڈوبی ہوئی ہوا ئیں اس کے گرد چلنے لگی تھیں ۔ایک بار پڑھنے سے تشنگی نہ بجھی تو دوبارہ پڑھا۔سارے نگاہوں کے سامنے گھوم گئے ۔ماں اور پھوپھی کی پیار بھری نگاہیں ۔باپ چچاؤں کے شفقت لیے ہوئے چہرے اور چھوٹے بہن بھائی اس سے اس کا دل شدت سے چاہا کہ وہ اُڑ کر اپنے گھر پہنچ جائے ۔

یہ جذباتی کیفیت تھوڑی دیر اس پر طاری رہی اور پھر وہ کتابوں کی دنیا میں کھو گیا ۔وہ ایک سمجھدار اور سلجھا ہوا نوجوان تھا۔جانتا تھا کہ زندگی میں مقصد کے حصول کے لیے انسان کو اپنے جذبات کچلنے پڑتے ہیں ۔بہت تکالیف اٹھانی پڑتی ہیں ۔لیکن اس بار وہ گھر جانے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا۔

کتنی بے چینی سے وہ اس کے منتظر تھے۔کس شدت سے انہیں اس کی آمد کا انتظار تھا۔یہ کوئی ان کے دلوں سے ہی پوچھ سکتا تھا۔ ہر صبح طلوع ہونے والا سورج امیدوں کے محل تعمیر کروا تا ایک خوبصورت سی آس ان کے دلوں میں پیدا کرتا ۔جوں جوں دن ڈھلتا جاتا ۔بے کلی بڑھتی جاتی ۔حتیٰ کہ شام نا اُمیدیوں اور مایوسیوں کے اندھیروں میں ڈوب جاتی ۔

انتظار سے تنگ آ کر ایک دن اسلم کہہ اٹھا۔

"بی جان آشی بھائی آخر کب آئیں گے؟"

"دعا کرو بیٹے ۔" "وہ خیرت سے ہو" فاطمہ نے بیٹے سے کہا۔

"انہیں اپنے آنے کی تاریخ لکھنی چاہیے تھی ۔کم از کم ہم تو انتظار میں نہ سوکھتے ۔"

اسلم نے قدرے غصے سے کہا۔

''یوں دل مت چھوٹا کرو بیٹے''فاطمہ نے اس کی دلجوئی کی۔

اور پھر ایک دن صبح اُٹھتے ہی اسما نے زور سے چلا کر کہا۔''

''آج آشی بھائی ضرور آئیں گے۔''

''کیوں تمہیں رات ٹیلیفون آیا ہے؟ یا اللہ میاں نے وحی بھیجی ہے، اسلم نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

''مجھے ٹیلیفون آئے یا وحی نازل ہو۔تمہارے پیٹ میں درد کیوں ہونے لگا ہے۔''؟

''کیوں بیٹی خواب دیکھا ہے۔''فاطمہ نے اسما سے پوچھا۔

''بس بی جی آپ دیکھ لیں''اس نے پورے یقین سے کہا۔

''اور اگر وہ نہ آئے تو اپنا علاج بھی ذرا بتا دو کتنی جوتیاں لگنی چاہیں۔''

اسلم نے ہنستے ہوئے طنز کی''اس کارِ خیر کے لیے تمہاری کھوپڑی زیادہ موزوں رہے گی۔''تیز لہجے میں اسما نے تڑ کی پٹر کی جواب دیا۔

لیکن''کس جرم میں۔''اسلم نے پوچھا۔

اور مجھ پر یہ عنایت کس جرم کے سلسلے میں ہو رہی ہے۔''جواباً پوچھا گیا۔

لیکن ابھی اسلم کوئی مناسب جواب بھی نہ دے سکا تھا کہ دوسری طرف سے عارف کی آواز سنائی دی۔

''خدائی دعوے جو کر رہی ہو۔''

دراصل اس کی شرارتوں کا زیادہ نشانہ اسلم اور عارف ہی بنتے۔ہاتھ دھو کر وہ ان کے پیچھے پڑی رہتی۔لیکن لطف کی بات تو یہ تھی کہ اس کی زیادتیوں کے باوجود بھی گھر والے ہمیشہ انہیں ہی ڈانٹتے۔بچے تو تھے ہی۔ادھار کھائے بیٹھے رہتے۔جہاں ذرا موقع ملتا اسما سے ٹوٹو مَیں کرنے سے باز نہ آتے۔

اسماعارف کی بات سن کر بھڑک اٹھی ۔فوراًبولی ۔

’’واہ مینڈ کی کو بھی زکام ہوگیا ۔اب تو تکے تکے کی باتیں تمہیں بھی آ گئی ہیں ۔‘‘

’’آئیں نہ میں کیا کسی سے کم ہوں؟‘‘ عارف نے جواب دیا۔

صورت دیکھی ہے کبھی آ ئینے میں اپنی ۔‘‘اسمانے طنز سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

’’ہاں ہاں کیوں نہیں تم سے یقیناً اچھی ہے ۔‘‘

اسلم نے دل کھول کر قہقہہ لگایا، غصے سے اس کا بُرا حال تھا۔بس نہ چلا تو کچھ دُور بیٹھی فاطمہ کو زور سے آواز دی۔

’’بی جان دیکھئے عارف کیا کہہ رہا ہے ۔‘‘

فاطمہ نے بیٹے کو ڈانٹنا شروع کر دیا تو اسلم چلا اٹھا ۔

’’اپنی اس لاڈلی کو بھی تو کچھ کہا کریں ۔‘‘

’’اسلم‘‘ فاطمہ نے گہری نظروں سے گھورتے ہوئے بیٹے کا منہ بند کر دیا ۔شام ہو رہی تھی ......آنے والا مہمان ابھی تک نہیں آیا تھا۔اسلم اور عارف اسما کا پھر مذاق اڑا رہے تھے ۔

معاً بیرونی دروازے پر کھٹکا سا ہوا،نگاہیں اٹھیں،اشرف اٹیچی کیس ہاتھ میں پکڑے گھر میں داخل ہو رہا تھا۔نعرے لگاتے ہوئے بچے بھاگے ۔

’’ماں، پھوپھی اور چچی نے بلائیں لیں اور تھوڑی دیر بعد وہ سب دائرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے ۔

’’آج تو اسمانے صبح صبح آپ کے آنے کی پیشن گوئی کر دی تھی‘‘۔

ثریا نے بھائی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

’’اچھا‘‘ اشرف نے ہنستے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا ۔

’’کہاں ہے وہ؟‘‘

''کمرے میں گئی ہے ۔ابھی یہیں تو تھی۔'' فاطمہ نے بتایا۔

''بھائی جان واقعی آج تو اس نے ہمیں بھی قائل کر دیا ہے ۔بس اب تو ہم اس کے مرید ہو گئے ہیں ۔'' اسلم نے ہنستے ہوئے کہا۔''

''کام کروا پنا ۔تم جیسے مرید، مجھے بالکل نہیں چاہئیں ۔'' اسما نے تیزی سے کہا۔

سبھی کھلکھلا کر ہنس دیئے ۔لیکن اشرف تو اسے دیکھ کر حیران ہی رہ گیا۔

ننھی منی سی لڑکی میں کتنی تبدیلی آ چکی تھی ۔بچپنے کے پردے اٹھ رہے تھے، معصوم چہرے پر گلاب کھل اُٹھے تھے ۔کچھا تنے طویل عرصے بعد بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔

فاطمہ نے بیٹے کی نگاہوں میں حیرانی دیکھی تو ہنستے ہوئے بولی ۔

''دیکھو تو کتنی بڑی ہو گئی ہے ۔''؟

باپ اور چچا گھر آئے تو اشرف کو دیکھ کر مسکرا اٹھے ۔باری باری سینے سے لگایا۔اس کے گھر آ جانے سے گھر بھر میں سکون و طمانیت کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی ۔

ہر فرد خوش تھا ۔

وہ خاصا گرم دن تھا ۔دو گھنٹوں کی عرق ریزی کے بعد جب اشرف نے پریکٹیکل نوٹ بک میں دل کی ڈایا گرام مکمل تو تو پیاس سے اس کے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے ۔کسی کو آواز دینے کی بجائے کاپی کو کھلا چھوڑ کر وہ خود پانی پینے چلا گیا۔

اشرف کو گھر آئے خاصے دن ہو رہے تھے ۔لیکن اسما کو اس سے تفصیلی گفتگو کا موقع ہی نہ مل سکا تھا ۔معصوم اور الہڑ سی لڑکی شہری زندگی سے متعلق باتیں نہایت دلچسپی سے سنتی ۔

آج بھی وہ اس سلسلے میں اشرف کے کمرے میں داخل ہوئی ۔کمرے میں اشرف موجود نہ تھا ۔دراصل پچھلی طرف سے آنے کی وجہ سے اس کا راستے میں ٹکراؤ نہ ہو سکا تھا۔

ڈاکٹری کی ضخیم کتابیں چارپائی پر بکھری پڑی تھیں ۔بڑی سی دودھ جیسے سفید کاغذوں والی کاپی اسے دعوتِ نظارہ دے رہی تھی ۔شوقِ تجسس بڑھا قریب آ کر کاپی کو ہاتھ سے پکڑ کر

دیکھا۔انتہائی نفاست اور خوبصورتی سے عجیب وغریب لائنوں والی ایک ایسی شکل بنی ہوئی تھی جو کم ازکم اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

یہ بھلا ہے کیا چیز؟اس نے ڈایاگرام کی طرف دیکھتے ہوئے خود سے کہا اور پھر کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑاتی ہوئی اپنے آپ سے بولی۔

''جانے آشی بھائی کہاں چلے گئے ہیں۔میں تو سوچ کر آئی تھی کہ کچھ دیر باتیں ہی ہوں گی۔''ڈایاگرام کی خوبصورتی پھر اسکی توجہ کھینچ رہی تھی۔

''دیکھو بھلا میں بھی ایسی بنا سکتی ہوں یا نہیں'' پنسل اٹھا کر اس نے ہاتھ میں پکڑ لی۔

''ایسے نہیں بیٹھ کر بناؤ کھڑے ہو کر بنانے سے خراب ہوجائے گی۔''دماغ نے تجویز پیش کی۔

واقعی۔اس تجویز کو اس کے دل نے بھی سراہا۔چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اس نے اپنی نشست کا تنقیدی جائزہ لیا۔کاپی کو گھٹنوں پر رکھا اور پنسل بالکل اسی انداز میں پکڑنے کی کوشش کی جیسے وہ اشرف کو پکڑتے دیکھا کرتی تھی۔انتہائی محویت اپنے اوپر طاری کرتے ہوئے اس نے کاپی پر مینا کاری شروع کر دی۔

اشرف جب واپس آیا تو دروازے میں داخل ہوتے ہی اس نے اسما کو کاپی پر کچھ لکھتے پایا۔جلدی سے کاپی اس کے ہاتھ سے چھین کر دیکھی تو وہ ڈایاگرام جو اس نے انتہائی محنت اور دیدہ ریزی سے تیار کی تھی،عملِ جراحی کی نذر ہو چکی تھی۔غصے میں اسما کو بازو سے پکڑ کر اس نے زور کا جھٹکا دیا تو اس کی چیخ نکل گئی۔پھول سے رخسار پر دو تین چپت بھی لگا دیے اور خود بیٹھ کر ڈایاگرام کا ماتم کرنے لگا۔

وہ تو گھر بھر کی لاڈلی تھی۔بڑے سے بڑے نقصان پر بھی کبھی کسی نے ٹوکا نہ تھا۔ہچکیاں لے لے کر جو اس نے رونا شروع کیا تو بس توبہ ہی بھلی۔

اشرف کے غصے میں کچھ کمی ہوئی تو اسما کو دیکھا۔جو ڈوپٹے سے چہرہ چھپائے بری طرح رو رہی تھی۔دل میں ندامت سی پیدا ہوئی۔

''مجھے اتنی جلدی برانگیختہ نہیں ہونا چاہیے تھا''۔

کسے مارا ہے، اسما کو۔ اسما جو اس ہستی کی بیٹی ہے جسے تم دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تصور کرتے ہو'، ضمیر نے ملامت کی۔

پھوپھی کا خیال آتے ہی وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور قریب جا کر اسے خاموش کرانا چاہا۔ لیکن وہ تو ہاتھ لگتے ہی بھڑک اٹھی۔ اشرف کو محسوس ہو گیا کہ وہ اس وقت شدید غصے میں ہے۔ شانوں سے پکڑ کر بڑی مشکل سے کھینچ کر وہ اسے اپنے قریب لے آیا، خود چارپائی پر بیٹھتے ہوئے زبردستی اسے بھی اپنے پاس بٹھالیا۔

''اسما دیکھو! یہ کام میں نے پورے دو گھنٹے میں مکمل کیا تھا'' جس کا تم نے آنِ واحد میں ستیاناس کر دیا ہے۔ تمہارے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ تم اسے ایک معمولی چیز خیال کرتی ہو لیکن اب تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ میرے لیے یہ کتنا بڑا نقصان ہے۔ خود سوچو جو وقت میں اب اس کام پر دوبارہ صرف کروں گا۔ اسے کسی اور مصرف میں لاتا۔ تو کیا یہ بہتر نہ ہوتا۔ اشرف نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

لیکن گھٹی گھٹی سسکیاں اب بھی جاری تھیں۔

اسما کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ آنسو اب خاموشی سے ایک دوسرے کے پیچھے بہہ رہے تھے۔ اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کر کے اشرف نے اس کا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''اسما اب رونا ختم کرو۔''

اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ یہ سرخ سرخ اور سوجی سوجی خوبصورت آنکھیں اشرف کو بہت پیاری لگیں۔ وہ چند لمحوں تک بغور اس کی طرف دیکھتا رہا اس امر سے وہ بخوبی آگاہ تھا کہ مستقبل میں اسما کا ہاتھ اسے شریکِ حیات کی حیثیت سے تھامنا ہے اور آج اپنے بالکل قریب بیٹھی چودہ پندرہ سال کی اس پیاری سے لڑکی کے متعلق احساسات بڑے ہی عجیب ہو رہے تھے۔

ایسے احساسات جنہیں وہ پہلے کبھی نہ محسوس کرسکا تھا۔

''اسما اندر جا کر بی جان کو تو نہیں بتاؤ گی کہ میں نے تمہیں مارا ہے''اشرف نے اس کا موڈ درست کرنے کی غرض سے پوچھا۔''

''ضرور بتاؤں گی''لہجہ تیکھا تھا۔

چلو اس بار معافی۔آئندہ کبھی ایسی غلطی نہیں ہوگی''اشرف اس کے تیکھے انداز پر مسکرا دیا۔

''معافی کا کوئی سوال نہیں'اس نے قدرے غصے سے اشرف کی طرف دیکھا۔''

''معافی نہیں ملے گی تو کیا ہوگا۔''؟اشرف دلچسپی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

آپ کو ڈنڈے لگیں گے۔خوبصورت آنکھیں غصہ چھلکا رہی تھیں۔

''اچھی بات ہے اگر میرے پٹنے سے تمہیں خوشی ہوسکتی ہے۔میں تو مار کھانے کے لیے تیار ہوں''۔

''لیکن اسما تم یہاں کیسے آئی تھیں؟اشرف نے ایک لحہ توقف کے بعد پوچھا۔

''میں تو آپ سے گپ شپ کرنے آئی تھی؟''اس نے معصومیت سے اشرف کو دیکھتے ہوئے یہ جملہ بے اختیار ہی کہہ دیا۔

سادگی سے کہی ہوئی یہ بات اشرف کو بہت پسند آئی۔لفظ''گپ شپ''پر وہ اپنی ہنسی ضبط نہ کرسکا،اور بولا۔

''تو یوں کہو کہ میرا دماغ خالی کرنے آئی تھیں۔''چلو اپنی اس کوشش میں تم کافی حد تک کامیاب ہو ہی گئیں۔

''اسما!اسما تم کہاں ہو؟''باہر سے ثریا نے آواز دی۔

جلدی سے بھاگ کر وہ باہر چلی گئی۔اشرف اب ماں کے بلاوے کا منتظر تھا لیکن دربار میں طلبی کے لیے کوئی سمن نہ آیا۔دوپہر کا کھانا کھانے اندر گیا تو بھی ہر طرح سے خیریت تھی۔کھانا

کھاتی ہوئی اسما کو اس نے ایک نظر دیکھا۔تو وہ شوخ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ تھی۔اس کی آنکھوں میں چمکتی مسکراہٹ کا مفہوم وہ سمجھ گیا تھا۔ خفیف سا مسکرا دیا۔

”اسما بتا بھی کیسے سکتی تھی وہ اشرف ہی تو تھا۔جس سے وہ سب سے زیادہ مانوس تھی۔ بچپن میں تو ایک معصوم سا ہمدوار تعلق تھا۔لیکن شعور کی دولت ملتے ہی اسے احساس ہو گیا کہ گھر والے اسے اشرف کے ساتھ حسین بندھن میں باندھنا چاہتے ہیں اور یہ وہ لطیف سا احساس تھا۔ جس میں اس کی روح ڈوب ڈوب گئی۔

”اس کے جذبات واحساسات اپنی ایک الگ دُنیا بسائے ہوئے تھے۔خوبصورت اور پیاری سی دنیا جس میں وہ سندر سندر سپنے دیکھا کرتی۔اپنی اس دُنیا سے اس نے ابھی تک کسی کو آگاہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی وہ آگاہ کرنا چاہتی تھی۔

باب نمبر: 5

جانے کہاں سے ایک چھوٹی سی چوہیا نے آ کر اس کی محویت کا طلسم توڑ دیا۔غیرارادی طور پر نگاہ ٹائم پیس کی طرف گئی۔ وہ چونک ہی تو اٹھا۔ چھ بج رہے تھے۔اوراسے ابھی ایک پرائیوٹ وارڈ کے نئے مریض کی ہسٹری لینے کے لیے جانا تھا۔سامنے بستر پر دیکھا۔فرخ گہری نیند میں غرق ہلکے ہلکے خراٹے لے رہا تھا۔وہ میز پر بکھری کتابیں درست کرتے ہوئے تیزی سے اُٹھا اور فرخ کی رضائی کھینچ لی۔

''پوستی کہیں کے اب اُٹھ بھی چکو۔ چھ بجنے کو ہیں۔اشرف نے اس کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے کہا''۔

گرم گرم جسم کو جب خنکی کا احساس ہوا تو فرخ نے آنکھیں جھپکتے ہوئے خوابیدہ سے لہجے میں کہا۔

''اُوں ہوں۔سونے دو یار کیا کرتے ہو؟''

''حضور شاید مرغزاروں میں سیر کے لیے پہنچے ہوئے ہیں۔پرسوں جب ڈاکٹر زیدی کے پاس کیس پیش کرنا پڑا تو دماغ خودبخود ٹھکانے آجائے گا۔''

ڈاکٹر زیدی کے نام پر نیند کا غلبہ یکدم کافور ہوگیا۔آنکھیں پوری طرح کھولتے ہوئے وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اشرف بے اختیار ہنس پڑا۔

''کیوں ظلم کرنے پر تلے ہوئے ہو۔میری تو صورت دیکھ کر ہی اس کا پارہ ایک سوبیس ڈگری پر پہنچ جائے گا۔''فرخ نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے منہ بنا کر کہا۔

اور اگر اس نے گرج کر کہا۔کہ''آخر تمہارا ساتھی کس مرض کی دوا ہے۔تب تمہارے پسینے چھوٹیں گے۔''سنو اشرف پیارے میرے پسینے چھٹیں گےتو رومال تم سے ہرگز نہیں مانگوں گا۔''

''چرب زبانی میں تمہارا جواب نہیں۔لیکن میرا فیصلہ بھی ہے کہ اس بار کیس تم ہی پیش کرو گے۔''اشرف نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ٹھیک ہےہم کیس ضرور پیش کریں گے۔لیکن ایک شرط پر۔''

''کیا؟''اشرف نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''آج میری طبیعت ٹھیک نہیں۔سارا جسم ٹوٹ رہا ہے۔مریض کی ہسٹری لینے کے لیےتم اکیلے جاؤ۔پورا کیس تیار کرواور پھر میں اسے ڈاکٹر زیدی کے سامنے پیش کر دوں گا۔فرخ نے شاہانہ انداز سے رضائی ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

''کیا کہنے ہیں تمہارے محنت اور تردد کے بغیر پکی پکائی کھیر ہضم کر سکو گے؟''اشرف نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔اگر کوئی گڑبڑ ہوگئی تو ہاضمے کی گولیوں کا نام مجھے معلوم ہے۔

فرخ نے آنکھیں نچائیں۔

''خدا بچائے تم سے،اچھا تو تم آرام کرو۔''اشرف نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

''وہ باہر آیا تو خاور مشرق دن بھر کا سفر طے کرکے اپنے مغربی محل میں آرام کے لیے چلا گیا تھا۔تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا مریض کے کمرے تک جا پہنچا۔دروازہ بند تھا۔اس نے دھیرے

سے دستک دی۔مگر کوئی جواب نہ ملا۔کافی دیر دستک دینے کے باوجود بھی جب اندر سے کوئی جواب نہ ملاتو مجبوراً اس نے دروازے کو اندر کی طرف آہستہ سے دھکا دیا۔کمرے میں کوئی متنفس نظر نہ پڑا۔سامان قرینے سے لگاہوا تھا۔''

چارٹ بیڈ کے ساتھ لٹک رہا تھا۔اس پر تذبذب کی سی کیفیت طاری تھی۔دماغ مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔واپس لوٹ جائے یا کمرے کے اندر داخل ہو جائے۔لیکن کیس پیش کرنے میں صرف ایک دن باقی تھا۔اور اگر کیس تیار نہ ہو سکا تو؟ ڈاکٹر زیدی کا غصیلا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔

''نہیں میں ہسٹری لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔''

دروازے پر کھڑا رہنا نامناسب خیال کرتے ہوئے وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ابھی وہ چارٹ کا کو پوری طرح جائزہ بھی نہ لے پایا تھا کہ قدموں کی آہٹ سنائی دی۔دیکھا تو ایک اٹھارہ انیس سالہ لڑکی کو ایک بھاری بھرکم خاتون سہارا دیئے واش روم سے آ رہی تھیں۔

اسے اوورال میں ملبوس چارٹ دیکھتے ہوئے وہ سمجھ گئی تھیں کہ یہ ڈاکٹر ہے اس لیے انہوں نے اس سے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔مریضہ کو بستر پر لٹا دیا گیا۔لڑکی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔بیماری سے چہرے کی رنگت زردی مائل ہو گئی تھی بال شانوں تک کٹے ہوئے تھے امیر اور فیشن ایبل گھرانے کی فرد معلوم ہوتی تھی۔

بھاری بھرکم خاتون مریضہ سے کافی مشابہت رکھتی تھیں۔قیمتی ساڑھی میں ملبوس بستر کے پاس پریشانی کی حالت میں کھڑی تھیں۔شاید یہ مریضہ کی والدہ تھیں۔

معمر خاتون کی پریشانی کو محسوس کرتے ہوئے اشرف نے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔

''گھبرایئے نہیں۔ٹھیک ہو جائیں گی۔کیس کچھ اتنا پیچیدہ نہیں۔''

''کیا کروں بیٹے۔یہ میری سب سے چھوٹی بیٹی ہے۔اس کا غم مجھے کھائے جا رہا ہے۔''خاتون نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے دردناک لہجہ میں کہا۔

''اللہ تعالٰی سے دعا کیجیے۔وہ سب پریشانیاں دور کرنے والا ہے۔''

آہستہ آہستہ اس نے مرض سے متعلقہ تمام جزوی تفصیلات کا نوٹ بک میں اندراج کر لیا۔''بیٹا'' تم ڈاکٹری پڑھ رہے ہو۔یا ڈاکٹر بن چکے ہو؟''

خاتون نے پوچھا۔

یہ میرا آخری سال ہے؟ اشرف نے شائستگی سے جواب دیا۔

اُس کے چہرے سے ٹپکتی شرافت خاتون کو اس کا معاشرتی پس منظر جاننے پر مجبور کر رہی تھی۔

اور جب اس کے گھریلو حالات سے واقفیت ہوئی تو خاتون کی آنکھیں کسی انجانے احساس کے تحت چمک رہی تھیں۔

''اچھا اب اجازت دیجئے'' ۔اشرف نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''خاتون نے نوکر کو آنکھ سے چائے تیار کرنے کا اشارہ کیا اور اشرف سے مخاطب ہوئیں۔

''ٹھہرو بیٹے تھوڑی دیر اور بیٹھوں مجھے تمہاری عادت بڑی پسند آئی ہے۔خوش قسمت ہے وہ ماں جس کے تم بیٹے ہو۔آج کل کے نوجوان تو تہذیب وشائستگی سے کوسوں دور ہیں۔سردی زیادہ ہے۔اب چائے پی کر جانا۔''

شکریہ میں چائے کا کچھ اتنا عادی نہیں۔اس نے معذرت کی۔

''تم بیٹھو بیٹے چائے تو تیار بھی ہوگئی ہے۔طلبا تو چائے کے بہت رسیا ہوتے ہیں' اور خاتون کے پیہم اصرار پر اشرف کو جھکنا پڑا۔''

چائے خاصی پرتکلف تھی۔

آئندہ بھی ملتے رہنے کا وعدہ لے کر خاتون اسے دروازے تک چھوڑنے آئیں اشرف اس اجنبی عورت کے اخلاق سے بہت متاثر ہوا۔راستہ بھر سوچتا رہا کہ دنیا ابھی ایسے اچھے لوگوں

سے خالی نہیں ۔ جو صاحب ثروت ہوتے ہوئے بھی بہترین اخلاقی صفات کے حامل ہیں ۔ ورنہ آج کے اس مادی دور میں اخلاق تو ایک بے نام سی چیز ہو کر رہ گئی ہے ۔

جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو فرخ مطالعہ میں مصروف تھا ۔ اور اس کے بٹن کھولتے ہوئے اشرف نے بلند آواز میں اسے سُناتے ہوئے خود سے کہا ۔

''واہ واہ کتنی بااخلاق خاتون تھی وہ ۔''

''کس کی شان میں یہ قصیدے پڑھے جا رہے ہیں؟'' فرخ نے پوچھا ۔

''جس نے آج شام بہترین چائے پلائی ۔''

''ہوں! تو سرکار چائے پی کر آ رہے ہیں ...... اپن تو پھر بڑے خسارے میں رہے ۔''

''اچھا ہے اور نہ جاؤ؟'' اشرف نے اسے چڑاتے ہوئے کہا ۔

ہر روز تو تمہارے ساتھ جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہوں ۔ کبھی ایک گھونٹ بھی چائے کا نصیب نہیں ہوا ۔ اب مجھے کیا الہام ہوا تھا کہ تم چائے پی کر آؤ گے ۔

''خدا کے لیے اب یوں ماتم تو نہ کرو ورنہ مجھے تو وہ ہضم کرنی بھی مشکل ہو جائے گی ۔'' اشرف نے ہنس کر کہا ۔

''اچھا بتاؤ نا ۔ کون تھی وہ سخی دل جس نے مہنگائی کے اس زمانے میں حاتم طائی کی قبر پر لات ماری اور تمہیں چائے پلائی ۔''

اور جب اشرف نے اسے تمام واقعہ سنایا تو فرخ مسکراتے ہوئے بولا ۔

''مجھے تو دال میں کچھ کالا لگتا ہے ۔''

''ساون کے اندھے کو آخر ہریالی کے سوا اور سوجھتا بھی کیا ہے ۔''؟

''خدا کے بندے آخر اُسے دودھ، پتی اور چینی ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ بقول تمہارے اس نے خاصی پر تکلف چائے پیش کی ۔ وہ کیا تمہاری چچی پھوپھی لگتی تھیں ۔''

''واقعی تمہاری صورت دیکھ کر اگر ڈاکٹر زیدی کی پیشانی شکن آلود ہو جاتی ہے تو کچھ

بے جا نہیں۔''

''اوہوں یہاں پرواہ کسے ہے۔''؟

''ازلی ڈھیٹ ہو۔'' اشرف مسکرایا۔

''سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔''

وہ دونوں صرف روم میٹ ہی نہ تھے۔ بلکہ گہرے دوست بھی تھے۔ ایک دوسرے سے بے پایاں محبت اور گہرا خلوص تھا۔ جہاں فرخ ایک امیر گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ وہاں اشرف چند سادہ لوح دیہاتیوں کی تمناؤں کا مرکز تھا۔ لیکن ان کی دوستی غربت و امارت کے فرق سے بے نیاز تھی۔

باب نمبر: 6

ایک عظیم الشان کوٹھی واقع ہے۔خوبصورت سیاہ رنگ کے آہنی گیٹ کے ساتھ دیواروں میں نفیس شیشے کے چوکھٹے نصب ہیں جن پر چوہدری فضل احمد کا نام لکھا ہوا ہے۔

''دائیں ہاتھ اردو میں اور بائیں ہاتھ انگریزی میں گیٹ کے پاس ہی چھوٹے سے سٹول پر ایک کا باوردی ملازم بیٹھا ہوا ہے۔سیمنٹ کی ایک خاصی چوڑی روش گیٹ سے شروع ہوکر دور کوٹھی کے برآمدے تک جاتی ہے۔روش کے دونوں طرف خوبصورت لان ہیں۔دائیں طرف لان کے وسط میں سنگِ مرمر کا ایک چھوٹا سا تالاب ہے۔پانی چار پانچ فٹ کی بلندی سے اچھل کر واپس تالاب میں گرتے ہوئے دلفریب منظر پیدا کرتا ہے۔تالاب کے آس پاس پھولوں کی خوبصورت کیاریاں ہیں۔سلیقے سے تراشی ہوئی باڑ دیدہ زیبی میں اور اضافہ کرتی ہے۔بائیں طرف لان کے وسط میں سوئمنگ پول ہے۔بیرونی دیواروں کے ساتھ سفیدے کے لمبے لمبے درخت ہیں۔بجلی کے رنگین قمقمے گیٹ سے شروع ہوکر بل کھاتے ہوئے لان کے آخری کونے تک چلے گئے ہیں۔

کوٹھی تقریباً بیس کمروں پر مشتمل ہے۔پچھلی طرف پائیں باغ ہے جس میں پھل دار درختوں کی خاصی بہتات ہے۔عمارت کے داہنے رخ پر گھریلو ملازموں کے لیے رہائشی کوارٹرز ہیں۔

وقت وقت کی بات ہے۔ایک وقت تھا جب اتنی بڑی کوٹھی کے مالک کو زندگی کی یہ

آسائشیں میسر نہ تھیں۔ کوئنز روڈ کے فٹ پاتھوں پر موسمی پھلوں کی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ ٹوٹا پھوٹا ہوا ایک گھر تھا۔ پانچ بچے مفلسی اور بدحالی کی وجہ سے سارا دن ادھر ادھر ننگ دھڑنگ پھرتے رہتے تھے۔ لیکن خدا کے کام نرالے ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے عزت اور دولت کا تاج پہناتا ہے اور مفلسی کے عمیق گڑھوں سے نکال کر سیم وزر کے بلند ایوانوں میں پہنچا دیتا ہے۔ فضل احمد کا ایک پرانا دوست عرصہ دراز سے برطانیہ میں مقیم تھا۔ اس کا وہاں گھڑیوں کا کاروبار تھا۔ وطن واپس آیا تو فضل احمد سے ملاقات ہوئی۔ بچپن کے جگری دوست کو اس حالت میں دیکھ کر اسے سخت صدمہ پہنچا۔ اس نے دوست کو مالی معاونت کی پیش کش کی جسے کسی قدر ہچکچاہٹ کے بعد فضل احمد نے قبول کر لیا۔

بخت جو جانے کب سے خوابیدہ تھا۔ انگڑائی لے کر جاگ اٹھا۔ پہلے سینکڑوں میں کھیلا پھر ہزاروں کی نوبت آئی کاروبار تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا جس چیز کو ہاتھ لگاتا سونا بن جاتی۔

پیسہ آیا تو زندگی کے انداز بدلے۔ رہنے کے لیے عالی شان گھر تعمیر ہوا بچوں کو بہترین اور اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخل کرا دیا گیا۔ بڑے بڑے لوگوں سے میل ملاپ شروع ہوا۔ چنانچہ وہ اخلاقی اوصاف جو غربت کی وجہ سے ساتھ چمٹے ہوئے تھے ان کی حقیقت اب فرسودہ نظر آنے لگی۔ زندگی پرہیز گاری سے ہٹ کر جام وسبو میں ڈھلنے لگی۔ حصولِ زر کی خواہش نے نیکی و بدی کی درمیانی حدوں کو مٹا دیا۔ جائز اور ناجائز ہر حربہ دولت بڑھانے کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ کلب، رقص اور شراب! زندگی ان کے درمیان الجھ کر رہ گئی تھی۔ لیکن قدرت بھی عنایتوں کی بارش دن بدن تیز کر رہی تھی۔ کاروبار لاکھوں کو چھوتا ہوا کروڑوں تک پہنچ گیا تھا۔ ہر طرف سے سکون و طمانیت کی ہوائیں آ رہی تھیں۔ دولت کی ریل پیل تھی۔ بچے بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے تھے۔ سب سے بڑے لڑکے نے وکالت کی۔ چھوٹا بیٹا انجینئر بنا دولڑکیوں نے بی اے کیا۔ سب سے چھوٹی لڑکی فسٹ ائیر میں تھی۔ چنانچہ اس کے علاوہ باقی سب کے اپنے ہم مرتبہ اور ذی حیثیت لوگوں میں رشتے ناطے ہوئے۔ بیٹیوں کو خوب بڑھ چڑھ کر دیا اور بہوئیں

بھی بہت کچھ لائیں ۔ دو تین ماہ تو خیریت رہی لیکن کچھ تو بیگم فضل کی تیز طبیعت اور کچھ امیر گھرانوں کی بیٹیوں کا غصہ ناک پر۔ گھر میں ہر وقت تُو تُو میں میں رہنے لگی۔ بیویوں کو محبوب رکھنے والے شوہروں کو بھلا یہ بات کب گوارا ہو سکتی تھی؟

چنانچہ وہ انہیں لے کر دوسرے شہروں میں سکونت پذیر ہو گئے ۔اور ماں باپ سے کسی حد تک میل ملاپ ختم ہو گیا ۔پُر سکون زندگی میں غم کے ہلکے ہلکے گرداب آ گئے ۔سب سے چھوٹی لڑکی اب انیس سال کی ہو چکی تھی اور بی ایس سی کی طالبہ تھی ۔ماں باپ اس کے لیے کسی غریب اور ہونہار لڑکے کی تلاش میں تھے جسے گھر داماد رکھا جا سکتا۔

ایک دن کوئی دس بجے کے قریب ہلکے آسمانی رنگ کی ایک خوبصورت سی کار کوٹھی میں داخل ہوئی ۔کار برآمدے میں آ کر رُکی اور اس میں سے ایک بھاری بھر کم خاتون نکلیں، یہ بیگم فضل تھیں ۔کار کی آواز سنکر چوہدری فضل احمد ڈرائنگ روم سے باہر نکلے اور بیگم کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولے۔

''بیگم فریدہ کا کیا حال ہے؟ میں بس تھوڑی دیر میں ہسپتال پہنچنے ہی والا تھا۔''

''تیرہ کو آپریشن ہے۔لیکن آپ ڈھاکہ سے کب آئے؟'' بیگم فضل نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''گھنٹہ بھر ہو چکا ہے۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''ایک خوش خبری سنیں گے آپ۔'' بیگم فضل نے مسکراتے ہوئے شوہر کی طرف دیکھا۔

''کیسی خوشخبری؟ اس وقت تو فریدہ کی صحت سے بڑھ کر میرے لیے اور کوئی خوشخبری نہیں ہو سکتی۔''

انہوں نے قدرے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''جس گوہر مقصود کی ہمیں تلاش تھی وہ مل گیا ہے۔'' بیگم فضل نے آنکھیں خوشی سے

نچاتے ہوئے کہا۔

''میں مطلب نہیں سمجھا۔''

''میں نے بات معّموں میں تو کی نہیں جو آپ نہ سمجھ سکیں۔''

''عقلمند و دانا بیگم فضل موٹی عقل والے شوہر کو ذرا سمجھاؤ کہ میرے بعد کونسا انمول ہیرا دریافت ہوا ہے۔''

''فریدہ کے لیے فسٹ کلاس لڑکا'' بیگم نے شوخ لہجے میں کہا۔

''بس'' انہوں نے اس لفظ کو خاصا لمبا کرتے ہوئے کہا۔

''میں تو سمجھا تھا کہ پتہ نہیں میری بیگم نے کون سا تیر امارا ہے''۔

انہوں نے بیگم پر لطیف سی چوٹ کی۔

''اچھا لڑکا ڈھونڈنا کیا تیر مارنے سے کم ہے؟ جناب عالی ابھی باتیں بنا رہے ہیں جب لڑکا دیکھیں گے تو عش عش کر اٹھیں گے میرے انتخاب پر لاکھوں میں ایک ہے۔ خوبصورت، مہذب، شائستہ اور قابل'' کون سی ایسی خوبی ہے جو اس میں موجود نہیں؟'' بیگم نے تفاخر سے کہا۔

''ہوں کون ہے؟ کس کا بیٹا ہے؟ اور کیا کرتا ہے؟ بیوی کے فصیح و بلیغ بیان پر انہوں نے پوچھا اور جب انہیں بیگم سے تفصیل معلوم ہوئی تو مسکراتے ہوئے بولے۔

''واقعی کسی عقلمند نے سچ ہی تو کہا ہے۔ عورتوں کی عقل ان کے ٹخنوں میں ہوتی ہے۔ بس دیکھا اور ریجھ گئیں اور لگیں رشتے ناطے کرنے۔ تم نے شادی کو کیا گڑیا کا کھیل سمجھ لیا ہے؟''

''بس بس میرے ساتھ الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پہلے لڑکا دیکھ لیں، باتیں بعد میں کرنا۔''

بیگم فضل نے تیزی سے کہا۔

''چلو ٹھیک ہے دیکھے لیتے ہیں تمہارا انتخاب بھی۔ ہوں تو پھر اس دُرِ نایاب کا دیدار کب کروا رہی ہو؟'' انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

''آج شام''۔

''تم نے تعریفوں کے پُل باندھ کر ہمارا اشتیاق بہت بڑھا دیا ہے۔''

''میں نے ناجائز تعریف ہرگز نہیں کی ۔ جب آپ اس سے ملیں گے تو یہ بات آپ پر خودآشکارا ہو جائے گی کہ میں نے غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔'' بیگم فضل نے اٹھتے ہوئے کہا۔

شام کو جب فضل احمد ہسپتال پہنچے تو بیگم فضل نے نوکر کے ہاتھ چٹ بھیج کر اشرف کو بلوایا۔لیکن نوکر نے واپس آ کر اطلاع دی کہ وہ ہوسٹل میں نہیں ہیں ۔بیگم فضل کو سخت مایوسی ہوئی لیکن کیا کر سکتی تھیں دل مسوس کر رہ گئیں ۔

اشرف سرجیکل وارڈ میں راؤنڈ ختم کر کے واپس ہوسٹل جا رہا تھا ۔ایسے ہی خیال آیا کہ خاتون کی صاحبزادی کے متعلق دریافت کرتا جائے ۔کیا خیال کریں گی کہ واپس پلٹ کر پوچھا تک نہیں اوراس خیال کے تحت اس کے قدم خودبخود پرائیویٹ وارڈ کی طرف اٹھنے لگے۔دروازہ آج بھی بند تھا۔دھیرے سے دستک دی تو نوکر نے آ کر دروازہ کھولا۔

اور جونہی بیگم فضل کی اس پر نظر پڑی۔ان کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں ۔تیزی سے اس کی طرف لپکیں اور محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں ۔

''بیٹے تم نے تو پلٹ کر بھی نہ پوچھا۔''

پردیس میں خلوص وچاہت کے اس بے پناہ اظہار نے اسے بے حد متاثر کیا۔ادب سے بولا۔

''انتہائی مصروفیت کی بناء پر نہ آ سکا۔مجھے افسوس ہے۔''

''خیر کوئی بات نہیں دراصل مجھے تمہاری عادت بہت پسند آئی ہے۔اس لیے میں تمہیں دوبارہ دیکھنا چاہتی تھی ۔آؤ میرے شوہر سے ملو'' کہتے ہوئے انہوں نے اس کا فضل احمد سے متعارف کرایا۔

''آپ کی بچی کیسی ہے؟ میں ذرا چارٹ دیکھ لوں ۔''

چارٹ بیڈ سے اتارتے ہوئے اس نے غیر ارادی طور پر مریضہ کو دیکھا۔فریدہ لمبی لمبی پلکیں اٹھائے اس کی طرف دیکھ رہی تھی ۔نگاہوں کا تصادم اتنا اچانک ہوا کہ اشرف بوکھلا سا گیا۔ہاتھ کانپ گئے ۔جسم میں یکدم سنسناہٹ کا احساس ہو ۔لیکن اس نے تیزی سے اپنی حالت پر قابو پالیا۔

چارٹ کو دوبارہ اٹھا کر اس نے واپس جانے کی اجازت مانگی۔

''چائے پی کر جانا بیٹے!''بیگم فضل نے کہا۔

''دیکھئے آپ تکلف نہ کریں''اشرف نے درخواست کی ۔

''یہ تکلف کوئی تمہارے لیے تھوڑی ہے صاحبزادے؟ چائے تو مجھے بھی پینی ہے'اچھا ہے اکٹھے پیئیں گے ۔''،فضل احمد نے مسکراتے ہوئے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

دوبارہ انکار اشرف کو کچھ اچھا نہ لگا۔چائے پیتے ہوئے بیگم فضل نے اُسے اگلے دن آنے کیلئے کہا۔

''افسوس ہے میں کل نہیں آسکوں گا۔کیونکہ مجھے بمبئی جانا ہے ۔اس نے معذرت کی ۔''

وہاں کس سلسلے میں جا رہے ہو؟فضل احمد نے دریافت کیا۔

بمبئی میڈکل کالج میں تقریری مقابلہ ہے اور مجھے اپنے کالج کی طرف سے اس مباحثے میں حصہ لینا ہے۔''اشرف نے جواب دیا۔

''خوب تو گویا تم ایک اچھے مقرر بھی ہو۔''فضل احمد نے ستائش بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

''بس تھوڑا بہت بول لیتا ہوں ۔اچھا اب اجازت دیجئے ۔''

ہاتھ ملاتے ہوئے فضل احمد نے پیار بھرے لہجے میں اس سے کہا۔''اشرف ہم لوگ تکلفات کے عادی نہیں ۔اگر تم کبھی ہماری مدد کی ضرورت محسوس کرو تو بلا تکلف چلے آنا ۔یہ میرا کارڈ ہے۔''

’’شکریہ!‘‘ کہتے ہوئے اشرف چلا گیا۔

’’اچھا بھئی اب میں بھی چلتا ہوں‘ انہوں نے بیٹی کو پیار کیا اور بیگم کے ساتھ باہر نکل آئے ’’اب کہو‘‘ بیگم فضل نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

’’واقعی میں تمہاری بلند ذوقی کی داد دیتا ہوں۔ حقیقتاً لڑکا لاجواب ہے‘ ہاتھوں سے نکلنے نہ پائے۔ فضل احمد نے گہری نظروں سے بیوی کو دیکھتے ہوئے کہا‘‘۔

’’آپ مطمئن رہیے۔‘‘ بیگم فضل عیارانہ مسکراہٹ سے انہیں رخصت کرتے ہوئے بولیں۔

باب نمبر: 7

''میرے خدایا انتظار کتنا تکلیف دہ ہے۔''

پائیں باغ میں ٹہلتی ہوئی فریدہ نے سوچا۔اسے ہسپتال سے آئے چھ دن ہو چکے تھے اوراب وہ تیزی سے روبصحت ہورہی تھی۔کل اس کے غسل صحت کی خوشی میں ایک شاندار جشن منایا جانے والا تھا۔محفلِ موسیقی کا خصوصی پروگرام تھا۔اشرف کودعوت نامہ اور بیگم فضل کا تاکیدی خط نوکر کے ہاتھ تھوڑی دیر قبل بھیجا گیا تھا۔

فریدہ بے چینی سے نوکر کی واپسی کی منتظر تھی۔اس پر ایک ہی سوچ اور ایک ہی خیال حاوی تھا،کیا اشرف کل کے جشن میں شرکت کر سکے گا؟

نگاہیں اٹھیں اور سامنے سے آتے ہوئے نوکر پر پڑیں آنکھوں میں زمانے بھر کا تجسس اور بے چینی لیے وہ نوکر کی طرف بڑھی۔لیکن وہ یہ جاننے پر کہ وہ اشرف سے تو مل نہیں سکا۔

دعوت نامہ اس کے روم میٹ کو دے آیا ہے۔اس کی آنکھوں کی جوت مدھم پڑ گئی۔ افسردگی کا سایہ اس کے چہرے پر چھا گیا۔

''تم نے پوچھا ہوتا کہ بمبئی سے آ گئے ہیں یا نہیں۔فریدہ نے بجھی ہوئی آواز میں نوکر سے کہا۔''یہ تو میں نے پوچھا نہیں چھوٹی بی بی''۔

''ہاں تم نے کاہے کو پوچھنا تھا۔تمہاری بلا سے خط اسے ملے یا نہ ملے۔میری بلا سے تمہیں

عقل کب آئے گی؟ اتنے بڑے لٹھ کے لٹھ ہو گئے ہو۔ زندہ کی خبر لینے کے لیے تمہیں بھیجا جائے تو مُردے کا پتہ لاتے ہو۔" فریدہ گرجتے ہوئے بولی۔

نوکر بیچارہ مالکن کی ڈانٹ سے سہم گیا تھا۔ خاموش رہا۔ فریدہ افق کی طرف دیکھتے ہوئے کسی خیال میں گم ہو گئی۔ کتنی دیر بعد چونکی تو شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔ پھیکی دھوپ میں تمازت ختم ہو چکی تھی۔ فضا میں ٹھنڈک بڑھ رہی تھی۔ شال کو کندھوں سے لپیٹے ہوئے وہ بوجھل بوجھل قدموں سے اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔

آتش دان میں کوئلے دہک رہے تھے اور کمرہ باہر سے آنے والے کو حرارت کا ایک خوشگوار احساس دے رہا تھا۔ اس نے شال کو کندھوں سے اُتارا اور آرام کرسی گھسیٹ کر آتش دان کے سامنے کر لی۔ وہ کچھ مایوس ہو گئی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ نوکر خود اسے خط دے کر آتا تو اور بات تھی۔ دوست کو دے آیا ہے کیا معلوم وہ دنیا ہی بھول جائے؟

"کہتے ہیں جب ڈاکٹر مریض کی کیس ہسٹری تیار کرتے ہیں تو مریض کا چہرہ ان کے سامنے ہوتا ہے۔ اشرف نے جب رات کے سناٹوں میں میرا کیس تیار کیا تھا تو میرے متعلق بھی کچھ سوچا ہو گا۔ کاش وہ جان سکے کہ تھوڑی دیر کی یہ دو ملاقاتیں میرے دل پر کتنا گہرا اثر چھوڑ چکی ہیں۔

مَیں ہسپتال سے صحت یاب ہو کر لوٹی ہوں لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ دِل جیسا گوہر انمول وہی گم کر آئی ہوں۔ آہ اگر تم کل کے جشن میں نہ آئے تو یہ تقریب کتنی پھیکی ہو گی؟ لمبا سانس لیتے ہوئے فریدہ نے خود سے کہا۔

نگاہیں شعلوں پر جمی ہوئی تھیں۔ دھیرے دھیرے شعلوں کے درمیان ایک دل آویز شبیہہ اُبھری۔ سُرخ و سفید رنگ گندی پر جاذبِ نظر نقوش لیے ہوئے۔ تصور پھیلتا جا رہا تھا۔ کلب کے سارے دوست باری باری نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔

ہنس مکھ اور خوش طبع توصیف۔

جسٹس فیاض کا اکلوتا بیٹا جواد جس کا جامہ زیبی میں جواب نہ تھا۔

ڈاکٹر توقیر جواس کو بے حد پسند کرتا تھا اور اس کے برملا اظہار سے بھی نہ چوکتا تھا۔

لیکن یہ سب کچھ اس وقت تک تھا۔ جب تک اس نے اشرف کو دیکھا تھا۔ اشرف کی نہیں باوقار شخصیت سب پر حاوی تھی۔ ماں باپ کے جذبات بھی اس پر واضح ہو چکے تھے۔

خلوص و محبت کا اظہار بلا وجہ نہیں تھا۔ بلکہ اس کے پس منظر میں گہرا مقصد کام کر رہا تھا۔

وہ دل سے اپنی ماں کی شکرگزار تھی جس نے اتنا بہترین ساتھی اس کے لیے چنا تھا۔

رات کے نو بجے جب اشرف اپنے کمرے میں داخل ہوا تو فرخ کی تیز آواز نے اس کا استقبال کیا۔

''میں تو تمہاری جان کو بھی رو چکا تھا اور تم بخریت واپس آ رہے ہو۔''

''چلو اچھا ہوا سستے ہی چھوٹ گئے ہو۔ کفن دفن پر تو خاصی لاگت آ جاتی ہے۔''

اشرف نے قہقہہ لگایا۔

''بندہ خدا کچھ تو سوچو کس وقت کے گئے ہوئے ہو اور اب کیا وقت ہونے کو آیا ہے؟''

''یہ تم نے امامت کے فرائض کب سے سنبھال لیے ہیں، فرخ پیارے'' ترچھی نظروں سے اشرف نے اس کی طرف دیکھا۔

''جب سے تم نے بہکنا شروع کیا ہے۔'' فرخ جواباً مسکرایا۔

اور جب اشرف نے اسے وجہ بتائی تو فرخ چلایا۔

''ہاں ہاں آج توقیر کے ہاں دیر ہو گئی ہے تو کل تمہاری ان چہیتی بیگم صاحبہ کے ہاں دیر ہو جائے گی۔''

''اپنے حواسوں میں ہو نا؟'' اشرف نے اسے گھورا۔

''بالکل''۔ فرخ کا انداز تمسخرانہ تھا۔''

''دورہ پھر پڑ رہا ہے۔''

''ابھی تو لوگ تمہیں فطین کہتے ہیں اور اس پر تمہاری یا دداشت کا یہ حال ہے کہ ہزار جان سے قربان ہو جانے والی بیگم صاحبہ کو بھول رہے ہو۔ بڑے ہی بے مروت ہو۔

''اچھا تو تمہارا مطلب بیگم فضل سے ہے۔ بڑے فضول ہو۔'' اشرف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بیگم فضل کے نام پر دانت کیوں نکل آئے ہیں؟''

''چاہنے والوں کے ذکر پر خوش ہونا چاہیے؟'' اس نے قصداً چوٹ کی۔

''یہ لو کارڈ اور خط'' فرخ نے اسے دونوں چیزیں تھماتے ہوئے لطیف سی چوٹ کی۔

''یقیناً کل کی تقریب کے مہمان خصوصی تم ہی ہو گئے''۔

''بلاشبہ۔''

''میں تو یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر تمہارے پاس ہے کیا جادو؟ جس سے تم یوں لوگوں کے دل مسخر کر لیتے ہو۔ کہیں کرشنا کماری تمہاری شرافت اور لیاقت کے گن گاتی ہے کہیں ثریا تم پر فدا ہو رہی ہے اور کہیں یہ بیگم فضل محبت بھرے دعوت نامے بھیج رہی ہیں۔'' فرخ نے بغیر سانس لیے انگلیوں پر نام گنواتے ہوئے کہا۔

''تم حسد سے کیوں مرے جا رہے ہو؟'' اشرف کا قہقہہ فضا میں گونجا۔

''مروں نہ تو اور کیا کروں۔ تم سے کس چیز میں کم ہوں۔ اتنی اچھی صورت پائی ہے۔ دل پر پتھر رکھ کر لوگوں سے خوش اخلاقی سے بھی بولتا ہوں اور نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔''

کمرہ دونوں کے قہقہوں سے گونج اٹھا۔

''کیا ارادہ ہے اب تمہارا؟'' فرخ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''اخلاقی لحاظ سے شرکت نہ کرنی ایک معیوب بات ہو گی۔ ویسے امیر لوگوں سے زیادہ میل ملاپ مجھے پسند نہیں۔''

''ایک بات ضرور ہے وہ لوگ تم میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں اور اتنی گہری دلچسپی

بلا وجہ نہیں ہو سکتی۔''

سنو فرخ مجھ سے صاف صاف بات کرو۔ یہ گھٹی گھٹی باتیں اور مبہم مبہم اشارے مجھے ناپسند ہیں۔'' اشرف نے چیں بچیں ہوتے ہوئے کہا۔

'' بھئی شاید داماد بنانا چاہتے ہوں تمہیں۔'' فرخ یکدم پھٹ پڑا۔ عقل گھاس چرنے گئی ہے شاید۔ سبحان اللہ یعنی میں یوسفِ ثانی ہی تو ان کی صاحبزادی کیلئے رہ گیا ہوں۔ کمال ہے مجھ جیسا ہیرا نہیں کہیں مل سکتا ہے بھلا۔''

تم یوسفِ ثانی بھی ہو اور ایک انمول ہیرا بھی۔ دنیا بڑی شاطر ہے پیارے۔ فرخ نے جواب دیا۔

تم اس بات کو کیوں نہیں سمجھتے کہ بعض لوگ فطرتاً بڑے ملنسار ہوتے ہیں۔'' اشرف کا لہجہ خاصا پُرسکون تھا۔

'' ممکن ہے میں غلطی پر ہوں۔ اگر واقعی ایسی بات ہے تو پھر ان سے رابطہ رکھنے میں تمہارا فائدہ ہے۔ تمہارا لاہور میں پریکٹس کرنے کا ارادہ ہے۔ ان لوگوں کا اثر ورسوخ تمہارے کام آ سکتا ہے۔''

'' خیر یہ تو مستقبل کی باتیں ہیں۔ تم بھی میرے ساتھ چلو نا۔ حقیقت تم پر خود ہی عیاں ہو جائے گی۔''

'' تمہیں تو اتنے ارمانوں اور چاؤ سے بلایا جا رہا ہے اور میں کیا ناخواندہ مہمان بن کر چلا جاؤں۔'' فرخ نے آنکھیں نچائیں۔

'' ناخواندہ مہمان کا کیا مطلب؟ تم میرے ساتھ جاؤ گے''۔

'' نہ بابا نہ چاہا لنڈ ورا ہی بھلا۔ کباب میں ہڈی بننا مجھے پسند نہیں۔''

باب نمبر: 8

گہرے رنگ کے سوٹ میں ملبوس وہ ہمیشہ سے کہیں زیادہ وجیہہ دکھائی دے رہا تھا۔
فرخ نے اچٹتی ہوئی نظر اس پر ڈالی اور ہنستے ہوئے بولا۔
''کہو آج کس کس کو قتل کرنے کا ارادہ ہے؟ بیگم فضل کی صاحبزادی تو سانس لیے بغیر اس پار پہنچ جائے گی اور تقریب میں مدعو دیگر صنفِ نازک کو بھی اپنے دلوں پر ہاتھ رکھنا پڑے گا۔''
''اپنی کہو ڈوب رہے ہو انجکشن دوں''۔ اشرف نے نیم وا آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا''میری فکر مت کرو۔ کب کا ڈوب چکا ہوں۔ ہاں انجکشن ان لوگوں کے لیے ضرور لے جانا۔ جو تھوڑی دیر بعد ڈوبنے والے ہیں بتاتے ہوئے کہا۔ اس نے کمال اداکاری سے آنکھیں بند کرتے ہوئے لہجے کو خوابناک بناتے ہوئے کہا۔
''آشی یہاں ہوسٹل میں سرمہ دانی نہیں ہوگی کسی کے پاس؟''اس نے پوری آنکھیں کھولتے ہوئے اشرف کو یوں دیکھا جیسے کوئی اہم بات یاد آ گئی ہو۔
''کیوں تمہیں اس کی کیا ضرورت محسوس ہوئی؟''اشرف نے پوچھا۔
''تمہاری پیشانی پر نظر کی بندیا لگا دوں نا۔ خدانخواستہ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میں جیتے جی مر جاؤں گا۔''
''بدتمیز باز نہیں آؤ گے''اشرف اسے مارنے کے لیے دوڑا۔

تبھی دروازے پر آہٹ ہوئی۔اشرف نے پردہ ہٹا کر دیکھا۔تو فضل احمد کے نوکر کو سامنے کھڑا پایا۔

'ذرا سنبھل کر جانا اور خیریت سے واپس آنا۔''انسے فرخ کی ہنستی ہوئی آواز سنائی دی۔کار ایک شاندار کوٹھی میں داخل ہوئی۔چوہدری فضل احمد کا خوبصورت محل نما گھر اس کے سامنے تھا۔کار برآمدے کے سامنے جا کر رک گئی۔فضل احمد اپنے چند دوستوں کے ساتھ بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔فوراً اٹھے۔ملازم نے ادب سے کار کا دروازہ کھولا اور اشرف باہر نکل آیا۔

''ٹھیک ہو اشرف بیٹے کہو بمبئی کا سفر کیسا رہا؟''انہوں نے کمال شفقت سے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''شکریہ!نوازش،خیرت سے ہوں۔''

فضل احمد اسے ہاتھ سے پکڑ کر مہمانوں کے پاس لے آئے۔باری باری ہر ایک سے تعارف کرایا اور اشرف کو مہمانوں سے متعارف کرواتے ہوئے انہوں نے کہا۔

''یہ میرے عزیز اشرف شہاب ہیں۔میڈیکل کے فائنل ایئر میں پڑھتے ہیں،ذہین طالب علم اور بہترین مقرر ہیں۔''

دماغ کے کسی گوشے سے شک وشبہ کی ایک لہر سی ابھری۔قریبی عزیز بتانے کی کیا ضرورت تھی۔حقیقت بھی تو کہی جا سکتی تھی۔فرخ کی کئی باتیں دماغ میں گھومنے لگیں۔لیکن وقت کے پیش نظر اس نے فوراً سوچوں کے دروازے بند کر دیئے۔

نوکر گرم گرم سوپ کے پیالے مہمانوں کو پیش کر رہا تھا۔سوپ کا دور ختم ہوا تو فضل احمد نے نوکر سے اشرف کو بیگم فضل کے پاس لے جانے کو کہا۔نوکر کوٹھی کے مختلف حصوں میں سے گزرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور وہ اس کے پیچھے پیچھے متانت ووقار سے قدم اٹھاتا کوٹھی کے در و دیوار سے ٹپکتی امارت کا بغور جائزہ لیتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔آخری برآمدے سے پائیں باغ نظر آ رہا تھا۔خوبصورت ورنگین آنچل لہراتے دکھائی دے رہے تھے،بیگم فضل کسی کام سے اسی

طرف آ رہی تھیں ۔اشرف پرنظر پڑتے ہی چال میں تیزی آ گئی۔قریب آئیں تو اشرف نے جھک کر آداب کہا، لہجے میں محبت و پیار کی شیرینی گھولتے ہوئے انہوں نے خیریت دریافت کی اور ساتھ لے کر بائیں باغ کی طرف چل دیں ۔

فریدہ کی بے چین اور متجسس نگاہیں کتنی دیر سے اس کی راہ تک رہی تھیں ۔جونہی اسے ماں کے ساتھ آتے دیکھا۔خوشی کے بے پناہ احساس سے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں ۔ بے اختیار ان کی طرف بھاگی ۔سیاہ حسین آنکھوں میں چھلکتا ہوا خوشی کا بے پایاں احساس اور اس کا انداز وارفتگی اشرف کو چونکا دینے کے لیے کافی تھا۔وہ کچھ حیران سا ہو رہا تھا۔فریدہ بہترین لباس میں ملبوس شوخ آنکھوں سے اُسے دیکھ رہی تھی ۔

بیٹی کے چہرے پر مسرت رقصاں دیکھ کر بیگم فضل اشرف سے مخاطب ہوئیں ۔

''ہم نہیں سمجھ سکتے تم نے ہم سب پر کیا جادو کر دیا ہے،فریدہ کو ہی دیکھو کس بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہی تھی ۔

''میرا انتظار''اُس نے حیرانی سے سوچا۔

اور اسی سمے ایک معصوم سی ہستی کا انتظار اسے یاد آ گیا۔

فرخ کے خدشات کسی حد تک درست نظر آ رہے تھے۔اس کے ذہن میں کھلبلی مچ گئی اور وہ کچھ پریشان سا ہو گیا۔بیگم فضل گہری نظروں سے اس کی بدلتی ہوئی حالت کا جائزہ لے رہی تھیں،شاید سمجھ گئیں،بات کا رخ موڑتے ہوئے بولیں''کیا بات ہے بیٹے نیا ماحول دیکھ کر کچھ گھبرا گئے ہو؟''

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ۔''اس نے خود پر جلدی سے قابو پاتے ہوئے کہا۔

چند خواتین اور نوعمر لڑکے ان کے قریب آ گئے ۔بیگم فضل نے مہمانوں سے اس کا تعارف کرایا۔چہرے پر سنجیدہ سی مسکراہٹ لیے وہ بڑے وقار سے مہمانوں سے مل رہا تھا۔

فریدہ اپنی سہیلیوں کے نرغے میں واپس لوٹ گئی تھی ۔شوخ و شنگ اور تیز وطرار

لڑکیوں نے اس کی جگمگاتی آنکھوں اوروالہانہ پن سے بہت کچھ سمجھ لیا تھا۔واپس آتے ہی اسے آڑے ہاتھوں لیا گیا۔یاسمین نے چٹکی بھرتے ہوئے کہا۔

''دردکا یہ نیا روگ کب سے پالا ہے تم نے''۔

کیا مطلب ہے تمہارا؟فریدہ نے تیوری چڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''سمجھ جاؤنا''۔یاسمین نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے طنز سے کہا۔

''ان فضول باتوں کو سمجھنے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں''۔فریدہ نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔''

ہوں تو یہ انداز ہیں۔میری طرف ذرا رُخ روشن ہوجائے نا پھر''یاسمین نے اس کا چہرہ اپنی طرف موڑلیا اورتیز نظروں سے گھورتی ہوئی بولی۔

''یہ دھوکا،یہ فریب فریدہ۔آنکھوں ہماری آنکھوں میں دھول جھوک رہی ہو؟''

''یاسمین سیدھی طرح کیوں نہیں پوچھتیں،یہ حضرت کون ہیں؟''نوشابہ سخت جھلائے ہوئے لہجے میں یاسمین سے مخاطب ہوئی۔بتاؤنا فریدہ کون صاحب ہیں یہ؟جنہیں دیکھ کرتم اپنی سُدھ بُدھ ہی کھوبیٹھی ہو۔یاسمین نے تحکمانہ انداز میں پوچھا۔

ہمارے قریبی عزیز ہیں۔فریدہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہ قریبی عزیز آج کہاں سے ٹپک پڑے اس سے قبل تو انہیں کبھی نہیں دیکھا گیا تھا'' یہ تنویر کی آوازتھی۔

''بھئی پہلے تو ہمیں بھی علم نہ تھا۔پچھلے دنوں میرے ہسپتال میں قیام کے دوران انکشاف ہوا کہ ہماری قرابت داری ہے۔ویسے بہت لائق اوربہترین مقرر ہیں۔''فریدہ نے وضاحت کرتے ہوئے فخر سے کہا۔

''بہرحال تمہارے یہ کزن ہیں بہت شاندار''نفیسہ نے تعریفی نظروں سے اشرف کو دیکھا۔

''کیوں کیا رال ٹپک پڑی ہے تمہاری بھی''نوشابہ نے قہقہہ لگایا۔

''اپنی خیر مناؤ۔تمہاری نظریں بھی بہت سیر دیر سے ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں......''

نفیسہ نے اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''خود جھگڑنے بیٹھ گئی ہو' پہلے اس سے تو پوچھ لو کہ معاملہ کہاں تک پہنچا ہے؟ کچھ وعدے وعید بھی ہوئے ہیں''؟......کوثر نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔

''خاطر جمع رکھو معاملات طے ہو رہے ہیں' فریدہ نے جواباً تیزی سے کہا۔

یاسمین!ان کی بے چین نگاہیں تو دیدار کے لیے کتنی ہی دیر سے اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ہم ہی بیوقوف تھے۔جو سمجھے نہیں''۔

''تم نے تو حد کر دی ہے۔نوشابہ''۔

''میں نے حد کر دی ہے یا تم نے چپکے چپکے دل کے رشتے بھی طے کر لیے''۔

اس کی اس بات پر سب نے دل کھول کر قہقہہ لگایا۔

بیگم فضل اشرف کو ان کے پاس لے آئیں۔تعارف کے رسمی مراحل طے ہوئے تو اُسے وہیں چھوڑ کر خود چلی گئیں۔

اسے تو ایک لمحے کے لیے وہاں بیٹھنا گوارا نہ تھا۔لیکن مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اسے بیٹھنا پڑا۔جان پہچان والا بھی کوئی نہ تھا۔لڑکیاں بیگم فضل کی وجہ سے خاموش تھیں۔جونہی میدان صاف پایا،شرارتوں پر اتر آئیں۔

''سنا ہے آپ بہت قابل ہیں۔کیا واقعی ایسا ہے؟''

نوشابہ کا انداز اتنا مزاحیہ تھا کہ سب کا قہقہہ فضا میں گونج اٹھا۔

امیر گھروں کی اِن فیشن ایبل اور بے باک لڑکیوں کے قہقہوں نے اس کی طبیعت کو سخت مکدر کر دیا۔کچھ موزوں جواب بھی دینے نہ پایا تھا کہ ایک اور بھرپور حملہ ہوا''آپ کے مداح تو آپ کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں......اور آپ کو بہترین مقرر کہتے

ہیں۔لیکن ہمیں تو آپ گونگے نظر آتے ہیں۔''

ندامت کا تیز احساس رگ وپے میں بجلی کی طرح سرایت کر گیا۔اس نے تو زندگی میں کسی کے آگے جھکنا نہ سیکھا تھا اور آج یہ چند بیباک لڑکیاں اسے اپنے مذاق کا نشانہ بنا رہی تھیں۔ احساسِ خودداری نے اس کے تن بدن میں آگ سی لگا دی۔جواب دینے ہی والا تھا۔کہ کسی کا تیز جملہ ذہن پر انگارے رکھ گیا۔

''کیسے بولیں فریدہ کے حُسن کا پرتو زبان گنگ کیے ہوئے ہے۔''

اس کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔مگر دوسرے لمحے بڑے پُر وقار انداز میں اس نے ایسا طنز بھرا جواب دیا کہ سب کو لاجواب کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔مزید ایک لمحہ بھی وہ وہاں ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔حالات اس پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکے تھے اور اب مزید شک وشبہ کی گنجائش نہ تھی۔بیگم فضل سے معذرت کرتے ہوئے اس نے جانے کے لیے اجازت چاہی۔انہوں نے چائے کے لیے کہا تو اس نے جھوٹ موٹ کی مصروفیات بتا کر معذرت کر لی۔آخر اگلی اتوار کو دوپہر کے کھانے پر آنے کے وعدے پر گلوخلاصی ہوئی۔

ڈرائیور گاڑی سٹارٹ کرنے ہی والا تھا کہ بھاگ کر آتی ہوئی فریدہ کو دیکھ کر رُک گیا۔ کھڑکی کے قریب آ کر وہ تیز تیز سانس لیتے ہوئے بولی۔

''آپ اتنی جلدی جا رہے ہیں؟ابھی تو موسیقی کا پروگرام باقی ہے۔''

اسے سکتہ سا ہو گیا۔ونڈ اسکرین پر دیکھتے ہوئے نہایت دھیمے لہجے میں بولا۔

''آج ایسٹ سرجیکل وارڈ میں میری ڈیوٹی ہے۔معذرت خواہ ہوں۔موسیقی سے محظوظ ہونے کے لیے میرے پاس وقت نہیں''۔

''آپ پھر کب آئیں گے؟''اتوار کو فارغ ہیں نا؟''فریدہ کے لہجے میں افسردگی چھلک آئی تھی،آنکھوں میں مایوسی کی لہریں موجزن تھیں۔

”کہہ نہیں سکتا۔“ لہجہ برف کی طرح سرد تھا۔

”چلو“ اس نے ڈرائیور سے کہا اور کار چل دی۔

باب نمبر: 9

گہری سوچ و بچار کے بعد وہ فرخ کو کچھ نہ بتانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔اس سے مقصود کسی چیز کو اس سے پوشیدہ رکھنا نہ تھا۔بلکہ وہ اس کی شوخ اور نٹ کھٹ طبیعت سے ڈرتا تھا۔ورنہ اس کی زندگی تو فرخ کے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح تھی۔سیدھی سادی سی جس میں کوئی راز کوئی بل اور کسی قسم کا کوئی چکر نہ تھا۔لباس تبدیل کرنے کے بعد وہ رات کی ڈیوٹی کے لیے چلا گیا۔صبح فرخ سے ملاقات ہوئی۔

اور اشرف پر نگاہ پڑتے ہی اس کے ہونٹ پھیل گئے۔نگاہیں مسکرا اٹھیں۔

''ہوں''

اُس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے شوخی سے اشرف کو گھورا۔

اِس ''ہوں'' میں کیا کچھ نہ تھا۔مسکراہٹ خود بخود اشرف کے لبوں پر بکھر گئی لیکن وہ خاموش رہا۔

''کہو! کچھ سناؤ۔چپ کیوں ہو؟''

کیا پوچھنا چاہتے ہو؟اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وہی جسے تم بتانے سے گریزاں ہو''۔جواب دیا گیا۔

''میں اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہوں آخر تمہیں کس بات کا شک ہے؟''

''چور کی داڑھی میں تنکا والی ضرب المثل ٹھیک تمہارے جیسے لوگوں کے لیے ہی ہے میری کس بات سے تمہیں شک محسوس ہوا ہے؟''فرخ نے شوخی سے پوچھا۔

''خوب یعنی چوری بھی اور سینہ زوری بھی۔تمہاری آنکھیں سراپا شک ہیں اور زبان کا کام بڑی خوش اسلوبی سے نبھا رہی ہیں۔ویسے خیر زبان بھی کسی سے کم نہیں''۔

''اب ڈھٹائی کا کیا علاج؟ میں تو اُن کی صاحبزدی کے غسلِ صحت کی خوشی میں منائے جانے والے جشن کی تفصیل پوچھنا چاہتا ہوں۔کیا دیکھا؟ کیا کچھ کھایا۔مسز فضل اور مسٹر فضل کتنی بار واری صدقے ہوئے؟ اوران کی صاحبزادی سے کیا راز و نیاز ہوئے؟''

''راز و نیاز تو بہت ہوئے لیکن افسوس کہ وہ تمہیں بتانے کے قابل نہیں۔''اشرف نے ذو معنی بات کرتے ہوئے جملہ ختم کر دیا۔

''مجھ سے چھپاؤ گے تو بڑا دکھ پاؤ گے۔کل ہی تمہارے گھر والوں کو خط لکھ دیتا ہوں کہ آ کر صاحبزادے کو لے جائیں ورنہ وہ عشق کے تپتے ہوئے ریگزاروں میں قدم رکھ بیٹھے گا۔''

''ایسی باتوں میں تو دماغ بھی چھلانگیں لگاتا ہے۔پڑھتے سے کیا زنگ لگ جاتا ہے۔''

''عزیز از جان اشرف شہاب کو پارسل کر دیتا ہوں''۔

بے اختیار اشرف ہنس پڑا۔

پیارے پروگرام کی کچھ تفصیل سننے میں نہیں آئے گی۔

''فضول ڈاکٹر بن رہے ہو کہیں وکیل بن جاتے تو تمہارے دماغ کی یہ فالتو رگ شاید تمہیں فائدہ ہی پہنچاتی۔مریضوں کے تو دماغ ہی چاٹ جایا کرو گے۔علاج ان کا کیا خاک کرنا ہے۔

''چوبیس گھنٹے تمہارے ساتھ رہتا ہوں۔تمہارا دماغ تو مجھ سے چاٹا نہ گیا''۔''بکواس بند کرو۔اٹھو ناشتے کے لیے چلیں۔''اشرف نے اس کا بازو پکڑ کر اٹھایا۔''

دنوں کو گزرتے کون سی دیر لگتی ہے۔اتوار بھی آن پہنچا۔بیگم فضل صبح کے ناشتے کے بعد

خانساماں کو کھانے کی لمبی چوڑی فہرست دیتے ہوئے بولیں۔

''دیکھو کھانا بہترین پکنا چاہیے۔ ہمارے خاص مہمان آنے والے ہیں''۔

''کون آرہا ہے ممی؟ فریدہ نے حیرانی سے پوچھا۔

''اشرف آئیں گے'' بیگم فضل نے منگنگ سنبھالتے ہوئے کہا۔

''آپ یونہی اہتمام کر رہی ہیں۔''

فریدہ نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیوں'' وہ مجھ سے اس اتوار کا وعدہ کر گیا تھا۔

''وڈ اسکرین پر نظریں جمائے ایک خوبصورت چہرہ فریدہ کے تصور میں ابھرا۔ سرد لب ولہجے میں ادا کئے گئے الفاظ اس کے ذہن میں آ کر ہلچل مچا گئے۔

خوشی کے جس بے پایاں تصور سے وہ اس دن اس کی طرف بھاگی تھی۔ اس کی بے اعتنائی اور تلخ رویے نے اسے وہیں ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ مارے دُکھ کے اس کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ لیکن اس نے پلٹ کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ کتنی ہی دیر تک سردی میں تن تنہا وہاں کھڑی رہی اور پھر واپس چل آئی۔

جگمگاتی روشنیوں اور کھنکھتے قہقہوں نے اس کی اداسی اور بھی بڑھا دی تھی۔

وہ بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اُن تنہائیوں میں جہاں میں بھرے درد کو آنکھوں کی راہ سے نکال سکے۔ لیکن مہمانوں کی موجودگی میں ایسا ممکن نہ تھا۔ موسیقی کا پروگرام شروع ہو گیا تھا۔ فضا میں نغموں کا سحر رچ گیا۔ طربیہ اور المیہ نغمے اُبل رہے تھے۔ ہر المیہ نغمہ اُسے جھنجھوڑ ڈالتا۔ دل میں ایک کہرام مچا دیتا۔

اور پھر کتنے ہی شب و روز گہری اُداسیوں میں ڈوبے رہے۔

اور آج ماں کے اتنے یقینی انداز نے اس کے دل میں امید کی ایک ہلکی سی کرن جھلما دی تھی۔ اُمید و نا اُمیدی کے ملے جُلے جذبات لیے وہ ادھر اُدھر پھرتی رہی۔ آنکھوں میں انتظار کی

شمعیں جلائے وہ آنے والے کی راہ تکتی رہی۔

کار گیٹ میں داخل ہوئی۔ دل دھڑک اٹھا۔لیکن اُمید کی وہ ننھی سی کرن جو اس کے دل میں جگمگائی تھی مایوسی کے عمیق اندھیروں میں ڈوب گئی۔

ڈرائیور اکیلا تھا۔

"ضروری نہیں کہ انسان زندگی میں جس چیز کی تمنا کرے وہ اسے مل ہی جائے" اس نے کرب سے سوچا۔

لیکن اشرف اِن جذبات واحساست سے بے نیاز اپنی مصروفیتوں میں الجھا ہوا تھا۔ آپریشن تھیٹر میں انسانی جسموں کی چیر پھاڑ اور اِن ڈور آؤٹ ڈور کے مریضوں کی دیکھ بھال میں اس نے ایک لمحے کے لیے بھی کسی کے متعلق کچھ سوچنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ویسے بھی وہ اس قصے کو اسی دن ختم کر چکا تھا۔یاد رکھنے کا سوال ہی نہ تھا۔

اتوار کی وہ صبح بڑی ہی ابر آلود تھی۔سیاہ بادلوں نے آسمان کو پورے طور پر ڈھانپا ہوا تھا۔جنوری کی یخ اور برفیلی ہوائیں چل رہی تھیں۔ہوا کے تھپیڑے سائیں سائیں کرتے دروازوں اور کھڑکیوں سے ٹکرا رہے تھے۔اشرف بستر سے نکلا تو سرد ہوا سے کپکپا سا گیا۔فرخ پچھلے دو دن سے گھر گیا ہوا تھا۔کمرہ اداس اداس سا محسوس ہوا۔یوں جیسے قہقہوں کا متمنی ہو۔

دروازے پر دستک ہوئی۔کھولا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ باد و باراں کے اس زبردست طوفان میں فضل احمد اس کے سامنے کھڑے تھے۔انہوں نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

"کیا بات ہے بیٹے؟ مجھے دیکھ کر حیران کیوں ہو گئے ہو؟"

فضل احمد کو اس کے چہرے پر گہرے کرب کے آثار محسوس ہوئے تھے۔تیز سا احساس ہوا۔اور وہ فوراً سنبھل گیا۔

افسردہ سی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے وہ انہیں اندر لے آیا اور معذرت کرتے

ہوئے بولا۔"دراصل مجھے آپ کو اتنے خراب موسم میں یہاں دیکھ کر حیرانی ہوئی تھی۔گھر میں خیریت ہے نا۔"

"بھئی تمہاری آنٹی پچھلے اتوار کھانے پر تمہارا انتظار کرتی رہیں۔میں تو کل ہفتے بھر بعد گھر لوٹا ہوں۔وہ تم سے بڑی ناراض تھیں اور آج ان کی ضد پر میں تمہیں لینے کے لیے آیا ہوں"۔

ٹھہری اور محبت بھری آواز پر اُسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔یوں لگا جیسے کسی نے وزنی پتھر اس کے سر پر کھینچ مارا ہو۔تفکر چہرے پر اُبھر آیا۔

ایک بار تو شدت سے اس کا دل چاہا وہ چیخ چیخ کر ان سے کہہ دے کہ براہِ کرم آپ تشریف لے جائیں۔محبت و پیار کی ان سنہری ڈوریوں کا حصار میرے گرد قائم نہ کریں۔اس جال میں مجھے نہ لپیٹیں۔جسے اغراض کے دھاگوں سے بُنا گیا ہے۔میں تو چند سادہ لوح دیہاتیوں کی تمناؤں کا مرکز ہوں۔میں اگر ان سے بچھڑ گیا۔تو وہ جیتے جی ختم ہو جائیں گے۔مر جائیں گے۔

لیکن چاہتے ہوئے بھی جانتے ہوئے بھی وہ کچھ نہ کہہ سکا۔گھٹ کر ہی رہ گیا کمزوری ہی غالب آ گئی۔اتنے بڑے انسان کا لحاظ راہ میں حائل ہو گیا۔

معذرت کی لیکن فضل احمد کوئی بچے تو نہ تھے۔جو اس کے چہرے پر پھیلی کشمکش کی لکیریں نہ پڑھ سکتے۔جان گئے۔ساتھ لے جانے پر مُصر تھے۔

اس کا ذہن پھڑ پھڑانے لگا تھا۔اپنی اس کمزوری پر بُری طرح غصہ آ رہا تھا۔اُف میں نے کتنی سنگین غلطی کی ہے کہ فرخ کو نہ بتایا۔" ٹھوڑی کو ہتھیلی پر جمائے وہ عجیب سی سوچ میں غرق تھا۔

ایک ایسی سوچ میں جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

"فرخ! سب کچھ ان سے کہہ دو۔مصیبت کا یہ طوق گلے سے اتر جائے گا"۔اس کے دماغ نے تجویز پیش کی۔

دماغ کی اس تجویز کو اس کے دل نے بھی پسند کیا۔اور وہ خاصا مطمئن سا ہو گیا۔

باب نمبر: 10

میز انواع واقسام کے کھانوں سے چنی ہوئی تھی۔اشرف کے بائیں جانب فریدہ اور سامنے بیگم فضل تھیں۔مسز فضل آفس جا چکے تھے۔

باوجودیکہ کہ وہ صبح سے بھوکا تھا اور کھانے بھی انتہائی لذیذ تھے۔پھر وہ بھی کچھ زیادہ رغبت سے نہیں کھا رہا تھا۔سوچوں کے تانے بانے اس کے وجود کو کستے جا رہے تھے۔انجانے سے خوف کی پرچھائیاں ذہن کی سطح پر رقص کر رہی تھیں۔

کھانے کے بعد سب لوگ ڈرائینگ روم میں آ گئے۔وہ عجیب سی گھمسن گھیری میں اُلجھا ہوا تھا۔ہلکے ہلکے اُبال اٹھ رہے تھے۔اخلاق اس کے پاؤں کی زنجیر بنا ہوا تھا۔سمجھ نہیں آتی تھی کہ کس تیز دھار آلے سے وہ اس زنجیر کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔

باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی ہونے لگی تھی جس سے فضا میں خنکی کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی لیکن ڈرائنگ روم میں موسم کی شدت کا ذرا بھی اثر نہ تھا۔

تھوڑی سی دیر بعد ہلکی پھلکی باتوں کے ساتھ کافی کا دور چلنے لگا۔اشرف نے بے چینی سے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ڈھائی بج رہے تھے۔وہ کھڑا ہو گیا۔

''کیوں بیٹے؟ کیا بات ہے؟''

بیگم فضل نے کافی کا گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔''اب اجازت دیجئے خاصا وقت ہو گیا

ہے۔''

کمال ہے بیٹے! باہر موسم نہیں دیکھتے۔کتنی ٹھنڈک ہوگئی ہے اور اپنے انکل سے کیا ملے بغیر جاؤ گے۔میرا خیال ہے بور ہو رہے ہو۔'فریدہ بیٹے! اشرف کو اپنے کمرے میں لے جاؤ اور اپنی نئی پینٹ کی ہوئی تصویریں دکھاؤ۔'انہوں نے بیٹی کو آنکھ کا اشارہ کیا۔

فریدہ اشرف کے طرزِ عمل سے چوٹ کھائے ہوئے تھی۔آج بھی اشرف نے اسے نظر انداز کیے رکھا۔حقیقتاً وہ دل برداشتہ ہو چکی تھی۔ماں کے کہنے پر اس نے نگاہیں اٹھائیں اور دیکھا کہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ایک عجیب شان بے نیازی سے وہ دریچے سے باہر فضا کو گھور رہا تھا۔پیشانی پر تفکر کی لکیریں ابھری ہوئی تھیں۔

ہمدردی کا ایک لاوہ سا فریدہ کے دل میں اس کے لیے پھوٹ پڑا۔وہ آگے بڑھی اور اشرف کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''آیئے''

وہ چونک ہی تو پڑا۔نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔چہرے پر سنجیدگی اور آنکھوں میں نمی لیے وہ افسردگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔دل چاہا دامن چھڑا کر بھاگ جائے۔لیکن پاؤں جیسے من من کے ہو گئے اور زبان بھی ساتھ دینے سے منکر ہو گئی۔وہ خاموشی سے اس کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔باہر خنک ہواؤں نے ان کا استقبال کیا۔بادل گہرا سیاہ لبادہ اوڑھے دیوانوں کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ہلکی ہلکی بارش۔ہوا کے جھونکوں سے جھومتی درختوں کی ڈالیاں اور ہیجان خیز موسم،جذبات کی دُنیا میں ہلچل مچا رہا تھا۔فریدہ کافی آگے بڑھ گئی تھی۔مڑ کر دیکھا تو اشرف کو بالکونی میں ریلنگ کے سہارے کھڑے پایا۔پلٹ آئی اور خاموشی سے اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ہوا کے کسی شوخ وشریر جھونکے نے فریدہ کے آنچل کا ایک سرا اشرف کے چہرے پر ڈال دیا۔تخلیات کی جس حسین وادی میں وہ کھویا ہوا تھا وہاں سے لوٹ آیا۔دوپٹہ اپنے چہرے سے ہٹاتے ہوئے اس نے ایک نظر پاس کھڑی فریدہ کو دیکھا۔وہ دو رفضا

میں گھور رہی تھی ۔ کٹے ہوئے سیاہ بادلوں کے درمیان اس کا چہرہ دلفریب نقش ونگار کے ساتھ چمک رہا تھا ۔اشرف کو عجیب سا احساس ہوا ۔

"چلیے"

اس نے کمرے میں قدم رکھا ۔

"یہ کیا"

قدم جہاں تھے وہیں رُک گئے ۔کیا وہ کسی طلسماتی محل میں داخل ہو گیا ہے؟ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا ۔واقعی وہ الف لیلوی ماحول ہی تو تھا جس نے اسے سحر زدہ سا کر دیا ۔وہ حیران گم سم کھڑا تھا ۔فریدہ اسے بازو سے پکڑ کر آتش دان کے پاس لے آئی اور وہ یوں اس کے ساتھ ساتھ چلا آیا جیسے اس پر جادو کر دیا گیا ہو ۔

"آپ گانا سنیں گے؟" فریدہ نے جذباتی آواز میں اس سے پوچھا ۔

وہ تو کمرے کے سحر میں ڈوبا ہوا تھا ۔پتہ بھی نہ چلا کہ کسی نے کیا پوچھا ہے؟

فریدہ کی پیار اور دکھ سے لبریز آنکھوں نے صوفے پر بیٹھے اشرف کو دیکھا اور پھر عزم کے ساتھ سر کو خفیف سا جھٹکا دے کر اونچا کرتے ہوئے وہ خود سے گویا ہوئی ۔

"آج میں پتھر کو پگھلا کر چھوڑوں گی ۔"

آنکھیں بند ہو گئیں ۔نازک نازک انگلیاں تاروں پر تھرکنے لگیں ۔رسیلے ہونٹوں سے دل کی آواز نغمے کی صورت میں ڈھلنے لگی ۔

ایک ایسے نغمے کی صورت میں جس میں خزاں کی شاموں جیسی اداسی گھلی ہوئی تھی ۔ روح کو گھائل کر دینے والے زخموں کا درد رچا ہوا تھا ۔

ہوا کے روش پر لہراتا ہوا یہ اداس، غمگین اور دل کو تڑپا دینے والا نغمہ اشرف کو بے قرار کر گیا ۔آواز کے زیر و بم کے ساتھ ساتھ اس کا دل ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا ۔یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک حسین سا خواب دیکھ رہا ہو ۔موسیقی کے سحر نے اس کے خفتہ جذبات کو بیدار کر دیا تھا ۔

پتھر واقعی پگھل رہا تھا۔

گیت ختم ہو چکا تھا۔لیکن گیت کی صدائے بازگشت ابھی تک اسے اپنے کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ کتنے ہی لمحے اسی طرح گزر گئے۔آخر فریدہ اپنی جگہ سے اٹھی اور صوفے کی پشت پر آکر کھڑی آ گئی۔اس کے سامنے وہ انسان تھا۔جسے اس نے دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا۔لیکن جو پتھر کی طرح بے حس تھا۔جذبات کی حدت سے اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ بے خودی ہوکر اس نے اپنے دونوں ہاتھ اشرف کے شانوں پر رکھ دیئے۔ہاتھوں کا لمس جسم میں تیز سنسناہٹ کا احساس پیدا کر گیا۔پلٹ کر دیکھا تو محبت کے اَن کہے پیغام اسے فریدہ کی آنکھوں میں جھانکتے نظر آئے۔

جذبات مچل اٹھے۔آنکھوں میں سُرخی چھلک آئی۔لیکن ذہن کو یکدم جھٹکا سا لگا۔وہ فوراً سنبھل گیا۔غالباً گہری کھائیاں نظر آ گئی تھیں۔فوراً اس نے دونوں ہاتھ شانوں سے علیحدہ کر دیئے اور اس کا یہ اقدام فریدہ کے جذبات کو مجروح کر گیا۔نسوانی وقار چکنا چُور ہو گیا۔وہ تڑپ کر کسی گھناؤنے عزم کے تحت آگے بڑھی۔آنکھوں میں خطرناک چمک تھی۔ایک ایسی خطرناک چمک جس میں نیکیاں ماند پڑ جاتی ہیں اور برائیوں کے مہیب اندھیرے غالب آ جاتے ہیں۔ تقدس اور پاکیزگی کی چادر کے پُرزے پُرزے اڑ جاتے ہیں۔

وہ آگے بڑھی اور اپنا سر اس کے شانوں سے ٹکا دیا۔ایک جوان جسم کا لمس اشرف کے ہوش وخرد کی دُنیا تباہ کر گیا۔آگ کے ان دہکتے شعلوں سے بچنے کی کوشش کی۔لیکن رومان پرور موسم،سحر زدہ کمرہ اور سپردگی کی مکمل دعوت لیے ایک حسین جسم،ضبط کے سارے بند ٹوٹ گئے۔صبر کا پیالہ ہاتھ سے چھوٹ گیا اور دیوتا کے بلند ترین مقام سے اتر کر وہ انسان بن گیا اور پھر دھیرے دھیرے انسان سے حیوان بنتا گیا۔

جذبات کا طوفان ختم ہو گیا تھا۔لیکن حقیقت کا چہرہ کتنا بھیانک تھا۔چند لمحوں تک وہ دیوانوں کی طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے صورت حال کا جائزہ لیتا رہا۔یوں جیسے ایک ڈراؤنا خواب

دیکھا ہو۔ یوں جیسے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ لیکن تلخ حقیقت سے فرار ممکن نہ تھا۔

قیامت ہی ٹوٹ پڑی تھی۔ ایک ہی سوال ہونٹوں پر مچل رہا تھا۔

''یہ سب کیا ہو گیا ہے؟ کیسے ہو گیا؟'' مجنونانہ انداز سے خود پر نگاہ ڈالی یوں لگا جیسے پاک صاف جسم پر بدی کی تلوار نے خراشیں ڈال دی ہوں۔ اور ان خراشوں سے گناہ کا خون رس رس کر باہر نکل رہا ہو۔ گہرے اضطراب سے دانتوں تلے نچلے ہونٹ کو اس سختی سے دبایا کہ خون نکلنے لگا۔ اس کی حالت فضاؤں میں اڑنے والے اس آزاد پرندے کی سی تھی جسے بے رحم صیاد نے پَر کاٹ کر پنجرے میں قید کر دیا ہو'۔

ذہن میں بگولے سے اڑ رہے تھے۔ بے بس سے ایک انسان کی طرح اس کا سر صوفے کی پٹی سے ٹکا ہوا تھا۔ دُور یخ ہواؤں میں کام کرتے چند محبوب انسان اس کے ذہن کی دنیا میں آئے۔ ایک جھٹکے سے وہ سیدھا ہو گیا۔ کانوں میں محبت و شفقت لیے ایک آواز اُبھری''۔

''ہم خدا سے دعا گو ہیں۔ اشرف کہ وہ تمہیں نیکی سے قریب اور بدی سے دور رکھے۔''

تیر کی طرح یہ آواز اس کے دل کو چیر گئی۔ جذبات کی دنیا پر یہ ایسا بھرپور حملہ تھا کہ دل میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دل پھٹ جائے گا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ کمرہ گھومتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ دم گھٹ رہا تھا اور گھبراہٹ لحہ بہ لحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھا اور تیز و تند ہواؤں سے بے نیاز پاگلوں کی طرح بھاگ کھڑا ہوا۔ سڑکیں خالی تھیں۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی وہ بُری طرح بھیگ رہا تھا۔ لیکن بارش کے وہ تیزی سے برستے ہوئے ننھے منے قطرے اس جلتی ہوئی آگ کو نہ بجھا سکے جو اس کے دل میں کسی الاؤ کی طرح دہک رہی تھی اور اس کے خرمن حیات کو جلائے جا رہی تھی۔

کتنی ہی دیر تک وہ بھاگتا رہا۔ راستے کا تعین کیے بغیر، بھاگتے بھاگتے اس کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں۔ آخر پتھر کی ایک ٹھوکر سے وہیں سڑک کے کنارے ڈھیر ہو گیا۔

ایک معزز شخص اپنی کار میں وہاں سے گزرا۔ جاذبِ نظر اور دلکش شخصیت کے مالک

ایک وجیہہ نوجوان کو اس طوفانی موسم میں سڑک کے کنارے یوں بے سُدھ پڑے پایا تو کار سے اترا۔ نبض دیکھی اور پھر بمشکل اٹھا کر کار کے اندر لٹایا جیبیں ٹٹولیں تو شناختی کارڈ برآمد ہوا۔ اور وہ اسے میڈیکل ہوسٹل لے آیا۔ ساتھی لڑکوں نے دیکھا تو چیخ اٹھے۔ فوراً لباس بدلوا کر اسے ہسپتال پہنچایا گیا۔ صبح ہونے تک وہ ڈبل نمونیے کا شکار ہو چکا تھا۔

صبح دس بجے کے قریب فریدہ نے ہوسٹل فون کیا اور یہ جان کر کہ وہ رات سے شدید بخار میں مبتلا ہے اُسے اپنے حواس گم ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ بھاگم بھاگ ماں کے پاس پہنچی بیگم فضل بھی گھبرا گئیں۔ فوراً فضل احمد کو آفس فون کیا گیا۔ اور تھوڑی دیر ہی بعد وہ تینوں ہسپتال میں تھے۔

چند دنوں بعد جب وہ خطرے سے باہر ہوا تو بیگم فضل اسے گھر لے آئیں۔ ایک تو بیماری دوسرے ضمیر کی چبھن وہ بالکل نڈھال بے چارگی کی تصویر بن چکا تھا۔

باب نمبر: 11

جُھٹ پٹے کے وقت ہاتھ میں پورٹ فولیو گھماتا ہوا فرخ تقریباً دس گیارہ دن بعد ہوسٹل کی عمارت میں داخل ہو رہا تھا۔اس تصور سے ہی کہ اشرف خوب گت بنائے گا۔مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیل رہی تھی۔راستے میں اچانک نعیم سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔چھوٹتے ہی اس نے اشرف کی بیماری کی ساری تفصیل اُسے بتا دی۔حادثے کی تفصیل سن کر اس کا دماغ چکرانے لگا۔ تھکی تھکی چال چلتا وہ حفیظ کے کمرے تک گیا۔چابی لی۔تالہ کھولا۔کمرے میں مٹی اور گرد کی حکومت تھی۔

اب اس کے سامنے فضل احمد کے گھر جانے کا مسئلہ تھا۔کسی سے پوچھنا اس نے مناسب نہ سمجھا۔فوراً اسے تقریب والے کارڈ کا خیال آیا۔تلاش کرنے پر جلد ہی مل گیا۔جیب میں ڈالا اور چل دیا۔

اور جب نوکر کے ساتھ وہ اشرف کے کمرے میں داخل ہوا تو اس کی آنکھیں فرطِ حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئی۔بے اختیار اس کا ہاتھ سینے پر چلا گیا۔

اشرف کا خوبصورت، باوقار اور بھرا بھرا چہرہ کسی مردے کی طرح تکیے پر پڑا تھا آنکھیں بند تھیں غالباً سو رہا تھا۔

''آشی یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟''اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

کمرے میں موجود نرس نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا لیکن وہ کیسے خاموش رہتا۔اس کا دل تو ڈوب رہا تھا۔جھک جھک کر وہ اسے بار بار دیکھ رہا تھا۔آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو اُمڈ آئے تھے۔

''میرے عزیز دوست کچھ تو بتاؤ؟''وہ دھیرے سے بڑبڑایا۔

''دیکھیئے مریض کی آنکھ کھل جائے گی۔یہ جذباتی ہیجان انہیں پریشان کر دے گا۔ضبط کیجئے نا۔''

وہ اٹھ کر باہر آ گیا۔آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

سامنے والے برآمدے سے اوورکوٹ پہنے اٹھارہ انیس سالہ ایک خوبصورت سی لڑکی کو اس نے اپنی طرف آتے دیکھا۔قیاس سے اس نے اندازہ لگایا کہ یہ شاید ان کی صاحبزادی ہے۔ہلکی ہلکی چال چلتے کسی خیال میں مگن وہ اس کے بالکل قریب پہنچ گئی۔پھر اپنے سامنے ایک اجنبی کو پا کر چونک اٹھی۔بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔''آپ؟''

''میں اشرف کا دوست فرخ ہوں''اس نے گہری نظر اس کے سراپا پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''یہاں کھڑے ہیں۔کمرے میں نہیں گئے؟''اس نے مدہم آواز میں کہا۔فرخ کوئی جواب نہ دے سکا۔آہ بھر کر رہ گیا۔

تھوڑی دیر وہ خاموش کھڑی رہی اور پھر کمرے میں چلی گئی۔فرخ نے شیشے میں سے اسے اشرف پر ہلکا سا جھکتے ، سیدھا کھڑے ہوتے ، نرس سے کچھ پوچھتے اور پھر باہر نکلتے دیکھا۔

وہ کمرے میں دوبارہ داخل ہوا۔ابھی بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ اشرف نے آنکھیں کھولیں۔

''اُف!اس کی آنکھوں میں جھانکتی بے بسی کی عجیب سی کیفیت فرخ کو تڑپا گئی تیر کی سی تیزی سے وہ اس کے قریب پہنچ گیا۔

”فرخ!“ درد میں ڈوبی ہوئی آواز اشرف کے ہونٹوں سے نکلی۔وہ اس پر جھک گیا۔
اس کے چہرے کو ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولا۔

”آشی“!

آنسو فرخ کی نگاہوں سے چھلک چھلک جاتے تھے۔لیکن وہ انہیں پی جانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”آؤ میرے گلے لگ جاؤ۔میرے سینے پر اپنا سر رکھ دو۔فرخ! میں نے تمہارا کتنا انتظار کیا کاش تم جان سکو۔“

وہ اس کے سینے پر سر رکھے کتنی دیر بے سُدھ پڑا رہا۔آنسوؤں کو چھپانے کا ایک سہارا مل گیا تھا۔کتنے ہی لمحے اِسی حالت میں گذر گئے۔اور پھر اس کی ابتر حالت کا خیال کرتے ہوئے وہ سیدھا ہو گیا۔

”فرخ نرس سے کہو وہ باہر چلی جائے۔دروازہ بند کر دو اور میرے نزدیک آ جاؤ۔میں تمہیں اپنے وہ زخم دکھانا چاہتا ہوں۔جنہوں نے مجھے چھلنی کر دیا ہے۔میرے سینے میں ناسور پیدا کر دیے ہیں۔داغ ڈال دیئے ہیں۔سوراخ کر دیئے ہیں۔ایسے سوراخ فرخ جنہیں رفو نہیں کیا جا سکتا۔وہ داغ جنہیں دھویا نہیں جا سکتا۔وہ ناسور جن کا علاج ممکن نہیں اور وہ زخم جن کیلئے کوئی مرہم نہیں۔“

اور پھر درد کی گرہیں کھلتی چلی گئیں۔راز ایک سینے سے دوسرے سینے میں منتقل ہوتے چلے گئے اور فرخ نگاہوں میں حیرانی کی انتہا لیے حالات کے اس درجہ بھیانک ہو جانے اور فرشتوں جیسا تقدس اور پھولوں جیسی پاکیزگی رکھنے والے ایک پیارے سے انسان کے یوں گناہوں کے گہرے کھڈ میں گر جانے کے متعلق سوچتا رہا۔

کتنے ہی بے رحم لمحات گزر گئے۔

تب پیار سے اشرف کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اُس نے کہا۔

''آشی پشیمانی کا احساس گناہ کے بوجھ کو ہلکا کر دیتا ہے اور ندامت کے آنسو گناہ کو دھو ڈالتے ہیں۔ ہم انسان ہیں فرشتے نہیں۔ انسان غلطیاں کرتے چلے آئے ہیں اور رحمتِ باری صدقِ دل سے تائب ہونے پر درِ معافی وا کرتی چلی آئی ہے۔ یوں اس کی رحمت سے نا اُمید ہو گئے ہو۔''

''آنسو اشرف کے رخساروں پر ڈھلک گئے۔''

کسی نے دستک دی۔ فرخ نے اس کے آنسو پونچھے اور دروازہ کھول دیا نوکر چائے لیے کھڑا تھا۔'' میں نہیں پیوں گا۔ لے جاؤ اس سوغات کو۔'' خشمگیں نگاہوں سے اپنے نوکر کو گھورتے ہوئے انتہائی بیزاری سے کہا۔ نوکر الٹے پاؤں واپس چلا گیا۔ وہ بڑبڑایا۔ ''چائے پلاتے ہیں کمینے بد ذات لوگ، ایک تو پشیمانی کے احساس تلے موت کے دروازے پر دستک دے رہا ہے اور دوسرے کے چہرے پر ندامت کا شائبہ تک نہیں''۔

''میں اب چلتا ہوں' خدا نے چاہا تو کل میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔' اور یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

فرخ جب اپنے کمرے میں داخل ہوا تو صفائی ہو چکی تھی۔ سامنے میز پر اسے اپنی اور اشرف کی اکٹھی تصویر نظر آئی۔ وہ تصویر اور اشرف کی موجودہ شکل کا موازنہ کرنے لگا۔ دل کٹ ہی تو گیا۔ بے دلی سے دروازہ بند کر کے اس نے جوتے اتارے اور کپڑوں سمیت بستر میں دبک گیا۔

کتنی ہی دیر تصویر کو دیکھتا رہا۔ اور خود سے بولا۔

''میرے دوست اس میں شک نہیں کہ تم بہت عقلمند ہو۔ لیکن تمہاری عقلمندی تصنع اور بناوٹ سے بے نیاز ہے۔ کیا میرے شبہات درست نہ تھے؟ کہ وہ تمہیں کسی گہرے مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں اور آخر کار وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گئے۔ کیسے ہوئے یہ کوئی نہیں دیکھے گا۔ کوئی نہیں جانے گا۔ وہ ہی باتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک سیٹھ نے کسی غریب کو خرید لیا۔ ایک

غریب آدمی کسی کی دولت پر مرمٹا۔"

وہ جذبات سے بے قابو ہو رہا تھا۔تصویر کو ہاتھ بڑھ کر اٹھالیا۔"تم مجھے کتنے عزیز ہو۔ کاش کوئی میرے دل گہرائیوں میں جھانک کر دیکھ سکے۔ جہاں تمہارے لیے محبت کے دریا موجزن ہیں۔" ڈھیر ے ڈھیر ے کتنے ہی واقعات آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔

میڈیکل کا پہلا سال تھا۔شروع شروع کے دن تھے۔تقریباً سب ہی اجنبی چہرے تھے۔وہ دونوں کلاس فیلو ہی نہیں بلکہ روم میٹ بھی تھے۔اجنبیت کی دیواریں ابھی ٹوٹی نہیں تھیں۔ تکلف کے پردے ابھی ان کے درمیان مائل تھے کہ ایک دن فرخ کالج کی سیڑھیوں سے اتر رہا تھا۔جانے کیسے اس کا پاؤں پھسلا اور وہ دھڑام سے جو گرا تو لڑھکتے لڑھکتے نچلے زینے کی خبر لی۔ اس کے منہ اور ناک سے اتنا خون بہہ گیا کہ اگر اسے فوری طور پر خون نہ دیا جاتا تو اس کی جان خطرے میں پڑ جاتی اور جب بلڈ بنک سے اس کے گروپ کا خون نہ مل سکا تو اس خاموش انسان کا خون اس کی رگوں میں زندگی کا پیامبر بن کر دوڑنے لگا۔جس کی سلجھی ہوئی عادات کو فرخ نے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا تھا۔آہستہ آہستہ اس کی خوبیاں آشکارا ہوتی گئیں۔

بہت جلد تعلیمی میدان میں اس نے اپنا سکہ جمالیا۔اس جیسا بلند ظرف انسان فرخ نے پہلے کہیں نہیں دیکھا تھا۔یہی وجہ تھی کہ وہ اس کے دل کی پنہائیوں میں جگہ حاصل کر چکا تھا۔

وہ تقریری مقابلوں کا ہیرو تھا۔اساتذہ کا منظورِ نظر اور لڑکوں کا ہر دلعزیز دوست۔

"آہ آشی" اس نے غمناک آواز میں کہا اور ڈھیر ے ڈھیر ے اداسیوں کے سمندر میں ڈوب گیا۔

باب نمبر: 12

تلخ حالات نے کتنا المناک موڑ اس کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ جہاں دل کو لرزا دینے والی گہری تاریکیاں تھیں۔ پریشان کر دینے والے گھور اندھیرے تھے۔ کوئی ننھی سی روشنی کی کرن بھی تو دکھائی نہ پڑتی تھی۔ دل باور کرنے کو تیار نہ تھا۔ جو کچھ ہو گیا ہے واقعی ہوا ہے۔

اسے ہوسٹل آئے کافی دن ہو چکے تھے۔ بظاہر وہ اب ٹھیک تھا لیکن اس کے دل میں اٹھتے ہوئے ان طوفانوں کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ جو شوریدہ سر لہروں کی طرح ابھرتے اور اس کی ذہنی دنیا میں ہلچل مچا دیتے۔ دن تو خیر مصروفیت میں اِدھر اُدھر گذر جاتا۔ خیالات کا دھارا کسی حد تک رخ بدل لیتا۔ لیکن رات مہیب سناٹوں کے ساتھ آتی اور اسے سوچوں کے دامن میں الجھا کر نیم پاگل بنا جاتی۔ صبح اٹھتا تو آنکھیں سرخ ہوتیں۔ فرخ اسے ہر ممکن خوش رکھنے کی کوشش کرتا۔ لیکن یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے لب مسکرانا بھول گئے ہوں۔ پڑھائی میں بھی وہ قطعی دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ فرخ اُس کی اس حالت کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

ایک دن اپنے کمرے میں اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے فرخ کہہ بیٹھا۔

''آشی'' زندگی میں کبھی کبھی ایسے لمحات بھی آتے ہیں جو تباہ کن اثرات کے حامل ہوتے ہیں۔ جن کی سنگینی پر دل تڑپ تڑپ اٹھتا ہے لیکن اگر حوصلے کا دامن چھوڑ دیا جائے تو زندگی کا مفہوم ہی بے معنی سا ہو کر رہ جاتا ہے اٹھو سب کچھ بھول جاؤ۔ خدا عظیم ہی نہیں بے نیاز بھی ہے۔''

''فرخ!''

شدتِ کرب سے اشرف نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

''میں تمہارا کتنا ممنون ہوں۔تم نہ ہوتے تو شاید میں گھٹ گھٹ کر ہی مرجاتا۔تمہیں میری آزردگی کھلتی ہے،تم مجھے مسکراتا دیکھنا چاہتے ہو' لیکن مسکراہٹیں تو مجھ سے روٹھ گئی ہیں۔ مسکراؤں تو کیسے''؟

''تفکرات کے اس انبار کو کندھوں سے اُتار پھینکو۔زندگی حادثات کا نام ہے یوں اگر دُکھوں کو گلے سے لگانا شروع کردیا تو ان طوفانوں کا کیسے مقابلہ کروگے جو قدم قدم پر ملتے ہیں''۔

''فرخ نے اس کی ڈھارس بندھائی''۔

''میرے سینے میں مچلتی قیامتیں تم سے پوشیدہ کیوں ہیں فرخ؟ سوچو! ابھی تو اُمیدوں کے چاند ستارے خواہشات کے آنگن میں اتر ہی رہے تھے۔تاریک گھر کے باسی افق پر طلوع ہونے والی اس روشن سحر کے منتظر تھے۔جو اُن کے گھر میں چاند جیسے اجلے اجلے اُجالے جنم دینے والی تھی''۔

''آہ فرخ!''

''امیدوں کے چاند ستارے درخشندگی دینے سے قبل ہی ڈوب گئے۔افق کی سحر کو تاریک بادلوں نے نگل لیا''

اس کے چہرے پر زمانے بھر کا درد پھیلا ہوا تھا اور آنکھیں نم تھیں۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تم اس گھر میں روشنی کا مینار بنو گے۔اس گھر میں اجالا پھیلاؤ گے۔کیوں ایسی باتیں سوچ سوچ کر اپنے آپ کو ہلکان کرتے ہو''

وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

''خود کو اور مجھے فریب دینے کی کوشش مت کرو''۔

''اس میں فریب کی کیا بات ہے؟''فرخ نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”فریدہ سے شادی کے بعد کیا میرا گھر تاریک نہ ہو جائے گا؟“

”تم شادی کرو گے فریدہ سے، لیکن کیوں، وہ چلا اٹھا۔

”اس لیے کہ میں اس کا مجرم ہوں“۔ لہجے میں تڑپ تھی۔

تم مجرم ہو یا وہ لوگ تمہارے مجرم ہیں۔ جنہوں نے اول دن ہی سے تمہیں اپنے ستم کا نشانہ بنانے کے لیے چن لیا تھا۔ ان کم ظرف لوگوں نے کچھ بھی تو نہ سوچا۔ یہ سب ان کی سازشیں ہیں۔ تم خود نہیں سمجھ سکتے۔ فرخ کا لہجہ بے پناہ جوشیلا تھا۔

دردناک سی آہ اشرف کے سینے سے نکلی۔ سر کو تکیے پر ٹکتے ہوئے اس نے دھیرے سے کہا۔

”میں کیا نہیں سمجھتا۔ لیکن جذباتی لغزش کا شکار میں بھی ہوا ہوں اور مجھے اس کا خمیازہ بھگتنا ہی ہوگا۔ زندگی کی ہر متاع سے محرومی مجھے گوارا ہے فرخ لیکن انسانیت کبھی سرنگوں ہو یہ میں برداشت نہیں کرسکتا۔ یہ تو ان اخلاقی اقدار کی توہین ہوگی جن پر ہمارا ایمان ہے۔“

وہ نڈھال سا بستر پر لیٹ گیا۔ حالات واقعی قابلِ رحم حد تک سنگین ہو چکے تھے۔ فرخ کی نگاہوں کے سامنے اشرف کے گھر والے متحرک تصویر کی طرح ابھرے۔ اتنے پیارے اور مخلص لوگ جن کے خلوص کی کوئی حد نہ تھی۔ پہلی بار جب اشرف کے ساتھ اس کے گاؤں گیا تو بظاہر وہ ان کے لیے اجنبی تھا لیکن ایک لحظہ کے لیے بھی اسے بیگانگی اور اجنبیت کا احساس تک نہ ہوا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اسی گھر کا فرد ہے اور ان کے ساتھ صدیوں سے رہ رہا ہے۔ وہاں غربت ضرور تھی لیکن ان کے دل محبت کے خزانوں سے بھرپور تھے۔ ہر فرد کو اس نے پسند کیا۔ لیکن خاص طور پر وہ اشرف کی پھوپھی سے بہت متاثر ہوا۔ جن کی شفقت ومحبت کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا اور ان کی بیٹی اسما کو دیکھ کر حقیقتاً فرخ کو اشرف کی خوش قسمتی پر رشک محسوس ہوا تھا۔ حسن وخوبی کا ایک دلآویز شاہکار جس کی آنکھیں اشرف کو دیکھ کر خوشی کے بے پایاں احساس سے جگمگا اٹھتی تھیں۔

سرد سی آہ کھینچ کر اُس نے سوچا۔ لیکن اب کیا ہوگا؟ کس کس کی حسرتیں پامال ہوں گی۔

کون کون بن آئی موت مرے گا۔

اشرف کتنی دیر سے اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

''کیا سوچ رہے تھے؟''اس نے دھیرے سے پوچھا؟

''کچھ نہیں ایک ادھورا خواب یاد آ گیا تھا۔''اس نے سر تکیے پر رکھتے ہوئے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا''۔

باب نمبر: 13

پچھلے چند مہینوں سے اسماء تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد ایک ہی نوعیت کا عجیب و غریب سا خواب دیکھ رہی تھی۔ آنکھ کھلتی تو خواب کا آغاز الجھ سا جاتا۔ یوں جیسے دل و دماغ پر ایک پردہ سا آ جائے۔ صرف انجام کا یہی تھوڑا سا حصہ اس کے ذہن میں محفوظ رہ جاتا کہ اس کی کلائی میں پہنا ہوا گلاب کے پھولوں کا ایک لمبا سا گجرا کوئی ہاتھ بڑھا کر توڑ دیتا ہے۔ سرخ تازہ گلاب زمین پر بکھر کر مٹی میں لت پت ہو جاتے ہیں۔

اور چادر میں لپٹا ہوا کوئی پراسرار سا وجود پھولوں کو چُن چُن کر اپنی جھولی میں ڈال کر چل دیتا ہے۔

اور آج اس نے پھر وہی بے تکا سا خواب دیکھا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی اس کی طبیعت سخت مکدر ہو گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔ ویسے وہ وہمی طبیعت کی ہرگز نہیں تھی۔ لیکن ایک ہی طرح کے خواب نے اسے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیٹے لیٹے اس نے خواب کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔ اتنا وہ سمجھتی تھی کہ پھولوں کو اس کے ہاتھوں سے چھیننا اور ان کا ٹوٹ کر زمین پر گر پڑنا اور پھر کسی کا اٹھا کر چل دینا کوئی اچھی تعبیر نہیں رکھتا۔ لیکن اسے کوئی صدمہ یا تکلیف پہنچنے کا احتمال کس طرح سے ہو گا۔ اس معمے کو اس کی عقل حل نہ کر سکی۔

پچھلے چند دنوں سے گھر میں بھی عجیب بے کلی محسوس کی جا رہی تھی۔ عائشہ کو خواب میں

کئی بار بھتیجا بیمار نظر آیا۔فاطمہ نے بھی خواب میں بیٹے کو بیمار اور مضطرب دیکھا۔خط لکھا گیا۔چند دن بعد تک جواب نہ آیا تو پریشانی اور بڑھی۔جمال لاہور جانے کے لیے بھی تیار ہو گیا۔لیکن اسی دن فرخ کا خط انہیں مل گیا۔جس میں اس نے لکھا تھا کہ اشرف تقریری مقابلے میں شرکت کے لیے کراچی گیا ہوا ہے۔فرخ کے خط نے ان وسوسوں اور اندیشوں کو ختم کر دیا۔جو اُن کے دلوں میں جنم لے رہے تھے۔کچھ دنوں بعد ہی خود اشرف کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط بھی انہیں مل گیا۔اب بظاہر فکر کی کوئی بات نہ تھی۔لیکن پھر بھی جانے کیوں انجانے سے اندیشے دماغ پر حاوی رہتے۔

خاصا دن چڑھ آیا تھا۔وہ اُٹھ بیٹھی باہر نکلی تو عائشہ فاطمہ سے کہہ رہی تھی۔

جمال بھائی کو فوراً لاہور بھیجیں۔میں نے اشرف کو اچھی حالت میں نہیں دیکھا یہ بے چینی اور اضطراب بلاوجہ نہیں ہو سکتا۔

اور پھر اسی دن جمال لاہور پہنچ گیا۔میڈیکل ہوسٹل میں جب وہ اشرف کے کمرے میں داخل ہوا تو آرام کرسی پر نیم دراز توانا وصحت مند اشرف کی بجائے اس کا نحیف ونزار وجود اُسے تڑپا گیا۔

حواس اڑتے ہوئے محسوس ہوئے۔کہاں اس کا وہ رنگ روپ اور دلکش چہرہ اور کہاں زرد رنگ، دھنسی ہوئی آنکھیں یوں جیسے صدیوں کا مریض ہو۔ہر چیز گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔سسکتی ہوئی آواز میں اس کے منہ سے نکلا"اشرف"

دردناک سی اس جانی پہچانی آواز پر اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔

برق کی سی تیز رفتاری سے وہ لپکا اور اس کے گلے سے لگ گیا۔اس کی حالت صحرا میں سفر کرنے والے اُس مسافر کی سی تھی۔جس کا گرمی سے بُرا حال ہو۔لیکن جو اچانک چلتے چلتے کسی گھنے درخت کے سائے تلے پہنچ جائے۔

جمال بے اس کے رخساروں اور پیشانی کو چوم رہا تھا۔آنکھیں اشکوں کا دریا بہا رہی تھیں۔وہ اس سے بیماری کے متعلق پوچھ رہا تھا۔لیکن وہ کیا بتاتا؟ جمال اسے اسی وقت گھر لے

جانے کے لیے بضد تھا۔بس میں سفر کرتے ہوئے اس کی سوچیں عجیب رنگوں میں رنگی چلی جا رہی تھیں۔وہ کیا بتائے گا اُنہیں کہ اُسے کون سی بیماری چمٹ گئی ہے۔کس درد نے اس کے دل میں ڈیرے ڈال لیے ہیں۔فاصلے جوں جوں نزدیک ہوتے جا رہے تھے۔اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔بیٹے پر نظر پڑتے ہی فاطمہ کے منہ سے چیخ سی نکل گئی۔بے اختیار بھاگی۔چھاتی سے لگاتے ہی آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ممتا کے خدشات کبھی غلط نہیں ہو سکتے۔فاطمہ کو جس چیز کا خطرہ تھا وہ غلط نہ تھی۔

سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔عائشہ آگے بڑھی۔لیکن جمال نے اشرف کا بازو تھام کر اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔اس نے ایک ثانیہ پھوپھی کو دیکھا اور پھر پاس کھڑی روتی ہوئی اسما پر نظر پڑی۔یہ لمحہ کتنا جانگسل تھا۔قیامت ہی تو گذر گئی۔دل تڑپ اٹھا اور کسی مجبور اور بے بس بچے کی طرح اس نے بے اختیار بازو عائشہ کی طرف پھیلا دیئے۔پھر وہ جو اس کے کندھے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رویا تو خاموش ہونے میں نہ آتا تھا۔

اس کی حالت دیکھ کر گھر والوں کے دل کٹے جا رہے تھے۔

اسے بہترین غذائیں دی جا رہی تھیں۔معلوم ہوتا تھا جیسے سارے گھر کو اشرف کے کاموں کے سوا اور کوئی کام نہیں رہے۔

اور محبت کے اتنے گہرے اور تیز احساسات اسے بن آئی موت مار رہے تھے۔صحت بہتر ہونے کی بجائے اور گرتی جا رہی تھی۔فاطمہ جب پیار سے اس کا سر دباتی تو اس لمحے اس کا دل شدت سے چاہتا کہ وہ اسے سب کچھ بتا دے۔اس سے کہہ دے کہ اس کا نابکار بیٹا کیا کر بیٹھا ہے۔لیکن وہ اس خواہش کو عملی جامہ کبھی نہ پہنا سکا۔اُسے تو یہ تصور ہی پاگل بنا ڈالتا کہ وہ ماں جس نے ہر قدم پر اس کی نیکی کے لیے دعائیں مانگی ہیں۔کن کانوں سے سن سکے گی کہ اس کا بیٹا ایسی گھناؤنی حرکت کا مرتکب ہو گیا ہے۔

سوچیں تھیں یا زہریلے ناگ جو اُسے ڈسنے کے نئے انداز لے کر ذہنی دنیا میں داخل

ہوتے اور زہر پھیلا کر چلے جاتے ۔زہر دماغ میں سرایت کرتا رہتا اور وہ نیم پاگل سا ہو کر سر کو اِدھر اُدھر پٹختا رہتا۔

کمرے میں لالٹین جل رہی تھی اور وہ کتنی ہی دیر سے اس کی مدھم مدھم سی روشنی کو گھور رہا تھا۔کانوں میں کبھی کے کہے گئے الفاظ گونج رہے تھے۔

''اشرف ہمارے خاندان کا چراغ ہے۔ہمارے خاندان کا چاند ہے۔ہم یہ چراغ اتنا روشن کریں گے کہ اس کی روشنی میں دنیا ہمارے گمنام چہروں کو دیکھ سکے۔''

''آہ''شدتِ کرب سے منہ سے نکلا۔

''تم نے جس چراغ کو روشنی دی۔وہ بدر کامل بننے سے قبل ہی گھٹاؤں میں چھپ گیا تم نے جس چراغ کو روشن کرنے کے لیئے اپنے لہو کا تیل ڈالا۔بدقسمتی کی ظالم پھونک نے اسے ایک دم ہی بجھا کر رکھ دیا۔''

تم گمنام ہو۔گمنام ہی رہو گے اور گمنامی میں ہی مر جاؤ گے۔تمہاری گمنامی کے چہرے سے نقاب اٹھانے والا ہاتھ ٹوٹ گیا ہے۔

وہ دھیرے دھیرے بڑبڑا رہا تھا۔

اسما جانے کب سے دودھ کا پیالہ ہاتھ میں پکڑے اس کی دھیمی دھیمی بڑبڑاہٹ سُن رہی تھی۔تنگ آ کر اس کا کندھا ہلاتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

''دودھ نہیں پیا آپ کو؟ یہ لیجیئے۔''

اشرف نے اس کی طرف دیکھا۔حسن فطرت کا معصوم شاہکار سادگی لیے اس کے سامنے کھڑا تھا۔آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔چند لمحوں تک وہ اسے بغور دیکھتا رہا۔پھر سر جھک گیا۔ایک خیال دماغ میں ابھرا۔''اس سے سب کچھ کہہ دو۔تمہاری مجبوریاں اس کے علم آ جائیں گی۔جن گھُپ اندھیروں میں تم بھٹک رہے ہو۔ہوسکتا ہے وہ وہاں روشنی کا کوئی دیا ہی رکھ دے۔''

اور اگلے دن وہ اس کے پاس بیٹھا، تلخ داستانِ حیات کے ورق الٹ رہا تھا۔ اسماء چپ چاپ سن رہی تھی۔ داستان ختم ہو گئی۔ دھیرے سے اس کی طرف جھکتے ہوئے اشرف نے بے حد دکھی لہجے میں کہا۔

''اسما میرا دماغ تو سوچ سوچ کر پاگل ہو گیا ہے۔ تم ہی کچھ بتاؤ''

لیکن اسما کو سوچنے اور جواب دینے کی فرصت کہاں تھی۔ وہ تو فضاؤں میں اپنے ہرے بھرے آشیانے کو دیکھ رہی تھی۔ جہاں آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ گھروندا جل جل کر ٹوٹ رہا تھا۔ جسے وہ جانے کب سے بناتی چلی آ رہی تھی۔ خواہش اور ارمان اپنی موت آپ مر رہے تھے۔ حسرتیں دم توڑ رہی تھیں اور امیدوں کے جنازے اٹھ رہے تھے۔

''اسما!''

اشرف نے اسے پکارا۔

دیوانوں کی طرح اس نے نگاہیں اٹھا کر اشرف کو دیکھا۔ وہ تڑپ اٹھا۔ وہ ہستی اسے کتنی محبوب تھی۔ کاش کوئی جان سکتا۔ آج اس کی شوخ و چنچل آنکھوں میں دنیا ویران دکھائی دے رہی تھی۔

''آشی تاریک رات کے وہ مسافر جو صبح کے انتظار میں زندگی گزار دیتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کے مقدر کے افق پر وہ سحر کبھی طلوع نہیں ہوتی اور وہ بدقسمت مسافر ہمیشہ تاریکیوں میں ہی بھٹکتے رہتے ہیں۔ تب تاریکیاں اور اندھیرے ان کا مقدر بن جاتے ہیں۔ ہمارے ساتھ اگر ایسا ہوا تو کچھ عجب نہیں''۔

آنسو موتیوں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی حسین آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ یہ سب اشرف کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اس کا دل پھٹا جا رہا تھا۔ اسما کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے اور اس کے رخساروں سے آنسو صاف کرتے ہوئے وہ دردناک آواز میں بولا۔

’’تمہیں مجھ سے گلہ ہے ۔کاش اسماتم میری مجبوریوں کو سمجھ سکو‘‘۔

’’تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ مجھے تم سے کچھ گلہ ہو سکتا ہے ۔آشی گلہ تو مجھے اپنے مقدر سے ہے۔‘‘

’’حالات پر میرا بس نہیں ۔میرے سامنے تو گھٹاٹوپ اندھیرے ہیں ۔اسماء مجھے روشنی دکھاؤ۔‘‘

’’میں سوچوں گی‘‘۔

اتنا کہتے ہوئے وہ اُٹھ گئی۔گھر کی طرف جاتے ہوئے اسے اپنے خواب یاد آئے ۔خوابوں کی تعبیر اسے مل چکی تھی ۔سندر سپنوں کے رخ سے تمناؤں کے آنچل تار تار ہو چکے تھے ۔

حالات کبھی اتنے بے رحم بھی ہو سکتے ہیں ۔اس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کتنے ہی دن وہ اندر ہی اندر گھلتی رہی ۔پریشان ہوتی رہی ۔سوچتی رہی ۔

اسے تو لے دے کے ایک ہی راستہ نظر آتا ۔وہ راستہ جس پر چل کر اخلاقی اقدار کا تحفظ ہوتا ہے ۔لیکن اس راستے پر چلنے کا مشورہ دینا کتنا کٹھن نظر آتا ۔اندیشوں کے سانپ اسے ڈستے ۔اپنی زندگی کسی بے برگ وگیاہ صحرا کی طرح نظر آتی ۔جہاں دور دور تک کسی نخلستان کا تصور بھی پیدا نہ ہوتا تھا ۔گھر والوں کی محرومیاں اور خود اس کی ماں کے جذبات وخواہشات ۔

اسے اشرف کے جلنے کا صحیح معنوں میں اب احساس ہوا۔

تب اس نے فیصلہ کر لیا۔

کہ وہ اشرف کو روشنی دکھائے گی ۔اسے خود محرومیاں گوارا ہیں لیکن اشرف پریشان ہو۔یہ وہ کبھی برداشت نہ کرے گی ۔وہ ماں کے نقشِ قدم پر چلے گی ۔

اسے معلوم تھا کہ حالات کے بدل جانے سے گھر میں ہر فرد متاثر ہوگا لیکن اس نے دل میں ٹھان لی کہ وہ ان سب کے دلوں سے اشرف کی نفرت کے بیج نکال پھینکے گی ۔

’’میں زندہ رہوں گی ۔اشرف کے لیے انسانیت کے لیے ۔

اور یہ احساس اسے طمانیت اور سکون دے گیا۔ جیسے کسی نے جلتے ہوئے زخموں پر ٹھنڈے ٹھنڈے پھاہے رکھ دیئے ہوں۔

باب نمبر: 14

درد جب اپنی انتہا کو پہنچ جائے تو وہ دوا بن جاتا ہے۔ ٹیسیں جب حد سے بڑھ جائیں تو ان کی شدت میں کمی ہونی شروع ہو جاتی ہے۔

اشرف کی تڑپ اور پریشانیاں جب نقطہ عروج پر پہنچ گئیں تو وہ خود بخود کم بھی ہونے لگیں۔

دل و دماغ میں اٹھتے ہوئے خوفناک طوفانوں کی گھن گرج کچھ مدھم پڑ گئی تھی تڑپ تڑپ کر اس میں کچھ خنکی سی آ گئی تھی۔

ہزاروں دکھی انسانوں کی مثالیں اس کے لیے کچھ تقویت کا باعث بن گئی تھیں۔ اس نے عزم کر لیا تھا کہ وہ جیئے گا۔ اپنے لیے نہیں بلکہ ان دکھی انسانوں کے لیے جن کا بوجھ دھرتی کے لیے ناگوار رہتا ہے۔ جنہیں صحت مند معاشرہ اپنانے سے گریز کرتا ہے۔ جن کا مرض دُنیا میں بسنے والوں کے لیے خطرناک ہوتا ہے۔ وہ ان کا علاج جانفشانی سے کر کے انہیں دنیا میں آبرومندانہ طور پر زندگی گزارنے کا حق دے گا۔ ''اور کون جانے شاید یہی چیز مجھے بھی سکون دے جائے۔''

دل سے سمجھوتہ کر لیا تھا کہ وہ مچلے گا نہیں۔ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ چلا جائے گا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ملازمت کرے گا۔ اور طویل مدت بعد واپس لوٹ آئے گا ہو سکتا

ہے یہ مدت دلوں میں پیدا ہونے والی بدگمانیوں اور رنجشوں کو زائل کر دے اور پھر اسما کے نام پر ایک عظیم ہسپتال بنائے گا۔ جہاں زندگی کے ہاتھوں بیزار مریض آ کر صحت کا جام پئیں گے۔

''میں انہیں گمنامی اور تاریکی میں کبھی نہیں مرنے دوں گا۔ ان پردوں کو تار تار کر دوں گا۔ جو اُن کے چہروں پر پڑے ہیں۔ لیکن ابھی نہیں''۔

ایک دل آویز سراپا نظروں کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ حسین آنکھوں سے رم جھم برستی بارش اُسے بے قرار کر گئی۔

''اسما تم تیرہ تاریک رات میں جگمگانے والی روشنی ہو۔ وہ شمع ہو۔ جو اپنی آگ میں آپ جل کر بھولے بھٹکے راہیوں کو راستہ دکھاتی ہے۔ تم میرے لیے کتنی قربانی دے گئی ہو۔ مجھے تم پر ہمیشہ فخر رہے گا۔ تمہاری قربانی میرے جذبوں اور ولولوں کو کبھی ماند نہ پڑنے دے گی''۔

دروازے پر دستک ہوئی۔

''کون؟''

اس نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بیگم فضل کا نوکر کمرے میں آ گیا۔ جب سے گاؤں سے آیا تھا۔ ان کا متعدد بار فون آ چکا تھا۔ کبھی سن لیتا کبھی نظر انداز کر دیتا۔ نوکر بھی کئی مرتبہ آ چکا تھا لیکن مصروفیت کا کہہ کر اسے ٹال دیتا۔ دراصل ان سے مل کر وہ اپنی قدرے سنبھلی ہوئی حالت کو اور خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ارادہ ایک بار ہی ملنے کا تھا۔

نوکر نے ہلکے نیلے رنگ کا لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ کھولا تو فریدہ کا خط تھا جس میں اس کی سرد مہری کا شکوہ اور بے اتفاقی کا رونا رویا گیا تھا۔ یوں لگا جیسے اُسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ لیکن اب تو یہ زہر اُسے قدم قدم پر پینا ہی تھا بیزاری اور نفرت سے فائدہ؟

رائٹنگ پیڈ میز سے گھسیٹا۔ قلم کھولا اور دوسرے ہی لمحے اس کے دل کا خون فریاد بن کر صفحۂ قرطاس پر بکھرنے لگا۔

"عزیزہ!

تم نے کبھی ان ننھے منے معصوم شگوفوں کو دیکھا ہے ۔ جو اپنی نیم باز آنکھوں سے بہار کے اُن خوشگوار دنوں کے منتظر ہوتے ہیں جب وہ جوبن پر آ کر مسکرا سکیں ۔ چمن کی رنگینوں اور دلفریبیوں کو دوبالا کر سکیں ۔ ان ویران گوشوں کو عطر بیز ہواؤں سے مہکا سکیں ۔ جو سونے سونے سے پڑے تھے ۔ لیکن بعض دفعہ بادسموم کے گرم گرم تھپیڑے ان غنچوں کو بن آئی موت مار دیتے ہیں اور وہ سوکھے ہوئے خشک ٹہنیوں سے لپٹے دیکھنے والوں کو ایک دکھ بھری داستان اپنی خاموش زبان میں کہتے نظر آتے ہیں ۔"

اے کاش تم لوگوں نے کچھ تو سوچا ہوتا ۔

فریدہ تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں ۔ میں مٹ جانا پسند کروں گا لیکن اخلاقی اقدار پر آنچ نہ آنے دوں گا ۔

اشرف تمہاری دوشیزگی کی قیمت ضرور ادا کرے گا ۔ (اشرف)

جب نوکر نے یہ خط فریدہ کو دیا تو چند لمحوں کے لیے وہ سکتے میں آ گئی ۔ خط میں چھپا ہوا درد اس نے بخوبی محسوس کر لیا ۔ واقعی وہ اس کے بلند کردار کی دل سے قائل ہو گئی ۔ ایک بار تو دل چاہا کہ وہ اسے تمام بندھنوں سے آزاد کر دے ۔ لیکن دوسرے ہی لمحے خودغرضی غالب آ گئی ۔

نہیں نہیں وہ اتنے پیارے انسان سے کبھی جدا ہونا پسند نہ کرے گی ۔

"میں اس کی زندگی کو یکسر بدل دوں گی ۔ اسے کلبوں میں لے جاؤں گی ۔ جہاں چھلکتے ہوئے ارغوانی جاموں میں وہ زندگی کے سب دکھ درد بھول جائے گا ۔

میری اداؤں کے جادو میں اسے زندگی کا حقیقی حسن نظر آئے گا ۔ وہ عزیزوں اور چاہنے والوں کو یکسر فراموش کر دے گا ۔ میں اسے سب کچھ بھلا دوں گی ۔ وہ ایک ہیرا ہے اور ہیرے سے جدا ہونا کون پسند کرے گا؟"

وقت کی چکی میں کچھ ماہ اور پسے ۔ امتحان آئے اور ختم ہو گئے ۔ اشرف اب فارغ تھا ۔

اسے کچھ سمجھ نہیں آ تا تھا کہ وہ یہ تین ماہ کہاں گذارے۔گھر وہ جانا نہیں چاہتا تھا۔کیونکہ زخموں کے منہ پر جو ہلکی سی جھلی آ گئی تھی اس کے دوبارہ پھٹ جانے کا اندیشہ تھا۔فرخ اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔لیکن وہ رضامند نہ ہوا۔اسے معلوم تھا کہ وہ وہاں بھی بے چین رہے گا۔دل کے درد اور زخم اسے تنہائیوں میں اور بھی تنگ کریں گے۔بہتری اسی میں ہے کہ ہسپتال میں کام کرتا رہے۔ ڈاکٹر خیرات سے بات کی تو انہوں نے اس کے جذبے کو بہت سراہا۔

کراہتے اور سسکتے مریضوں کی دیکھ بھال وہ اس لگن اور جذبے سے کرتا کہ اس پر کسی فرشتے کا گمان پڑتا۔اس کی راتیں اسی کام کی نظر ہو جاتیں کتنے ہی زندہ درگور مریضوں کو وہ اپنی بے پناہ محنت سے موت کے منہ سے نکال لایا تھا۔لیکن یہ سخت ریاضت اس وقت دم توڑ دیتی۔ جب گھر سے کوئی خط آتا۔مختصر سے دو چار لفظ لکھ کر وہ انہیں مطمئن کر دیتا۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی آئے اور اس سے ملے۔ان محبوب انسانوں کا سامنا کرنا اب اس کے بس کی بات نہ تھی۔

باب نمبر: 15

نتیجہ نکلا اور اس نے یونیورسٹی میں ٹاپ کیا۔ اس دن ضبط کے بند ایک بار پھر ٹوٹے۔
اس قدر رویا کہ آنسوؤں کا سارا ذخیرہ اس کی آنکھوں کی راہ سے بہہ گیا۔ وہ ایک کامیاب ڈاکٹر
بن گیا تھا۔ لیکن یہ ڈاکٹری اسے اور اس کے خاندان کو کتنی مہنگی پڑی۔ کوئی نہ جانتا تھا۔

فرخ کالج پہنچ گیا تھا۔ اشرف اب جلد از جلد ہندوستان چھوڑ دینا چاہتا تھا حکومت
اُسے ایف۔ آر۔ سی۔ ایس کے لیے انگلینڈ بھیجنا چاہتی تھی۔ اشرف کے کہنے پر فرخ فضل و بیگم
فضل سے ملا اور ساری بات طے کی۔ وہ لوگ شادی بڑے ہی تزک و احتشام سے کرنا چاہتے تھے۔
لیکن فرخ نے انہیں اس ارادے سے باز رکھا۔ بیگم فضل نے بھی ضد نہ کی۔ کیونکہ فریدہ سے انہیں
کچھ حالات کا علم ہو چکا تھا۔

سادگی سے نکاح ہوا۔ کتنا دردناک تھا وہ سماں۔

قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکا ہے اور تقدیر کے فیصلوں سے کون لڑا ہے؟ یہ تو خدائی فیصلے
ہیں۔ جن کے سامنے انسان بے بس اور لاچار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کی شادی ہو رہی تھی۔

شادی۔

ایک حسین و خوبصورت بندھن۔

جس میں روحانی و جسمانی اتصال ہوتا ہے۔ رنگین آرزوئیں اور دلفریب سپنے پروان

چڑھتے ہیں۔سندرخواب تکمیل کی لذت سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

لیکن یہ ارمانوں بھری شادی نہ تھی۔اُسے اپنی عظیم ماں یاد آ رہی تھی۔عزیز ترین پھوپھی کا خیال تڑپا رہا تھا۔پیارے بہن بھائیوں کی صورتیں نگاہوں کے سامنے پھر رہی تھیں مصیبتیں برداشت کرنے والا باپ اور اسے اس منزل تک پہنچانے والے جان وجگر سے پیارے چچا یاد آ رہے تھے جو اس کے انتظار میں ایک ایک دن بے چینی سے گذار رہے تھے کہ کب ان کا جان جگر ڈاکٹر بن کر گھر آئے۔

مگر ڈاکٹر تو نئی زندگی کے سودے کر رہا تھا چہرے پر نکھار نہ تھا۔حسرتوں اور ویرانوں کے کھنڈر حکومت کر رہے تھے۔دل کٹا جا رہا تھا۔سوچ رہا تھا کہ بھٹک کر کن خار دار راہوں پر آ نکلا۔جس پر چل کر پاؤں بھی لہولہان ہو گئے اور دل میں بھی کانٹے چبھ کر خون رس رہا تھا۔آہ وہ دل جو گھائل ہو جائیں کب ٹھیک ہوتے ہیں؟

جانے سے ایک دن قبل اس نے گھر والوں کو خط لکھا۔اپنی مجبوری کا ذکر کرتے ہوئے اشرف نے ان سے معاف کر دینے کی درخواست کی اور خط پوسٹ کر دیا۔

وقتِ رخصت اس نے فرخ کی طرف دیکھا۔اس کی شرارتی آنکھیں آج آنسوؤں سے لبریز تھیں۔شوخ شوخ چہرے پر پھیلی ہوئی گہری اداسی کی گھٹا اس کے دلی جذبات کی غماز تھی۔

آخری سیڑھی پر قدم رکھ کر ایک نظر اس نے ائیرپورٹ پر ڈالی اور تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔جہاز سبک سر لہر کی طرح فضا میں اٹھا اور منزل کی طرف گامزن ہو گیا۔

وہ خط تھا یا ایک ایسا بم جو ہیروشیما پر بے خبری میں گرایا گیا تھا۔تھوڑی دیر تک تو وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکے۔لیکن جب اسلم نے بار بار پڑھ کر سنایا۔تو انہیں یوں محسوس ہوا جیسے قیامت وقت سے پہلے ہی آ گئی ہو۔آنسو پھوٹے پڑ رہے تھے۔زبان سے آہیں نکل رہی تھیں اور دل نوحہ خوانی میں مصروف تھے۔ان کے ہونٹوں پر ان کے دلوں میں ان کی زبانوں پر ایک ہی سوال مچل رہا تھا۔

''یہ سب کیسے ہوا؟ اشرف تو ایسا نہ تھا۔''

''آہ ہم نے اُسے ڈاکٹر اس لیے تو نہ بنایا تھا۔''

''معبودا تو نے آزمائش کی اس گھڑی کے لیے ہمیں ہی کیوں منتخب کیا؟''

''یہ غلط ہے اشرف کبھی ایسا نہیں کرسکتا۔'' یہ جمال کی آواز تھی یہ امیر کی آواز تھی۔ یہ ان سب کے دلوں کی آواز تھی۔

اسی وقت اسی سے اور اسی حالت میں جمال لاہور کے لیے چل پڑا۔ کالج پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ وہ واقعی مزید تعلیم کے لیے برطانیہ چلا گیا ہے۔ اس کی شادی کے متعلق بھی اس کے ایک کلاس فیلو نے تصدیق کر دی۔

مبہم سی امید جو دل کے کسی کونے میں دبی ہوئی تھی۔ اپنی موت آپ مرگئی۔ ملگجے اندھیرے میں ہسپتال کی دیواروں سے وہ لپٹ لپٹ کر رویا۔ پھوٹ پھوٹ کر اس نے آنسو بہائے۔ اینٹ اور پتھر کی بنی ہوئی عمارتوں کو اس نے دکھ سے دیکھا۔ جن میں اس کا ڈاکٹر گم ہو گیا تھا۔ شہروں کی گہما گہمی کو دیکھا، جس میں وہ اُلجھ گیا تھا اور پھر دیوانوں کی طرح بھاگتا ہوا میڈیکل ہوسٹل کے اس کمرے تک پہنچ گیا جہاں اشرف رہتا تھا۔

''میرے ڈاکٹر! اے کاش ہم نے تمہیں یہاں نہ بھیجا ہوتا۔''

وہ ستون سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

اور پھر اس جواری کی طرح گھر لوٹ آیا۔ جو اپنا سارا اثاثہ جوئے میں ہار بیٹھا ہو' عقل گم تھی، دماغ حیران تھا۔ اشرف اتنا فرمانبردار بیٹا اتنا سمجھدار اتنا حساس کہ انہیں اس پر فخر تھا، غرور تھا۔ یہ کیسا طلسم ہے؟ عقل کام نہیں کر رہی تھی لیکن طلسم بھی کہاں تھا؟ سب کچھ تو کھلی اور روشن حقیقت کی طرح ان کے سامنے تھا۔ عقل کے اِدھر اُدھر گھومنے اور بھٹکنے کا سوال ہی نہ تھا۔ بہنوں کی آنکھیں سُوج گئی تھیں۔ ماں کا دل چھلنی ہو گیا تھا۔ چچاؤں کے چہرے تفکر سے بوڑھے نظر آرہے تھے۔ شہاب الدین کی کمر جھک گئی تھی۔

اور

عائشہ جس کی آنکھوں کا نور اشرف تھا۔ جس کی بصارت اشرف تھا۔ بھلا نور اگر آنکھوں سے چلا جائے۔ آنکھیں بصارت کے جوہر سے محروم ہو جائیں تو باقی کیا رہ جاتا ہے؟
صدمے نے اسے پاگل بنا دیا تھا۔ یوں ایک رات وہ چُپ چپاتے زندگی کا ساتھ چھوڑ گئی۔

ترکش کا یہ ظالم تیر انہیں بالکل ختم کر گیا۔ تھکے ہارے اس وجود پر جو اپنی آگ میں خود ہی جل گیا تھا۔ فاطمہ نے آخری نگاہ ڈالی اور تڑپ کر دل ہلا دینے والے لہجے میں چلائی۔
''اس جہاز کو آگ کیوں نہ لگ گئی۔ وہ جہاز تباہ کیوں نہ ہو گیا۔ اشرف! جس میں تو سفر کر رہا تھا۔ تو نے ہمارے دل جلائے ہیں، خدا کرے تجھے کبھی سکون میسر نہ آئے۔''
حالات کی یہ نئی کروٹ کتنی المناک تھی۔ لورپول میں ایک خوبصورت سے فلیٹ کے ڈرائنگ روم میں ڈاکٹر اشرف خبریں سن رہے تھے۔ آج کے ڈاکٹر اشرف اور نو سال قبل کے اشرف میں کچھ زیادہ فرق نہیں ماسوائے اس کے کہ وقت نے اپنے قدموں کے کچھ نقوش ان کے چہرے پر ضرور چھوڑ دیے ہیں۔ وگرنہ ان کی آنکھوں میں جھلکتے غم کے سائے پہلے سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ اپنے آپ کو فن میں ڈبونے کے باوجود سکون سے آج بھی وہ تہی دامن ہی ہیں رستے ہوئے زخموں میں کچھ اور اضافہ فرخ کی موت سے بھی ہو گیا ہے۔ وہ جان و جگر سے بھی پیارا دوست جس پر انہیں ناز تھا۔ غرور تھا اور حقیقی معنوں میں ان کے لیے ایک مضبوط سہارا تھا۔
''کاش مجھے تمہاری موت کا علم ہوتا۔ تو میں کبھی یہاں نہ آتا۔ تمہارے پاس رہتا۔ اور ان خوشگوار لمحات کو اپنے دامن میں سمیٹتا رہتا۔ جو تمہاری قربت میں بسر ہوئے۔ تم جیسے دوست زندگی میں کہاں ملتے ہیں۔؟''
کتنا بدنصیب ہوں میں کہ تمہارے بیٹے کے متعلق بھی مجھے کوئی علم نہیں۔ میں نے کرنل رحمٰن کو کتنے خط لکھے؟ لیکن جانے وہ کہاں ہیں۔ ایک خط کا بھی تو جواب نہیں ملا۔
فرخ تمہارا بیٹا آٹھ سال کا ہو گیا ہو گا۔ خدا کرے وہ مجھے وطن واپس جانے پر مل سکے،

میں ضرور اس حسین وعدے کو پورا کروں گا جو تم نے مجھ سے کیا تھا۔

نو سال کی مدت ایک انسان کو بدلنے کے لیے خاصی طویل ہے۔ لیکن بیگم اشرف کے خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔ اس نے جو کچھ سوچا تھا، وہ پورا نہ ہو سکا۔ وہ اشرف کو کلبوں اور چھلکتے جاموں سے متعارف کرانا چاہتی تھی۔ لیکن یہ سب اس کی بھول تھی۔ گو وہ فریدہ کا ہر طرح خیال رکھتے۔ ان فرائض کو پورا کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتے جو ان پر عائد ہوتے تھے۔ لیکن جس رنگ میں فریدہ انہیں رنگنا چاہتی تھی۔ انہیں اس رنگ سے نفرت تھی اور ان کے درمیان اختلاف کی یہی سب سے بڑی وہ خلیج تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ انہیں دنیا کی کوئی طاقت نہیں بدل سکتی۔ شادی کے چند ماہ بعد ہی اُسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ اپنے انتخاب میں دھوکہ کھا گئی ہے۔ جذبات کی رو میں بہہ کر زندگی داؤ پر لگا بیٹھی ہے۔ وہ تو زندگی کو آزاد فضاؤں میں گذارنا چاہتی تھی۔ لیکن ڈاکٹر اشرف کے ساتھ ایسا ممکن نہ تھا۔

وہ شوہر کو اپنے نظریات کا قائل کبھی نہ کر سکی۔ لیکن اشرف کے خاندان سے نفرت کا جذبہ دن بدن بڑھتا گیا۔ اسما کے متعلق بھی وہ ڈاکٹر اشرف سے سُن چکی تھی اور یہ چیز اس کے جذبات کو اور بھی برانگیختہ کر چکی تھی۔

نیوز ریڈر کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ ہندوستان کی آزادی کے متعلق بتا رہا تھا کہ وہ علاقے جن میں مسلم آبادی کی اکثریت ہے مسلمانوں کو، اور جن میں ہندو آبادی کی اکثریت ہے ہندوؤں کو دے دیئے گئے ہیں۔ دنیا کے نقشے پر دو آزاد مملکتیں ابھری ہیں، پاکستان اور بھارت۔

''ہندوستان آزاد ہو گیا ہے۔ غلام ملک نے غلامی کی زنجیروں کو کاٹ پھینکا ہے۔

جالندھر۔ پاکستان میں شامل ہوا ہے یا بھارت کا ایک حصہ بنا ہے؟ خوشی سے اِن کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔

''فریدہ! فریدہ!''

اشرف نے پکارا۔لیکن وہ شاید مسز جانسن کے ہاں گئی ہوئی تھی۔سامنے قالین پر ان کی ایک سالہ بچی شیبہ کھیل رہی تھی۔سیاہ گھنے بالوں اور حسین آنکھوں والی اس خوبصورت بچی کو راہ چلتے انگریز مرد اور عورتیں بھی رُک کر پیار کرنے پر مجبور ہو جاتے۔بچی سے بڑے دولڑکے تھے جو دو دو تین تین دن زندہ رہنے کے بعد چل بسے تھے۔

بچی کھیلتے کھیلتے اچانک رونے لگی وہ تیزی سے اس کی طرف لپکا اور گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگے۔

تصور میں وہ ہندوستان پہنچے تھے سو سالہ غلامی کے بعد آخر تجھے نجات مل ہی گئی۔ مسلمانوں کو اپنا ایک دیس مل گیا۔میرے گھر والے جانے کہاں ہیں؟اسی جگہ ہیں یا کہیں اور چلے گئے ہیں؟''

بچی کو تھپکتے ہوئے وہ سوچوں میں ڈوبے رہے۔

وقت کے ہاتھ نے اپنی انگلیوں پر کچھ سال اور لپیٹ لیے۔اب ڈاکٹر اشرف بہت اُداس ہو چکے تھے۔جلد از جلد وہ پاکستان پہنچ جانا چاہتے تھے۔واپسی کے انتظامات مکمل کر لیے اور ایک دن وہ پاکستان آنے کے لیے اپنی بیوی تین بچوں شیبہ۔خالد اور عمر کے ساتھ سفر کر رہے تھے جن کی عمریں علی الترتیب سات، پانچ اور تین سال تھیں۔والٹن کا ہوائی اڈہ ایک نئی شان لیے نظر آیا۔یقیناً یہ شان آزادی کی ہی تھی۔

ہوائی اڈے پر فریدہ کی بہنیں استقبال کے لیے موجود تھیں۔چند دن وہ ان کے ساتھ رہے۔اب ان کے سامنے فوری طور پر رہائش کے لیے جگہ تلاش کرنا اور اپنے خاندان سے ملنا تھا۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد انہیں شہر کے ایک بہترین حصے میں ایک نئی اور خوبصورت کوٹھی مل گئی۔ جس کے ساتھ ہی زمین کا ایک وسیع و عریض قطعہ انہوں نے ہسپتال کے لیے بھی خرید لیا۔

اس طرف سے مطمئن ہو کر انہوں نے اپنے گھر والوں اور فرخ کے خاندان کا کھوج لگانا شروع کیا۔لیکن مغربی پاکستان اتنے بڑے بڑے شہروں پر مشتمل ہے کون جانتا تھا کہ وہ کس

شہر کے کس گوشے میں پڑے ہیں۔

انہوں نے پریکٹس شروع کر دی اور بہت جلد ان کی شہرت دُور دُور پھیل گئی۔خطرناک سے خطرناک اور مشکل سے مشکل آپریشنوں کے لیے تو وہ خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ہسپتال کی تعمیر کا کام بھی شروع ہو گیا۔اب انہیں لاہور میں سکونت اختیار کیے ایک سال ہو گیا تھا۔لیکن ابھی تک کوشش کے باوجود بھی انہیں اپنے اور فرخ کے خاندان کا کوئی سراغ نہ ملا تھا۔ہر ذریعے کو آزمایا جا چکا تھا۔لیکن جانے وہ کہاں تھے؟ کبھی کبھار تو وہ بے حد بے چین ہو اٹھتے۔یوں لگتا جیسے اب وہ کبھی ان محبوب انسانوں کی شکل نہ دیکھ سکیں گے۔

اسی تلاش میں ایک دن وہ بازار کا چکر لگا رہے تھے کہ کسی کو دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔تیزی سے اس کی طرف لپکے وہ ان کے گاؤں کا آدمی تھا۔کافی دیر اس سے باتیں ہوئیں۔لیکن گھر والوں کا ٹھیک پتہ وہ بھی نہ بتا سکا۔تاہم اس نے ایک راستہ ضرور دکھا دیا تھا۔

”تمہارا چھوٹا بھائی اسلم فوج میں میجر ہے۔وہ آج کل سیالکوٹ چھاؤنی میں ہے۔پچھلے دِنوں وہ مجھ سے وہاں ملا تھا۔“

صحرا میں بھٹکتے انسان کو نخلستان نظر آ گیا تھا۔پیاسے کو کنواں دکھائی دے رہا تھا اور راہ بھولنے والے کو منزل مل گئی تھی۔

وہ خوش تھے۔اتنے خوش کہ ان کی خوشی کا کوئی اندازہ نہ لگا سکتا تھا۔

”اسی وقت وہ سیالکوٹ کے لیے روانہ ہو گئے۔پوچھ گچھ کرتے جب وہ اسلم کی کوٹھی میں داخل ہوئے تو دل دھڑک رہا تھا۔خون جوش مار رہا تھا۔کسی ملاقاتی کی اطلاع پانے پر جب اسلم کمرے سے نکل کر باہر آیا تو بھائی پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔گردوپیش کو ایک بار غور سے دیکھا کہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے۔کیونکہ ایسے خواب دیکھنے کے وہ لوگ عادی ہو چکے تھے۔جسم پر زور سے چٹکی کاٹی۔تکلیف کا احساس ہوا۔سورج آج صبح مشرق سے طلوع ہوا تھا، یا مغرب سے۔اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔خواب کی سی کیفیت طاری تھی۔ایک نظر پھر سامنے ڈالی۔

ڈاکٹر اشرف کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ دیکھ رہے تھے ۔ضبط ختم ہو گیا تھا۔

''اسلم'' بازو پھیلائے وہ آگے بڑھے۔

''بھائی جان'' وہ ان کے بازوؤں میں سمٹ آیا۔طویل جدائی کا جما ہوا لاوا پگھل کر باہر نکلنے لگا اور وہ ان کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

نوکر نے صورتِ حال کی اطلاع فوراً بیگم اسلم کو دی وہ بھی حیران ہو کر نکلیں سامنے اشرف کو دیکھ کر پہلے تو مبہوت سی ہو گئیں ۔پھر تیزی سے بھاگ کر ان کے ساتھ لپٹ گئیں۔

یہ جمال کی بیٹی رضیہ تھی ۔غبار کچھ کم ہوا۔تو اُنہوں نے رضیہ کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے ان کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو بہہ نکلے۔

مصائب و آلام سے پُر حکایات ایک دوسرے کو سنائی گئیں۔

باپ اور پھوپھی کی موت کا سُن کر اشرف گنگ سے ہو گئے ۔ان کی موت کا ذمہ دار بلاشبہ وہ اپنی ذات کو سمجھے ۔لیکن اسلم نے عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے عائشہ اور شہاب الدین کی موت کا واقعہ کچھ اس انداز میں سنایا جو اتفاقیہ حادثے پر دلالت کرتا تھا۔لیکن اشرف کا دل مطمئن نہ ہو سکا۔

اور یہ جان کر انہیں ذرا بھی حیرانی نہ ہوئی کہ اسما نے کس طرح سے گھر والوں کے دلوں سے نفرت کے بیج نکالے۔اسما کے ساتھ ان کا روحانی اور دلی تعلق تھا۔وقت کے فاصلے اور مجبوریاں اس پیار میں حائل نہ ہو سکیں۔آج بھی وہ اسما سے اسی شدت سے پیار کرتے تھے۔

''عارف کیا کرتا ہے''؟

''وہ بھی فوج میں ہی ہے ۔کیپٹن ہے''۔

''مجھے تمہارے اور عارف کے متعلق یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ تم لوگوں نے اپنا مستقبل خود سنوار لیا ہے ۔''

''اب گھر کب چلنا ہے؟ انہوں نے بے چینی سے پوچھا۔

''میرا خیال اُنہیں پہلے اطلاع دینے کا ہے۔ یکدم یہ خوشی کی خبر شاید بی جان کیلئے اچھی نہ ہے''۔

تین دن بعد وہ اپنے تینوں بچوں اسلم اور اس کے بیوی بچوں کے ساتھ گاؤں جا رہے تھے۔ انہوں نے فریدہ کو بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا لیکن اس نے انکار کر دیا۔

کار انہیں سڑک پر روکنی پڑی کیونکہ آگے راستہ خراب تھا۔ ماں کو اپنے یوسفِ گم گشتہ کے آنے کی اطلاع مل گئی تھی۔ دیدار کی گھڑی آن پہنچی تھی۔ وہ اپنے اس لختِ جگر کو دیکھنے والی تھیں۔ جو انہیں ساری اولاد میں سب سے زیادہ پیارا تھا۔

امیر، جمال الدین، دین محمد اور ان کے بیوی بچے سبھی بے قراری سے باہر نکل آئے تھے۔ چھوٹے بچے جن کے لیے اشرف افسانوی شخصیت بنے ہوئے تھے۔ بیتابی شوق سے دور تک بھاگتے گئے۔

کیسا رقت انگیز منظر تھا۔ سولہ سال کا بچھڑا ہوا بیٹا ماں کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ سب کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

سب سے ملاقات ہوئی لیکن پھوپھی اور باپ کی کمی دل کو تڑپا تڑپا گئی۔ کان ''اشرف خان'' سننے کے خواہشمند تھے۔ لیکن پکارنے والی پیاری پھوپھی تو دوسری دنیا میں ڈیرے لگائے بیٹھی تھی۔

ابھی تک اشرف نے اسما کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ داہنی طرف رخ پھیرا تو وہ صغرا کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔

بہاروں کا حسن خزاؤں کی زد میں آ رہا تھا۔ آنسوؤں سے نم چہرے پر پاکیزگی اور تقدس کا نور تھا۔

اسما''

اُن کا باغی دل پکار اٹھا۔

پھر خود ہی چونک سے گئے۔ گھبرا اٹھے۔

جان وجگر سے پیارے انسانوں کے درمیان بیٹھ کران کا سارا دکھ، درد بے چینی اور اضطراب ختم ہوگیا۔ وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرر ہے تھے۔ یوں جیسے غموں کے انبار دھڑام سے گر گئے ہوں۔

''نکلو شیبہ جب کالج سے واپس آئے تو اسے میرے کمرے میں بھیج دیں''۔

ڈاکٹر اشرف نے اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا''۔

''بہتر''خادمہ نے جواب دیا۔

کمرے میں پہنچ کرانہوں نے خود کو آرام کرسی پر گرا دیا۔ آنکھیں بند کرلیں۔ بے پناہ تھکن محسوس ہو رہی تھی۔

ہسپتال مکمل ہو چکا تھا۔ وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوگیا تھا جسے جانے وہ کب سے دیکھتے چلے آئے تھے۔

اس مقصد کی تکمیل کے لیے ڈاکٹر اشرف کے غیر ملکی دوستوں اُن مریضوں جنہوں نے ان کے ہاتھوں سے شفا پائی تھی اور ان ڈاکٹروں نے جن سے ان کے گہرے مراسم تھے انہیں فراخ دلی سے عطیات بھیجے۔ ہم وطن صاحب استطاعت لوگوں سے بھی انہوں نے اپیل کی اور اپنی زندگی کا بھی سارا اثاثہ اس میں صرف کردیا۔ سات سال کی محنت شاقہ کے بعد انہیں اپنی کوششوں کا ثمر مل گیا۔ وہ ان سب لوگوں کے تہہ دل سے ممنون تھے۔ جنہوں نے اس کارخیر میں ان کی مدد کی تھی۔

ہسپتال کا نام کیا ہوگا۔ ابھی تک تقریباً سب اس امر سے لاعلم تھے۔

سنگِ بنیاد عمارت میں نصب کرنے کے بعد فوراً ڈھانپ دیا گیا تھا۔

جدید آلات وجراحی ،جدید مشینیں اور سامان باہر سے آچکا تھا۔ ہسپتال کے لیے مزید عملے کا تقرر عمل میں آچکا تھا۔ چھوٹے عملے کو چھوڑ کر ڈاکٹرز لیڈی ڈاکٹرز نرسیں اور دیگر عملے کی بھی

تقریریاں ہو چکی تھیں۔

ہسپتال کا افتتاح اب وہ جلد از جلد کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ کرائے کی کوٹھیوں میں ان کے مریض بہت تنگی محسوس کر رہے تھے۔

بیٹی کو مشورہ کے لیے بلایا تھا۔ آج وہ اسے بتانا چاہتے تھے کہ ہسپتال کا نام کیا ہوگا اور اس کا افتتاح کون کرے گا۔ بیٹی پر انہیں بے پناہ اعتماد تھا۔ گھر سے متعلق ہر بات وہ اسی کے مشورہ سے کرتے۔ بیگم اشرف تو اپنی اصلیت پر آ گئی تھیں۔ پارٹیاں، دعوتیں، کلب انہوں نے دل چسپی کے اور سامان تلاش کر لیے تھے۔ ڈاکٹر اشرف نے انہیں کئی بار سمجھایا بھی۔ لیکن حالات زیادہ بگڑتے دیکھ کر انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دیا۔ کیونکہ گھر کی فضا متاثر ہو رہی تھی۔

انہیں سب سے زیادہ بچوں کا فکر تھا۔ بڑے بچوں کو بھی یوں ماں کا ہر وقت گھومنا پھرنا اچھا نہ لگتا تھا۔

باب نمبر: 16

شیبہ کالج سے آئی تو ننکو نے ڈاکٹر صاحب کا پیغام دیا۔انھی قدموں سے وہ نیچے بھاگی۔کمرے میں پہنچ کر باپ کو یوں آنکھوں پر ہاتھ رکھے نیم دراز پایا تو تیزی سے ان کی طرف لپکی۔

''پاپا آپ ٹھیک ہیں؟''اس نے باپ کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے تیزی سے پوچھا۔

میں بالکل ٹھیک ہوں بیٹے۔ذرا تھکاوٹ ہو رہی ہے۔اؤ ادھر میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ انھوں نے کرسی آگے گھسیٹتے ہوئے محبت سے کہا۔

''پڑھائی کا کیا حال ہے؟''

باپ کے سوال کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے وہ بولی۔''پاپا! کثرت کار سے آپ کی صحت بہت متاثر ہو رہی ہے۔خدا کے لیے اتنا کام نہ کیجئے۔''اس کا چہرہ بڑا ہی افسردہ تھا۔

''میں ٹھیک ہوں: شاید تمھیں معلوم نہیں اس ماہ کی پندرہ کو ڈاکٹر سوئیل جو کنگ کالج لندن میں ریڈر ہیں اور ڈاکٹر ولسن جو گلاسکو کے ایک مشہور ڈاکٹر ہیں میری دعوت پر پاکستان پہنچ رہے ہیں۔میری خواہش ہے کہ ہسپتال کی رسمِ افتتاح ان کی موجودگی میں ہو۔''

''افتتاح کے لیے بلانے کا کسے ارادہ ہے۔پاپا! آپ نے تو ابھی تک نام کا بھی فیصلہ

نہیں کیا۔''

ہسپتال اسما کے نام پر ہوگا اور یہ فیصلہ آج سے سولہ برس قبل اس وقت کیا گیا تھا جب میری شادی تمہاری ممی سے ہوئی تھی۔اسما کی زندگی میرے لیے تاریکیوں میں جگمگانے والے چراغ کی مانند ہے اور زندگی سے مایوس مریضوں کے لیے یہ ہسپتال بھی اسی چراغ کی طرح ہوگا۔ جو دلوں میں زندگی کی آس پیدا کرتا ہے اور تاریکیوں کو نگل کر اجالا پھیلاتا ہے اور یہ بھی میری خواہش ہے کہ اسما ہی اس کا افتتاح کرے''۔

اسما پھوپھو کے نام پر پاپا؟ شدتِ جذبات سے اس کی آنکھیں بھیگ سی گئیں۔یہ فیصلہ بہت عظیم ہے لیکن وہ افتتاح ......''

مناسب الفاظ نہ مل سکے۔اور جملہ کو اُس نے ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے ڈاکٹر اشرف نے کہا۔

''تمہارا مطلب یہی ہے نا بیٹے کہ اُسے اس سوسائٹی کے آداب سے آگاہی نہیں وہ اس رسم کو ادا نہ کر سکے گی۔''

انہوں نے بیٹی کی طرف گہرے اضطراب سے دیکھا۔

''نہیں پاپا میرا مطلب یہ نہیں تھا''اس نے تیزی سے کہا۔

باپ کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی افسردگی اسے نظر آ گئی تھی۔وہ نادم تھی کہ کیا کہہ بیٹھی ہے۔

''تمہاری یہ سوچ غلط نہیں بیٹے!یہ کام تمہیں اور اسلم کو انجام دینا ہے۔رسم ادا کرنے کی تین چار بار اُسے عملی تربیت دینا۔وہ بہت ذہین ہے فوراً سمجھ جائے گی۔

اب تم کھانے سے فارغ ہو کر میرے پاس آؤ۔ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ہم گاؤں چلنے والے ہیں۔

''خالد کو بھی تیار ہونے کا کہہ دینا۔''

''سنو بیٹے!''انہوں نے شیبہ کو پکارا۔

''اپنی ممی کو میرے پاس بھیج دو۔''

فریدہ سے جب ڈاکٹر اشرف نے گفتگو کی تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ بپھرے ہوئے تیز لہجے میں بولی۔

''بچوں میں سے بھی تو کسی کا نام رکھا جا سکتا تھا۔وہ مر تو نہیں گئے۔''

''مجھے تم سے اتنی عامیانہ بات کی توقع نہ تھی فریدہ!انہوں نے بیوی پر نفسیاتی وار کیا۔

''میں عورت ہوں یہ سب چیزیں برداشت نہیں کر سکتی۔''

تم بھی عورت ہو اور وہ بھی ایک عورت ہے۔جس نے اپنی مانگ اجاڑ کر اس کا سیندور تمہاری مانگ میں بھر دیا۔آپے میں رہنا سیکھو فریدہ! مجھے اس منزل تک پہنچانے والے وہی لوگ تھے اور وہی لوگ میری زندگی ہیں۔ ڈاکٹر اشرف غصے سے چلا رہے تھے۔غصے سے پیر پٹختی ہوئی وہ باہر نکل آئی اور کمرے میں پہنچ کر بڑبڑانے لگی۔

''کوٹھیاں تو بنا دی ہیں۔کوٹھیوں میں رہنے بھی لگی ہیں۔لیکن کوٹھیوں میں رہنے کے سلیقے کہاں لے آئیں ہوں گے۔گنوار۔خیر کوئی بات دیہاتنیں میرے لیے وبال جان کوئی بات نہیں۔

انشاءاللہ ایسا تماشہ دکھاؤں گی کہ ڈاکٹر صاحب شرمندگی سے اپنا چہرہ نہ اٹھا سکیں گے۔ایسے موقعوں پر تو وہ لوگ بھی گھبرا جاتے ہیں جو ایسی تقریبات ہمیشہ دیکھتے چلے آتے ہیں۔افتتاح نہ ہوا مذاق ہوا اور مدعو بھی شہر کے معززین کو کیا ہے۔چلو ہم بھی تماشہ دیکھیں گے''۔

ڈاکٹر اشرف،شیبہ اور خالد کے ساتھ جب گاؤں پہنچے تو شام کے چھ بج رہے تھے۔رات انہوں نے والدہ سے بات کی۔ساری تفصیل سے انہیں آگاہ کیا۔فاطمہ کچھ دیر سوچتی رہیں پھر بیٹے کو دیکھتے ہوئے بولیں۔''اشرف اس بات کا فیصلہ تو اسماہی کر سکتی ہے۔''

شیبہ اور خالد نے اسما سے بات کی۔لیکن اس نے یکسر انکار کر دیا۔گھر کے سب افراد

نے زور لگایا مگر اس کی ایک ہی ''نہ'' تھی صورتحال کچھ اس قسم کی تھی کہ اسے کوئی مجبور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اشرف بہت پریشان تھے۔بالآخر انہوں نے خود بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

''اسما! میں اس قابل تو نہیں کہ تمہیں کسی بات پر مجبور کر سکوں۔لیکن یہ میری دلی خواہش ہے،تم مجھے یوں مایوس نہ کرو۔''

اس کا سر جھکا ہوا تھا کسی بھی بات کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

''اسما جواب دونا'' لہجے میں محبت تھی،درد تھا،تڑپ تھی۔

''اسما''

نگاہیں اٹھیں،ملیں اور پھر آنسوؤں کی دُھند میں اشرف کا چہرہ ڈوب گیا۔

''لیکن آپ نے اس مقصد کے لیے مجھے کیوں چُنا؟''

کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ اس سوال کا جواب خود اپنے آپ سے پوچھو۔انہوں نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

اور پھر یکدم بڑے جذباتی انداز میں بولے۔

''وہ ایثار تمہیں اس بات کا جواب دے گا جس نے تمہاری شخصیت کو جلا بخشی۔اپنے کردار کی عظمت سے پوچھو۔تم نے اپنی خواہشات اور آرزوؤں کو بھینٹ چڑھایا اور اپنے لیے محرومیاں گوارا کیں ......مجھ سے کیا پوچھتی ہو اسما۔''

''مجھے قربانی کی تشہیر پسند نہیں۔میں نے جو کچھ بھی کیا اس کے لیے مجھے کسی صلے کی ضرورت نہیں آشی!

میری عقیدت کو غلط رنگ نہ دو اسما! میں اس قابل کہاں کہ تمہیں صلے دے سکوں۔میں تو خود تہی دامن ہوں۔میرے پاس تو آنسوؤں اور آہوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔میں کسی کو کیا دے سکتا ہوں۔یہ تو میری ایک خواہش ہے اسما! میں تمہیں مجبور تو نہیں کر سکتا۔''

اسما خاموش رہی ۔اس کے دل میں طوفان اٹھ رہے تھے ۔کرب سے وہ سوچ رہی تھی کہ اگر میں دُکھی ہوں تو وہ کون سے سکھی ہیں ۔غموں نے اگر میرا سینہ چھلنی کر ڈالا ہے تو وہ کون سے بچے ہوئے ہیں ۔دراصل ہم دونوں ایک ہی آگ میں جل رہے ہیں ۔

''آشی''اس کا دل پکار اٹھا۔

''اشرف''اس کا رواں رواں پکارا۔

اشرف اس سے کچھ کہے اور وہ انکار کرے ۔یہ تو اس کے پیار کی توہین ہے ۔

''میں چلوں گی''اس نے اٹھتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

بیگم اشرف اسما کو دیکھ کر حیران ہی تو رہ گئیں اتنا معصوم اور پاکیزہ حسن اس حُسن پر اداسی مسلط تھی ۔لیکن یہ مغموم حُسن سب کے دلوں کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

وہ دن کتنا اہم تھا۔شہر کے معزز مہمان آ چکے تھے ۔تقریب کا وقت ہو رہا تھا باوجود یہ کہ اسما نے ایسی محفل میں پہلی بار شرکت کی تھی ۔لیکن وہ ذرا بھی ہراساں نہ تھی ۔

موسم کی مناسبت سے شیبہ نے اسما کے لیے بہترین لباس تیار کروایا تھا۔وہی لباس پہنے وہ سینکڑوں لوگوں کے جلو میں آگے بڑھی ۔دائیں ہاتھ شیبہ اور بائیں ہاتھ خالد اور اسلم تھے ۔باوقار قدم آگے بڑھتے گئے اور پھر انتہائی متانت سے اس نے فیتہ کاٹا۔

تالیوں کے شور میں وہ سیڑھیاں چڑھتی اس برآمدے تک پہنچ گئی ۔جہاں سنگ بنیاد سے اسے پردہ ہٹانا تھا۔بڑے ہی دلنشیں انداز میں اس نے پردہ کھینچ کر اکھاڑ دیا۔پریس فوٹو گرافروں نے تصاویر لیں۔

تقریب بحُسن وخوبی انجام پذیر ہوئی ۔بیگم اشرف کی جلن قابلِ دید تھی ۔جو تماشا وہ دیکھنے آئیں تھیں، وہ نہ ہوا۔

باب نمبر: 17

کلاک نے تین بجائے اور وہ چونک اٹھی ۔ پتہ ہی نہ چلا رات کیسے بیت گئی۔صوفے سے اٹھ کر بستر پر لیٹ گئی ۔اسما کا محبت بھرا دلکش سراپا اس کی نگاہوں کے سامنے ایک بار پھر اُبھر آیا۔

دل کی گہرائیوں سے احترام کا لبادہ اوڑھے چند الفاظ نکلے۔جنہوں نے اسما کی شخصیت کوخراجِ عقیدت پیش کیا۔

''اسما پھوپھو آپ سچ مچ بہت عظیم ہیں۔آپ جیسی عورت کے دامن پر تو فرشتے بھی سجدے کرتے ہوں گے۔ممی پاپا کی جیون ساتھی ضرور ہیں۔لیکن پاپا کے دل میں جو مقام آپ کو حاصل ہے وہ ممی کی رسائی سے کوسوں دُور ہے۔آپ کے نام پر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔گردن عقیدت سے جھک جاتی ہے۔

اور پھر کتنی ہی دیر وہ سوچوں میں ادھر اُدھر بھٹکتی رہی ۔بالآخر نیند کی دیوی نے دھیرے دھیرے اس کی پلکوں کو سہلانا شروع کر دیا۔

نو بجے جب اس کی آنکھ کھلی تو کلاک پر نگاہ پڑتے ہی وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔

''پہلا پیریڈ تو گیا۔یونیورسٹی پہنچتے پہنچتے دوسرا بھی مس ہو جائے گا۔اس نے آنکھیں ملتے ہوئے سوچا۔''

یونیورسٹی پہنچتے پہنچتے واقعی دس بج گئے ۔سیڑھیاں چڑھ کر وہ لیڈیز روم کی طرف جانے لگی۔ابھی راستے میں ہی تھی کہ سامنے سے اس کی بہترین دوست عطیہ آتی دکھائی دی۔راہ چلتے لوگوں تک کو اپنے مذاق کا نشانہ نہ بنانے والی شوخ وشریر عطیہ نے اسے دیکھا تو سر اور دیدوں کو مسخروں کے سے انداز میں ہلاتے ہوئے بولی ۔

نزول ہورہا ہے جناب کا،کچھ گڑ بڑ معلوم ہوتی ہے۔''

''تسلی رکھو چپکے چپکے میں گڑ بڑ نہیں کروں گی۔''

''اے بس رہنے دو۔''اس نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔

''جب وقت آئے گا تو کوئی یاد بھی نہ رکھے گا ۔ چپ چپاتے ڈولی میں بیٹھ کر پیا کے دیس سدھار جاؤں گی۔''

''عطی !تمہارے بغیر میرا ڈولی میں بیٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں۔''شیبہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''خود تو تمہیں ڈوبنا ہے ۔مجھے بھی کیا اپنے ساتھ ڈبوانے کا ارادہ ہے؟'' کیوں ڈولی میں بیٹھنے والے کیا ڈوب جاتے ہیں؟''شیبہ نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

ذہین بیگم،فطین بیگم ڈولی کو اٹھانے والے کہار اگر کمزور ہوئے بے چارے تو ڈولی کو گرنا ہی ہے ۔ڈولی گری تو تمہارے ساتھ میری ہڈیوں کا بھی سرمہ بنے گا۔

نہ بابا ہماری زندگی اتنی سستی نہیں،ہم باز آئے تمہارے ساتھ بیٹھنے سے۔''

''ارے ہاں تمہیں ایک بڑی اہم خبر سنانی۔'' عطیہ نے خوشی سے آنکھیں نچائیں۔کم بخت تو نے خاک اہم خبر سنانی ہے۔ہوگی وہی کسی کے رومانس وغیرہ کے متعلق میں نے آج فلاں کو فلاں کے ساتھ دیکھا۔یا آج فلاں فلاں سے ملا تھا۔عطی تجھے ان باتوں کے سوا اور کچھ سوجتا بھی ہے۔''

''آج کی خبر بہت اہم ہے۔اتنی اہم کہ تم سنتے ہی اچھل پڑو گی اور چہرہ پھول کی طرح

کھل اٹھے گا۔'' عطیہ نے اس کا بازو کھینچتے ہوئے کہا۔

''تو نے یہ باتیں کہاں سے سیکھ لی ہیں۔چل ہٹ چھوڑ میرا بازو۔''

''تو بھی کیا یاد کرے گی شیبہ سویٹ۔ارنا بھینسا۔پی۔ایچ۔ڈی کے لیے امریکہ جا رہا ہے۔''

''سچ''؟اس کی آنکھیں واقعی خوشی سے چمک اٹھیں۔

یہ دراصل ان کا ایک نیا لیکچرار تھا۔جسے ارنا بھینسے کا خطاب عطیہ نے دیا تھا۔بے تحاشا موٹا گہرے سیاہ رنگ کا یہ لیکچرار لڑکیوں کو یوں گھورا کرتا جیسے انہیں کھا ہی تو جائے گا۔لڑکیوں کی جان مصیبت میں تھی۔ان کا بس چلتا تو اس کی ڈگری وگری ضبط کر کے یونیورسٹی سے ہی نکال باہر کرتیں۔

اور پھر جب عذرا، فوزیہ، راحیلہ اور نغمہ اسے ملیں تو سبھی کی مارے خوشی کے باچھیں کھل رہی تھیں۔

آج انہوں نے کیفے ٹیریا میں بہترین چائے کا پروگرام بنایا۔

کیفے ٹیریا جانے ہی والی تھیں کہ نغمہ بھاگی بھاگی آئی۔

''سنو تو۔اس نے تیز تیز سانس لیتے ہوئے کہا۔

''اقبال سے سوڈیم لیمپ ٹوٹ گیا ہے۔ڈاکٹر رانا نے کہا کہ اسے سوڈیم پمپ کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔''

''بس بس منہ بند کرو اپنا مکھیاں پڑ جائیں گی۔'' نغمہ نے اس کے کشادہ دہن پر چوٹ کی۔

''یہ تو بُرا ہوا'' شیبہ نے دھیرے سے کہا۔

سات بہنوں کا اکلوتا بھائی غریب اور بیوہ ماں کی تمناؤں کا واحد سہارا۔

اقبال جوان کی کلاس کا بہترین طالب علم تھا۔شریف اور خوددار سے اس لڑکے کو بھی

لڑکیاں بہت اچھا سمجھتی تھیں ۔سوڈیم پمپ کی قیمت پانچ سو روپیہ ہے ۔اقبال یہ رقم کیسے ادا کرے گا ۔؟

منی کدھر ہے،فوزیہ نے پوچھا۔

منی وہیں ہوگی ۔جہاں اسے ہونا چاہیے ۔عشق ومحبت کے میدان میں،ہم پاس کورس اورسیکنڈایئر آرزز سے کیوں پیچھے رہیں ۔''راحیلہ نے طنز سے چوٹ کی ۔

سامنے سے منی چلی آرہی تھی ۔اسکا اصل نام رضوانہ تھا۔لیکن دُبلے پتلے جسم اور چھوٹے قد کی وجہ سے عطیہ نے اسے منی کہنا شروع کردیا تھا۔اب سبھی اسے مُنی کہتے تھے۔

''بیگم صاحبہ چھوئی موئی کی سواری کہاں سے چلی آرہی ہے؟ عطیہ نے ذرا تیز لہجے میں پوچھا۔

''بھئی میں مُنے کو اپنے گھر آنے کا راستہ بتا رہی تھی ۔''اس نے کمال اطمینان سے جواب دیا۔''توبہ اس لڑکی کے تو دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے۔ وہ تیرے گھر جائے گا لیکن کیا کرنے ۔''

نغمہ نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے پوچھا۔

کیوں جاتے ہیں لڑکیوں کے گھر منی نے جواباً پتھر پھینکا تھا۔

''منی تیری امی کو وہ گنگ سا پسند آجائے گا؟ ہائے اللہ سر پکڑ کر روئیں گی تیرے انتخاب کو۔''

عطیہ نے ہونٹ سکیڑے۔

''بھئی خبردار عطی جوتو نے اسے دوبارہ گنگ کہا۔یہ تو میرے دل کا معاملہ ہے۔کسی کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں ۔''مُنی نے سختی سے کہا۔

''لعنت ہے ایسے دل پر جوشتر بے مہار کی طرح دوڑتا پھرے۔میں تو پکڑ کر بھون ڈالوں ۔

دل کا کیا کام کہ صلاح مشورہ کیے بغیر کسی پر آ جائے۔"

عطیہ کی اس بات پر سب نے دل کھول کر قہقہہ لگایا۔

مُمی کا پارہ چڑھ رہا تھا۔لیکن شیبہ نے اُسے ٹھنڈا کر دیا۔

چائے پیتے ہوئے بھی شیبہ اقبال کے متعلق سوچ رہی تھی۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔کہ وہ کیسے اس کی مدد کرے؟ پانچ سو روپیہ اس کے لیے بالکل معمولی بات تھی۔لیکن ایک خوددار انسان کو احسان کے بارے جھکانا اسے سخت ناپسند تھا۔

کیوں نہ ڈاکٹر رانا سے بات کی جائے اس نے سوچا اور مطمئن ہو گئی۔

کیفے ٹیریا سے واپس آ کر وہ ڈاکٹر رانا کے کمرے میں گئی۔پُر خلوص شخصیت کے مالک ڈاکٹر رانا جنہوں نے زندگی کا ایک طویل حصہ کیمیائی تجربات و تحقیقات میں گذار دیا تھا۔جو فزیکل کیمسٹری و اورگینک'' کیمسٹری میں پی۔ایچ۔ڈی تھے۔طلبہ اور طالبات سے اس طرح حُسن سلوک سے پیش آتے جیسے کوئی باپ یا بڑا بھائی اپنے بچوں یا چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ پیش آتا ہے۔

شیبہ کو دیکھتے ہی وہ شفقت سے بولے۔

''کیسے آئی ہو شیبہ؟''

اور پھر جب شیبہ نے اقبال کے متعلق ان سے بات کی تو انہوں نے تعریفی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں تمہارے جذبے کی داد دیتا ہوں۔''

''سر! آپ اس سے کوئی اور مطلب آخذ نہ کیجئے گا۔انسان ہونے کے ناطے سے مجھے صرف اس سے ہمدردی ہے اور نہ ہی آپ اس کا کسی اور سے ذکر کیجئے۔ایک خوددار انسان کی خود داری کو کبھی ٹھیس نہیں لگنی چاہیے اور دوسرے یہاں تو معمولی باتوں کے بھی سکینڈل بن جاتے ہیں۔ آپ جانتے ہی ہیں۔''

ڈاکٹر رانا مسکرا دیے ۔پھر دھیمی آواز میں بولے ۔

”آج کل تو بال واقعی دھوپ میں سفید ہو رہے ہیں ۔لیکن میں انہیں دھوپ میں سفید نہیں کیئے ۔“انہوں نے بالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بات مکمل کی ۔

”میں تمھیں بڑی اچھی طرح سمجھتا ہوں ۔شیبہ کیمسٹری ڈپارٹمنٹ تم جیسی لڑکیوں پر ہمیشہ فخر کرتا رہے گا ۔“

باب نمبر: 18

کھٹ۔کھٹ۔کھٹ۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے قدموں کی مخصوص آواز سے ہی شیبہ سمجھ گئی۔کہ آنے والا کون ہے۔پردہ اٹھا۔ہلکی سرمئی ساڑھی میں ملبوس بیگم اشرف کمرے میں داخل ہوئیں۔ماں کو دیکھتے ہی وہ احتراماً کھڑی ہوگئی۔

"شیبہ! تیار رہنا۔پرسوں بیگم خان کے بیٹے کی بارات ہے۔" بیگم اشرف نے بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"شادی کہاں ہورہی ہے ممی؟"

"جسٹس اکرام کی بیٹی ثمینہ سے۔"

"ثمینہ سے؟" شیبہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"حیرانی کی کیا بات ہے لوگ تو دھن دولت دیکھتے ہیں،جائیداد دیکھتے ہیں یہ اشفاق کی دوسری شادی ہے۔وہ بھی ثمینہ جیسی چاندسی لڑکی کے ساتھ۔"

شیبہ کو تو سکتہ سا ہوگیا تھا۔اس نے ثمینہ کو دیکھا ہوا تھا اور اشفاق کو بھی۔زاغ کے منہ میں انگور یا حور کے پہلو میں لنگور والی بات تھی۔دنیا کتنی خودغرض ہوتی جارہی ہے۔اس نے بے اختیار سوچا۔تھوڑی دیر خاموش رہی۔بیگم اشرف سامنے دیکھتی رہیں اور پھر شیبہ کی طرف دیکھتے

ہوئے بولیں۔

''میری باتوں پر سنجیدگی سے غور کرو۔ہاشم تمہارے لیے بہترین انسان ثابت ہوگا۔''

ہاشم کے نام پر اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔لیکن ضبط کرتے ہوئے بولی۔

''ممی! بے جوڑ شادیوں کے نتائج کبھی اچھے نہیں ہوتے۔میرے اور اس کے خیالات میں کوئی مطابقت نہیں۔''

''جذباتی فیصلے ہمیشہ نقصان دہ ہوتے ہیں۔میں نے تمہارے پپا سے شادی کر کے کتنا سکھ پایا؟ زندگی میں تلخیاں اور زہر گھلا ہوا ہے۔عمر عزیز کا ایک حصہ غم کی شاہراہ پر چلتے چلتے بیت گیا۔کبھی کسی چھوٹی سی خوشی نے بھی تو دامن پکڑ کر نہ کھینچا۔اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ اس پھول کے کانٹے اتنے نوکدار ہیں کہ وہ انگلیاں چھوڑ دل کو بھی زخمی کر دیں گے تو میں کبھی اسے شاخ سے توڑ کر دامن میں نہ سجاتی۔تمہارے پپا صاحب اولاد ہیں۔لیکن آج بھی ان کے دل کی مسند پر اسما متمکن ہے۔اس ڈائن نے تو میری زندگی کو جہنم بنا ڈالا ہے۔''

''ممی کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ خود کو پپا کے سانچے میں ڈال لیں۔''شیبہ نے لجاجت سے کہا۔

''ہوں'' تاکہ زندگی کے جو چند دن اور گزارنے ہیں وہ بھی سکون سے نہ گذر سکیں،ان کی خواہشات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیتی تو اب تک کبھی کی گھٹ گھٹ کر مر کھپ چکی ہوتی، ایک وقت تھا جب مجھ پر بھی جذبات کا جنون تھا۔لیکن حقائق کے سامنے آنے سے مجھے معلوم ہوا کہ میں نے اپنے انتخاب میں دھوکہ کھایا ہے۔اسی لیے تمہارے لیے فکر مند ہوں۔''

''لیکن ممی آپ کو اس بات سے تو انکار نہیں ہونا چاہیے کہ وہ کثرت سے شراب نوشی کرتا ہے اور ہر روز اس کے ساتھ نئی لڑکی دیکھنے میں آتی ہے۔''قدرے برہمی کے انداز میں شیبہ نے کہا۔

''یہ سب کہنے سننے کی باتیں ہیں۔جوانی میں کبھی لوگ ایسا کرتے ہیں۔میں نے اسے

قریب سے دیکھا ہے۔تم جس سانچے میں اسے اور جیسے چاہو گی ڈھال لو گی اس میں لچک ہے۔ تمہارے پاپا کی طرح تناؤ نہیں۔اتنی لمبی چوڑی جائیداد کا اکیلا وارث،تم یہ کیوں نہیں سوچتیں؟'' انہوں نے بیٹی کے غصے کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''میرے نزدیک دولت کی کوئی حیثیت نہیں۔''اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''تم پاگل ہو گئی ہو۔''وہ زور سے چلائیں۔

''ان جاہل اور اجڈ لوگوں کے دقیانوسی خیالات تم پر بھی اثر کر گئے ہیں۔میں اس لیے ان لوگوں کے پاس تمہیں زیادہ بھیجنے کے حق میں نہیں۔پکڑ کے لڑکی کا ستیاناس کر دیا؟''یہ کہتی ہوئی بیگم اشرف دروازے کی طرف بڑھیں۔

شیبہ کا ذہن سلگ اٹھا تھا۔''دولت۔جائیداد''ہوں!انسانیت اور اعلیٰ کردار تو گئے جہنم میں۔گویا میری شادی انسان سے نہیں ہو گی بلکہ لمبی چوڑی جائیداد سے ہو گی۔خیر دیکھا جائے گا۔کم از کم اس گھر کی دہلیز پر ہاشم میرا دولہا بن کر نہیں آئے گا۔''عزمِ صمیم اس کے چہرے سے جھلک رہا تھا۔

شام ہو رہی تھی وہ کتابیں اٹھا کر باہر لان میں آ گئی نیلے، پیلے، سفید، گلابی اور سُرخ پھول مسکرا مسکرا کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔کتابیں گھاس پر رکھتے ہوئے وہ پھولوں کے کنج کے قریب بیٹھ گئی۔خوبصورت پھولوں کو اپنے رخساروں سے مس کرتے ہوئے بولی۔''تم اور تمہاری دنیا کتنی حسین اور پُرکشش ہے۔تم دنیا میں صرف خوشی اور مسرت کا احساس دینے کے لیے ہی پیدا ہوتے ہو۔خوشبو بکھیرنے اور چمن کی رونق دوبالا کرنے کے لیے ہی جنم لیتے ہو۔لیکن لوگ کتنے خود غرض ہیں جو خوشبو سے لطف اندوز ہونے کے چند لمحوں بعد ہی تمہیں مسل ڈالتے ہیں۔''

ہلکی ہلکی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔تھوڑی دیر بعد وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ریڈنگ نوٹ کرنے میں مصروف تھی۔اس کی محویت کو نوکر کی آواز نے توڑ دیا۔نگاہیں اٹھا کر دیکھا،تو سامنے بوڑھا نوکر کھڑا تھا۔

''کیابات ہے بابا؟''اُس نے نرمی سے پوچھا۔

نوکر نے سفید رنگ کا چھوٹا تعارفی کارڈ اسے تھمادیا۔جس پر دیدہ زیب سیاہ حروف میں چھپا ہوا تھا۔

''فلائیٹ لیفٹیننٹ ڈاکٹر منیب فرخ۔

پاکستان ایئر فورس''

''شیبہ بی!وہ بڑے صاحب کی امی کے پاس سے آئے ہیں۔انہوں نے کچھ چیزیں آپ لوگوں کے لیے بھیجی ہیں۔''

دادی اماں کے پاس سے آئے ہیں۔کاپی وہیں پھینک خوشی سے آنکھیں جھپکاتی ہوئی تیزی سے بولی۔

''انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔میں ابھی آرہی ہوں''۔

کتابوں کو جلدی جلدی سمیٹا۔ننکو کو چائے تیار کروانے کا کہتے ہوئے وہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی۔اندر داخل ہونے سے قبل اسے یونہی خیال آیا۔''دیکھوں تو بھلا''۔پردے کے دونوں پٹ ہاتھوں سے آہستگی سے پکڑ کر دھیرے سے اس نے اندر دیکھنے کے لیے راستہ بنایا۔تو سامنے والے صوفے پر ستائیس،اٹھائیس سالہ ایک صحت مند نوجوان سانولے چہرے پر باوقار آگہی کے تاثرات لیے ریڈرز ڈائجسٹ کے صفحات الٹتے پلٹتے دیکھا۔

پردہ ہٹا کر وہ کمرے میں داخل ہوئی۔قدموں کی آہٹ پر نوجوان کی نگاہیں اٹھیں اور احتراماً وہ کھڑا ہوگیا۔شیبہ کو ان نگاہوں میں بے پناہ ذہانت سنجیدگی اور کچھ غرور کی ملی جلی کیفیت نظر آئی۔

''تشریف رکھیے۔''وہ دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''کیا ڈاکٹر صاحب گھر نہیں ہیں؟''نوجوان نے نگاہیں اٹھائے بغیر پوچھا۔

''جی نہیں''

''دادی اماں اور اسما پھو پھو ٹھیک تھیں۔'' اس نے دھیرے سے پوچھا۔

''وہ ٹھیک تھیں۔انہوں نے کچھ چیزیں آپ لوگوں کے لیے بھیجی ہیں۔اچھا اب مجھے اجازت دیجئے'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ ٹپٹا سی گئی۔سوچ کر آئی تھی کہ کتنی ہی باتیں ان لوگوں کے متعلق پوچھے گی۔لیکن آنے والے کی شخصیت اتنی پُر وقار اور رکھ رکھاؤ کی تھی کہ وہ کچھ بھی تو نہ پوچھ سکی۔گھبرا کر اس کے منہ سے نکلا۔

''دیکھئے چائے تیار ہو رہی ہے۔آپ پی کر جائیے۔'' نوجوان اس کی دادی اور پھوپھو کے پاس سے آیا تھا۔چائے پلائے بغیر بھیجنا اسے کسی صورت گوارا نہ تھا۔

آپنے تکلیف کی۔چائے کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔'' اس نے شیبہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اس چہرے پر پھیلی پریشانی اور گھبراہٹ دیکھ کر وہ بیٹھ گیا۔

نکلو چائے لے آئی۔تپائی کے سامنے بیٹھ کر وہ چائے بنانے لگی۔لرزتی پلکیں اٹھاتے ہوئے اس نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے نوجوان کو دیکھا۔جو دائیں طرف تجریدی آرٹ کے ایک شاہکار کا عمیق نظروں سے جائزہ لے رہا تھا۔

''دودھ'' اس نے آنکھوں پر جھکی پلکوں کے پردے گراتے ہوئے پوچھا۔

آواز کی نغمگی اسے آرٹ کی دنیا سے کھینچ لائی۔استفہامیہ نگاہوں سے سامنے دیکھا۔

جہاں ایک خوبصورت اور نازک ہاتھ دودھ دان پکڑے اس کے جواب کا منتظر تھا۔

''دودھ مت ڈالیے۔اور شکر صرف آدھا چمچ''۔

مدھم سی مسکراہٹ ضبط کے باوجود اس کے گداز گلابی ہونٹوں پر بکھر گئی۔چائے بغیر دودھ کے تبھی چہرے پر گھٹائیں سایہ کیے ہوئے ہیں۔

۔''گھٹائیں گہری نہیں ہلکی ہیں۔'' دل نے فوراً صفائی پیش کی۔

اب ثانیہ نو وارد نے یہ بکھرا ہوا تبسم دیکھا۔کچھ نہ سمجھ سکا کہ کیا بات ہے اور کب ہونٹوں

سے لگا لیا۔

خالی کپ تپائی پر رکھتے ہی وہ کھڑا ہو گیا۔بغیر کسی طرف دیکھے' خود اعتمادی سے قدم اٹھاتے ہوئے خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔

ننکو کو برتن کو اٹھانے کا کہہ کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔میز پر کتابیں اٹھنے گئی۔تو کاپی کے ساتھ ہی پڑا تعارف کارڈ نظر آیا۔بغیر کسی ارادے کے اس نے اٹھا لیا۔

''منیب فرخ۔کیسا عجیب سا نام ہے۔لیکن پیارا بھی ہے۔''

سراپا نگاہوں کے سامنے آ گیا۔''آنکھوں میں کتنا گہرا غرور چھلک رہا تھا۔دادی اماں کا واقف کیسے ہے؟''اس نے خود سے پوچھا۔

باب نمبر: 19

اتوار کا دن ہے۔ صبح کے سات بجے ہیں۔ اشرف لاج کے ڈائننگ روم میں اس وقت گھر کے افراد ناشتہ کی میز کے گرد جمع ہیں۔ سامنے والی کرسیوں پر ڈاکٹر اشرف خالد اور بیگم اشرف۔ دوسری طرف شیبہ۔ عمر اور داہنی ہاتھ عامر بیٹھا ہوا ہے۔ دودھ میں اوولٹین ڈالتے ہوئے شیبہ نے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

پپا تین چار دن تک یونیورسٹی بند ہونے والی ہے۔ میرا ارادہ یہ چھٹیاں گاؤں گذارنے کا ہے"۔

"ضرور بیٹے" ڈاکٹر اشرف نے بیٹی کو محبت سے دیکھ کر کہا۔

چند دن بعد یونیورسٹی بند ہوگئی۔ شیبہ کے لیے دن گزارنے دوبھر ہو رہے تھے۔ وہ جلد از جلد گاؤں پہنچ جانا چاہتی تھی۔ وہ آج بازار بھی جانا چاہتی تھی۔ خالد ہفتہ کو واپس رسالپور جا رہا تھا۔ اس کے لیے کچھ چیزیں خریدنا تھیں اور گاؤں والوں کے لیے بھی کچھ تحفے تحائف لینے تھے۔

پیسے دیکھے تو کم تھے۔ سوچا کہ پاپا سے پیسے بھی لے آئے اور انہیں جانے کے متعلق بھی بتا آئے۔

ڈاکٹر اشرف اس وقت ہسپتال میں تھے۔ پائیں باغ سے ہوتی ہوئی وہ اس باڑ تک جا پہنچی جو اشرف لاج اور اس ہسپتال کے درمیان حد فاصل بنا ہوا تھا باڑ میں ایک چھوٹا سا موگا تھا۔

جس میں سے ایک آدمی بمشکل دوسری طرف جا سکتا تھا۔باہر کے چکر کاٹ کر جانے کی نسبت اس نے یہیں سے جانا پسند کیا۔

ٹہنیوں سے بچ بچا کر وہ موگے میں سے نکل کر ہسپتال کی حدود میں آ گئی۔اس کے باپ کا عزم، ایثار،لگن اور روحانی محبت کا زندہ ثبوت ''اسما ہسپتال'' ایک وسیع دومنزلہ عمارت کی شکل میں اس کے سامنے تھا۔تیز تیز قدم اٹھاتی وہ ڈاکٹر اشرف کے کمرے تک پہنچ گئی۔اندر کی طرف دروازے کو ہلکا سا دھکا دے کر کمرے میں داخل ہوئی تو ڈاکٹر اشرف کو تیز برقی روشنی میں کسی ایکسرے کا معائنہ کرتے ہوئے پایا۔بیٹی پر نظر پڑتے ہی وہ کھل اٹھے۔

باپ کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے کہنیاں میز پر ٹکالیں اور چہرے کو ہاتھوں کے ہالے میں لیتے ہوئے بولی۔

''پاپا آپ نے گاؤں جانے کے متعلق کچھ بتایا ہی نہیں۔''

''بیٹے مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔چھٹیاں ہو گئی ہیں تو ٹھیک ہے۔لیکن تمہارے ساتھ کون جا رہا ہے؟''انہوں نے پوچھا۔

''عمر''!

معنی خیز مسکراہٹ سے اس نے باپ کی طرف دیکھا۔ڈاکٹر اشرف مسکرائے اور دراز سے چیک بک نکال کر تین سو کا چیک اُسے دیتے ہوئے شفقت سے بولے۔ٹھیک ہے''۔

''جی ہاں پاپا!شکریہ''

کمرے میں پہنچ کر اس نے عطیہ کو آنے کے لیے فون کیا اور خود چیزوں کی فہرست تیار کرنے لگی۔تقریباً آدھ گھنٹے بعد وہ عطیہ کے ساتھ بازار جا رہی تھی۔

ہاتھوں میں کتنے ہی بنڈل اٹھائے وہ دونوں کپڑے کی ایک دکان سے باہر نکل رہی تھیں۔

جب ثمینہ نے اسی نوجوان کو جیپ سے اُتر کر اپنی طرف آتے دیکھا۔فضا ئیہ کی گرمائی

یونیفارم میں وہ اتنا وجیہہ اور باوقار لگ رہا تھا کہ دونوں اپنی جگہ ٹھٹھک کر رہ گئیں۔فلیٹ کیپ اس کی پیشانی پر جھکی ہوئی تھی۔اس نے قریب آ کر ایک ثانیہ کے لیے شیبہ کی طرف دیکھا اور پھر کسی قدر بے اعتنائی سے قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔شیبہ کو اس کی آنکھوں میں دیا۔دل میں نفرت کی لہر سی اٹھی۔اتنا بھی زعم کیا۔خود سے بولی۔

''اتنا مغرور اور بد دماغ انسان۔اس نے ہونٹ سکوڑتے ہوئے اپنے دل میں کہا۔

عطیہ اس کے رویے سے نجانے کیا سمجھی۔ٹھوکا دیتے ہوئے ہنس کر بولی۔

''کب تک بھٹکتی رہوگی؟اب چلو وردی والا تو کبھی کا جا چکا ہے''۔

''کیا کہا تم نے؟''اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جو کہنا تھا کہہ دیا۔اب تو صرف وردی والے کے متعلق جاننا چاہتی ہوں''۔

کس غلط فہمی میں پڑ گئی ہو عطی''۔شیبہ نے خود کو بچاتے ہوئے تیزی سے پوچھا۔

''غلط فہمی کیسی؟حقیقت کو جان گئی ہوں۔''ویسے مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی۔''

''کیسی اُمید نہ تھی۔میں نے کیا کہا ہے؟''اس نے گھبراتے ہوئے تیزی سے پوچھا۔''

''یہی کہ ایسے رشتے دوستوں کے مشورے کے بغیر پروان چڑھتے اچھے نہیں لگتے۔''

عطیہ نے اس طرف گہری نظروں سے دیکھا۔

تیرا بیڑا غرق ہو۔کن رشتوں کو پروان چڑھا رہی ہے تو۔شیبہ نے تلخی سے کہا۔

''اچھا چھوڑو میرا تعارف کرا دو''۔معنی خیز نظروں سے اس نے شیبہ کو دیکھا۔

''کچھ پاگل ہوگئی ہو۔کس کا تعارف چاہتی ہو۔''

''وردی والے کا۔''عطیہ شوخی سے بولی۔وردی والے تو یہاں سے کئی گزرے ہیں۔اب مجھے الہام تو ہوا نہیں کہ تم کس سے متعارف ہونا چاہتی ہو۔''

''ٹھیک ہے۔لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے ہیں۔کل بتادوں گی سب کو اس نے کسی سے دل کا ناطہ جوڑ لیا ہے۔پوچھ لو اس سے وہ کون ہے؟اور پھر جب سب پنجے جھاڑ کر

تمہارے پیچھے پڑیں گی تو دیکھوں گی کیسے نہیں بتاؤ گی۔"

"اللہ تم نے تو بات کا بتنگڑ ہی بنا ڈالا۔کوئی بات ہو تو بتاؤں بھی۔یہ نوجوان چند روز ہوئے ہمارے گھر آیا تھا۔دادی اماں نے اس کے ہاتھ کچھ چیزیں بھیجی تھیں۔بس اتنی سی بات ہے۔ویسے باوقار شخصیت کا مالک ہے۔چلتا تو یوں تھا۔جیسے ساری دنیا اسی کی جاگیر ہو۔"

باب نمبر: 20

وہ آج کل بہت خوش تھی ۔ گاؤں کی کھلی فضا میں اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرتی ۔عمر کے ساتھ سیر کے لیے نکل جاتی ۔فطرت کے حسین مناظر سے آنکھوں اور روح کو تازگی بخشنے کے بعد جب وہ واپس آتی تو اسما کو دودھ بلوتے دیکھتی ۔ان دونوں پر منظر پڑتے ہی اسما کی آنکھوں میں محبت کی تیز چمک پیدا ہوتی اورلبوں پر شیریں مسکراہٹ ابھر آتی ۔شیبہ ان کے قریب چلی جاتی ۔ڈبل روٹی کے توسوں پر تازہ مکھن اور شہد لگا کر وہ خود بھی مزے لے کر کھاتی اوراسما کو بھی کھلاتی ۔

چاندنی راتوں میں وہ اسما کے ساتھ کھلے میدان میں باہر نکل جاتی ۔ جہاں گاؤں کی دوسری عورتوں کا ایک جم غفیر ہوتا ۔ جوان لڑکیاں آنکھ مچولی کھیلتی دائرے کی شکل میں بھنگڑا ڈالتیں ۔کورس کی شکل میں لوک گیت اتنی پیاری آواز سے گاتیں کہ اس کے دل میں جلترنگ سا بجنے لگتا ۔ان گیتوں میں جانے کیسا سحر تھا ؟جانے کیوں اسے اتنا سوز و گداز محسوس ہوتا ۔اس کا دل چاہتا گیت کبھی ختم نہ ہوں اور یوں ہی رات بیت جائے ۔

مدھری ایک چاندنی رات میں وہ اسما کے بازو پر سر رکھے اس کے ساتھ لیٹی ہوئی باتوں میں محو تھی ۔اسما نے اس سے کہا ۔

’’رانی کل ہم شہر چلیں گے ۔وہاں تم میری عزیز دوست سے ملو گی اس کا بھانجہ بھی ڈاکٹر

ہے۔''

وہ چونک اُٹھی ۔''کہیں یہ وہی ڈاکٹر تو نہیں ۔اس نے تیزی سے سوچا''۔

خاکی وردی میں ملبوس دلکش شخصیت والا نوجوان اس کے تصور میں ابھرا۔ذہین آنکھیں غرور کا گہرا احساس لیے یاد آئیں۔

اگلے دن وہ اسماء کے ساتھ شہر جا رہی تھی ۔یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔جو ان کے گاؤں سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ان کا تانگہ مختلف کشادہ گلیوں سے گذرتا ہوا ایک خوبصورت سے مکان کے سامنے رک گیا۔تانگے سے اتر کر وہ اسما کے ساتھ مکان کی طرف بڑھنے لگی۔دروازہ اندر سے بند تھا۔

دروازے پر لگی نیم پلیٹ پر اس نے بعینہٖ وہی حروف لکھے دیکھے۔جو تعارفی کارڈ پر درج تھے۔دستک کی آواز پر ایک معمر خاتون نے دروازہ کھولا اور شیبہ کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ منیب کی خالہ روشن ہیں۔اسما پر نظر پڑتے ہی وہ ان سے بغل گیر ہو گئیں۔کچھ سننے اور جاننے کی شاید ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔جیسے جنم جنم کی واقف ہوں۔اس کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے اسما سے مخاطب ہوئیں۔

''یہ شیبہ ہے نا! بہت پیاری بچی ہے۔''

یونہی بازوؤں کے حلقے میں گھیرے وہ اسے نشست گاہ میں لے آئیں۔اسما پھوپھو تو بیٹھتے ہی ان کے ساتھ باتوں میں لگ گئیں اور اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ڈرائنگ روم کی دیواروں پر ہلکا نیلا رنگ بکھرا پڑا تھا۔اِدھر اُدھر بھٹکتی نظریں آتش دان پر جا ٹھہریں۔گاؤن پہنے منیب کی تصویر مردانہ وقار لیے مسکرا رہی تھی۔اس نے گہری نظروں سے تصویر کا جائزہ لیا۔سانولا رنگ کہیں دُور چھپا بیٹھا تھا۔پُر کشش نقوش کے ساتھ ذہین آنکھیں شوخی لیے مسکرا رہی تھیں۔اچانک یوں محسوس ہوا جیسے تصویر کی آنکھیں اُسے گھور رہی ہوں۔اس احساس سے ہی اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔پیشانی پر پسینے کے قطرے نمایاں ہو گئے۔چور نگاہوں سے اسما اور خاتون کو

دیکھا اور انہیں دنیا مافیہا سے بے خبر باتوں میں مشغول پا کر خدا کا شکر ادا کیا۔

''ان کی باتوں کا لامتناہی سلسلہ تھا۔ دنیا جہان کے موضوعات زیر بحث تھے لیکن وہ بے حد بوریت محسوس کر رہی تھی۔ آخر اُکتا کر کھڑی ہو گئی۔

''کیوں بیٹی اکتا گئی ہو؟'' ۔ دراصل یہاں تمہاری عمر کا بھی تو کوئی نہیں۔''

جواباً وہ مسکرا دی اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل کر صحن میں آ گئی۔

آنگن میں بکائن کا درخت تھا۔ لیکن صفائی کا یہ عالم کہ کیا مجال ایک پتہ بھی فرش پر ہو۔ چار ایزی چیئرز صاف ستھرے برآمدے میں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ کونے میں چھوٹی گول میز پر فلپ کا ٹرانسٹر سیٹ رکھا تھا۔ اس نے ریڈیو کھول دیا۔ گانے آ رہے تھے۔ ڈرائنگ روم کے ساتھ تین اور کمرے تھے جن کی کھڑکیاں برآمدے میں کھلتی تھیں۔ پردے ہٹا کر شیبہ نے اندر جھانکا تو ایک کھانے کا کمرہ تھا اور دوسری خواب گاہ تھی۔ دونوں کمروں میں بیش قیمت سامان قرینے سے سجا ہوا تھا۔ سامنے کی طرف ایک اور کمرہ تھا۔ پردہ ہٹا کر دیکھا تو فوراً سمجھ گئیں۔ کس کا کمرہ ہے۔ سامنے رائٹنگ ٹیبل پر منیب کی تصویر خوبصورت فریم میں سے جھانک رہی تھی۔

شیلف میں بیش قیمت کتابیں چنی ہوئی تھیں بڑے بڑے پھولوں والا سرخ قالین فرش پر بچھا ہوا تھا۔ دائیں طرف صوفہ اور بائیں طرف پلنگ سامنے شیشے کی الماریوں میں بے شمار کتابیں اس کی توجہ کھینچ رہی تھیں۔ الماریوں میں تالے پڑے تھے۔ ہاتھوں سے پکڑ پکڑ کر جھٹکے دیئے لیکن مضبوط تالے بھی کبھی یوں کھلتے ہیں۔ حسرت سے بھرپور نظر شیشوں میں بند کتابوں پر ڈالی اور دل مسوس کر رہ گئی۔

اسے ابھی شبِ سرما جیسی لمبی دوپہر کاٹنی تھی۔ سو کر نہیں جاگ کر اور یہ دوپہر ایک دلچسپ کتاب کے بغیر گذارنی اُسے موت نظر آ رہی تھی۔ اچانک اس کی نظر ڈیل کارنیگی کی کتاب:۔ How Tho Wim Friends پر پڑی۔ وہ ایک مدت سے اس کی تلاش میں تھی۔

چابی تلاش کرنے کیلئے دراز کو ٹٹولا۔اور بہت سی چیزیں کھنگال لیں۔لیکن چابیاں نہ ملنا تھیں نہ ملیں،مصیبت اور یہ آن پڑی کہ اس کا ہاتھ سیاہی کی دوات سے ٹکرا گیا۔ڈھکن شاید بند نہیں کیا گیا تھا۔دوات جو لڑھکی تو خوبصورتی گلابی میز پوش پر نیلا دریا بہا گئی۔اس کا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔میز پوش کا ستیاناس ہو گیا تھا۔میز پر موجود کئی اور چیزیں اس کی لپیٹ میں آ گئی تھیں۔پریشانی تھی اب کیا کیا جائے۔

فوراً اس نے اپنے دستی رومال سے سیاہی کو جذب کرنا شروع کر دیا۔اخبار کا ایک صفحہ اٹھا اس نے ساری جگہ پر بچھا دیا۔جہاں سیاہی کے دھبے پڑ گئے تھے۔واپس جانے کے لیے مڑی۔کیلنڈر کے ساتھ چابیوں کا چھوٹا سا گچھا نظر آیا۔اسے بے تحاشہ غصہ آیا۔

"لعنت ہے تم پر یہاں لٹک رہی ہو" اس نے چابیوں کی طرف یوں دیکھا جیسے اصل مجرم وہی ہوں اور کمرے سے نکل گئی۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ سوچ رہی تھی اب کیا کرے۔دبی زبان میں اس نے اسما سے چلنے کے لیئے بھی کہا۔

"رانی ٹھنڈے میں گھر جائیں گے۔ابھی باہر نکل کر مرنا ہے۔"

"نہیں بیٹے باہر تو آگ برس رہی ہے۔جاؤ منیب کے کمرے سے کوئی پڑھنے والی کتاب لے لاؤ۔اٹھو اٹھو بیٹے۔" روشن نے زور دیتے ہوئے کہا۔

"کمرے میں جانے سے میرے کرتوت کا پکا ثبوت انہیں مل جائے گا۔" شیبہ نے پریشانی سے سوچا۔

لیکن اب بھی تو ثبوت ہی ثبوت ہے۔ان کے گھر میں کون سے بچے ہیں جنہوں نے سیاہی گرانا تھی۔" دماغ نے کہا۔

"سیاہی خادمہ سے بھی تو گر سکتی ہے۔" دل نے تاویل پیش کی۔

"اس کمرے کی صفائی اگر روشن کرتی ہوئی پھر۔" ذہن نے سوال اٹھایا۔

وہ مصیبت میں پھنس گئی تھی۔ جھلا کر خود سے بولی ''جہنم میں جائے سب کچھ میں نے کوئی جان بوجھ کر گرائی ہے۔ یہی کہیں گے ما کہ لڑکی پھوہڑ ہے اور کیا ہو سکتا ہے؟ اب اس میں میرا کیا قصور۔ خواہ مخواہ دوپہر بھی بوریت میں گزاروں۔''

روشن کتاب کے لیے اُسے پھر کہہ رہی تھی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی، گچھا اُتارا اور فوراً الماری سے کتاب نکال لائی۔

شام کو انہوں نے اس چھوٹے سے لان میں چائے پی جو گھر کے پچھلی طرف تھا۔

یہاں اس نے اتنے خوبصورت پھول دیکھے کہ حیران ہی تو رہ گئی۔ ایسے پھول تو اس کے پائیں باغ میں بھی نہ تھے۔ جب وہ واپس آئیں تو ان کے رکھ رکھاؤ، نفاست، سلیقے اور تہذیب و شائستگی کا اندازہ لگا چکی تھی کہ وہ انتہائی مہذب اور خاندانی لوگ ہیں۔ راستے میں اسما نے ان کے متعلق بہت سی باتیں بتائیں۔ لیکن منیب کے متعلق جو تاثر ایک بار اس کے دماغ میں جگہ پا گیا۔ وہ اپنی جگہ ویسے ہی قائم رہا۔

باب نمبر: 21

چلچلاتی دھوپ میں منیب سر سے لے کر پاؤں تک پسینہ میں نہا رہے تھے۔اپنے اندر زمانے بھر کی حرارت لیے سورج کا آتشیں گولا دنیا کو جلانے پر تلا ہوا تھا۔ان کی پیشانی پر بار بار پسینہ کے قطرے ابھر آتے۔رومال سے انہیں صاف کرتے۔لیکن چند ہی لمحوں بعد پھر وہی حال ہوتا۔پچھتا رہے تھے کہ کار میں کیوں نہ آئے۔خوامخواہ اتنا عذاب برداشت کرنا پڑا۔گھنٹی بجائی خادمہ نے دروازہ کھولا اور انہیں دیکھتے ہی کھل اٹھی۔

''ماما کہاں ہیں؟''انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے خادمہ سے پوچھا۔

''میاں وہ تو احمد حسن صاحب کے ہاں تھوڑی دیر ہوئی گئی ہیں۔ان کا چھوٹا بچہ کافی دنوں سے بیمار ہے۔''

خادمہ نے شربت بنایا۔ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پی کر ذرا سا سکون محسوس ہوا۔کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔پھر خادمہ سے چابی لے کر کمرے کی طرف بڑھے۔

روشن ان کے کمرے میں ہمیشہ تالا ڈلوائے رکھتیں۔ان کے ہاں پڑوس کے بچے اکثر آتے رہتے تھے۔بچے شرارتی تو ہوتے ہی ہیں۔منیب کے کمرے میں گھس کر کتابوں کو الٹ پلٹ کرتے رہتے۔چنانچہ اسی وجہ سے وہ کمرہ ہمیشہ بند رکھواتیں۔ہفتہ میں ایک دو بار سارے کمرے کی صفائی وغیرہ کروا دیتیں۔جس دن شیبا اسما کے ساتھ ان کے ہمراہ آئی۔اس دن خادمہ کمرے کی

صفائی سے ابھی فارغ ہی ہوئی تھی ۔ان کے آنے کی افرا تفری میں وہ تالا ڈالنا بھول گئی تھی ۔شام کو اس نے کمرہ بند کر دیا۔

کمرہ کھول کر وہ اندر آ گئے ۔رائٹنگ ٹیبل پر نگاہ پڑی تو کتابیں زبانِ حال سے فریاد کر رہی تھیں کہ ہمیں کسی نے پکڑ پکڑ کر دیکھا ہے ۔چند ایک شیلف میں پڑی تھیں ۔دو ایک میز کے ایک طرف تھیں ۔تین چار دوسری طرف رکھی ہوئی تھیں ۔میز کی باقی چیزیں بھی تلپٹ تھیں ۔قریب جا کر کاغذ سرکایا۔سارا میز پوش نیلی سیاہی میں ڈوبا ہوا تھا۔ایک دو کتابوں پر سیاہی کے دھبے بھی نظر آئے ۔یوں جیسے انہیں سیاہی کی زد سے بچانے کی کوشش کی گئی ہو۔

''معلوم ہوتا ہے ۔کتابوں کو پھر کسی کے ہاتھ لگے ہوئے ہیں ۔انہوں نے خود سے کہا۔

''ہزار بار کہا ہے کہ خدا کے لیے کمرہ بند رکھا کریں ۔لیکن نہ تو اماں سنتی ہیں اور نہ ماما پرواہ کرتی ہیں ۔پوچھنے کے لیے باہر جانے ہی والے تھے کہ میز کی اگلی ٹانگ کے پاس چھوٹا سا دستی رومال سیاہی میں ڈوبا نظر آیا۔اٹھایا اُسے کھول کر دیکھا۔ایوننگ ان پیرس کی مدھم مدھم سی خوشبو نتھنوں میں گھس گئی ۔رومال سو فیصد زنانہ تھا۔

کمرے میں کون آیا ہوگا؟''وہ حیران تھے ۔

اماں کتنی بار آپ لوگوں سے کہا جائے کہ کمرہ بند رکھا کریں ۔کون گیا تھا وہاں؟''

''کہاں تمہارے کمرے میں؟ میں نے تو صاف کر کے بند کروا دیا تھا۔اب تمہی نے آ کر کھولا ہے ۔''

تو پھر میز پر سیاہی کس نے گرائی ؟ ساری کتابیں اِدھر اُدھر بکھری پڑی ہیں''۔

''اوہو! میاں میں اب سمجھی ۔اس دن آسما بی بی کی بھتیجی انکے ساتھ آئی تھی ۔روشن بی بی کے کہنے پر وہ تمہارے کمرے سے کوئی پڑھنے والی کتاب ضرور لائی تھیں ۔اب اللہ جانے میز پر سیاہی کس نے گرائی ؟

''اسما خالہ کی بھتیجی؟''منیب کچھ سمجھتے ہوئے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولے''۔

''اے ہے میاں وہ جو بڑے ڈاکٹر ہیں اُن کے بھائی ۔اُن کی بیٹی ۔''

وہ اپنے کمرے میں واپس آ گئے تھے ۔ رومال کو غیر ارادی طور پر ایک بار پھر کھولا ۔ کلیوں جیسا معصوم حسن اور کنول جیسی خوبصورت آنکھیں ان کے سامنے آ گئیں عجیب سا سرور محسوس ہوا۔ رومال میں سے ہلکی ہلکی خوشبو انہیں کسی اور دنیا میں پہنچا رہی تھی ۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں حسن دل میں ہلچل مچا رہا تھا۔ جہاں رعنائی دامن کو کھینچ رہی تھی اور جہاں جلووں کے نظارے مے پلائے بغیر بے خود بنا رہے تھے۔

بے خودی کتنی ہی دیر غالب رہی ۔ کتنی ہی دیر وہ خود ہی ڈوبے رہے ۔ کھوئے رہے اور کچھ سوچتے رہے ۔

لیکن ہوش کی دنیا میں آنے سے خواب کا وہ سماں ٹوٹ گیا ۔ سر کو تیزی سے جھٹکتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے ۔ دماغ نے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ ''پاگل ہوئے ہو''۔

وقت ہواؤں کے دوش پر اڑ رہا تھا۔ شیبہ کو گاؤں آئے تقریباً دو ماہ ہو رہے تھے ۔ عمر پندرہ دن رہنے کے بعد واپس چلا گیا تھا اور اب وہ خود بھی جانے کے لیے پر تول رہی تھی ۔ کتنی کتابیں اور نوٹس لائی تھی ۔ اس اُمید پر کہ وہاں سکون سے پڑھ سکے گی ۔ لیکن حال یہ تھا کہ ایک دن بھی جم کر نہ پڑھا جا سکا ۔ اب وہ جلد از جلد لوٹ جانا چاہتی تھی ۔ لیکن مصیبت تو یہ آن پڑی کہ دادی اماں اُسے تنہا بھیجنے پر رضا مند نہ تھیں اور گھر میں کوئی ایسا مرد نہ تھا جو اس کے ساتھ جا سکتا ۔ دن گزرتے جا رہے تھے ۔ دادی اماں کے سامنے تو کچھ نہ کہہ سکتی لیکن اسما کے سامنے بول اٹھتی ۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا ۔ اسما پھوپھو، دادی اماں اتنی وہمی کیوں ہیں؟ آخر میں کوئی بچہ ہوں جو راستہ بھول جاؤں گی ۔ یا پھر مجھے کوئی پکڑ لے جائے گا۔''

''توبہ توبہ کرو رانی!'' اسما کانوں کو ہاتھ لگا کر کہتیں' زمانہ بڑا خراب ہے اسی لیے بی جان تمہیں اکیلا بھیجتے ہوئے گھبراتی ہیں ۔''

''اسما پھوپھو! میری عمر اس وقت اُنیس سال دو ماہ ہے ۔ ذرا میرا قد تو دیکھئے کتنی بڑی

ہوں ۔میرے ناخن آپ نے دیکھے ہیں کتنے تیز ہیں؟ کسی نے دیکھا تو آنکھیں نوچ ڈالوں گی ۔ آپ مجھے کیا سمجھتی ہیں؟ چار سال ہو گئے ہیں ۔مجھے لڑکوں کے ساتھ پڑھتے ہوئے ۔آپ دادی اماں سے کہیں، بیچ میں بڑے آرام سے گھر چلی جاؤں گی ۔''

اتنی سنجیدگی سے وہ ایک ایک چیز کی تفصیل اسما کو بتاتی کہ ہنستے ہنستے وہ لوٹ پوٹ ہو جاتیں ۔

اور ایک دن شام کو جب فاطمہ شہر سے لوٹیں تو آتے ہی انہوں نے اسما سے کہا ۔

''لو بھئی خدا کارساز ہے میں شیبہ کے ساتھ کے لیے پریشان تھی ۔منیب کل سے آیا ہوا ہے ۔پرسوں واپس چلا جائے گا ۔میں اس سے کہہ آئی ہوں ۔میرے جانے کا معاملہ ٹیڑھا تھا ۔''

''یہ تو اچھا ہو ا۔آپ کے لیے میں خود پریشان تھی ۔ویسے بھی منیب تو گھر کا بچہ ہے'' ۔

''خدا اس کی عمر دراز کرے ۔اس کی شرافت کے گن سارا شہر گاتا ہے ۔بڑا ہی پیارا بچہ ہے ۔'' فاطمہ نے دوپٹے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا ۔

شام کو جب وہ سو کر اٹھی تو اسما نے اسے بتایا ۔چند لمحوں تک تو وہ حیرانی سے انہیں دیکھتی رہی ۔اور پھر روہانسی ہو کر بولی ۔''میں نے آپ سے کتنی بار کہا ہے کہ میں اکیلی ہی چلی جاؤں گی ۔ لیکن آپ مانتی ہی نہیں ۔میں اس کے ساتھ نہیں جاؤں گی ۔''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں ۔یہ تو بی جان کی رضا مندی پر ہے ۔وہ تو انہیں کہہ بھی چکی ہیں ۔''

اگلی صبح روشن کا نوکر انہیں شام کے کھانے کی دعوت دینے کیلئے آیا ۔

اور چھ گھنٹے منیب کے گھر گزار کر رات کے نو بجے جب وہ اسما کے ساتھ واپس آنے کے لیے تیار ہو رہی تھی ۔اس وقت تک منیب گھر نہیں آیا تھا ۔دل میں پڑی گرہ اور بھی مضبوط ہو گئی تھی ۔ راستے بھر وہ یہی سوچتی رہی کہ وہ کتنا خود پسند انسان ہے ۔اسما پھوپھو تعریفوں کے پُل باندھتی ہیں ۔لیکن اسے تو معاشرتی رکھ رکھاؤ سے بھی آگاہی نہیں ۔

لیکن وہ روشن کے طرزِ سلوک سے بڑی متاثر تھی۔

باب نمبر: 22

کلائی کا رخ چاند کی طرف کرتے ہوئے اُس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور رات کا ایک بجا دیکھ کر حیران ہی تو رہ گئی۔ چار گھنٹوں سے وہ اندر ہی اندر جل رہی تھی۔ جلتے جلتے یہ وقت آ گیا تھا۔ لیکن جلن ختم ہونے کا نام نہ لے رہی تھی۔ کسی کے ساتھ سفر کرنے کا احساس خون کھولا رہا تھا۔

''اگر اس مصیبت کا مجھے علم ہوتا تو میں عمر کے ساتھ ہی نہ واپس چلی جاتی۔'' اس نے بے پناہ دکھ کے ساتھ سوچا۔ وہ انسان مجھے بازار میں ملا۔ لیکن اس نے مجھے بلانا تک گوارا نہ کیا۔ مردوں سے بے تکلفی تو مجھے بھی پسند نہیں۔ لیکن جہاں مراسم ہوں وہاں علیک سلیک تو ہو ہی جاتی ہے۔

مگر وہ کس بے اعتنائی سے گذر گیا تھا۔ چھ گھنٹے آج ہم اس کے ہاں گزار کر آئے۔ لیکن وہ گھر سے غائب رہا۔ کیا یہ چیز ثابت نہیں کرتی کہ وہ انتہائی خود پسند انسان ہے۔

یقیناً سفر کرنا پسند نہ کرتا۔ پتہ نہیں دل میں کوس رہا ہوگا۔ کڑھ رہا ہوگا۔ لیکن دادی اماں کی وجہ سے مجبور ہو گیا ہوگا۔

''میرے خدا میں کیا کروں؟'' اس نے چارپائی کی پٹی پر سر رکھتے ہوئے خود سے کہا۔

''یہ تو میری خودداری اور آن کے منافی ہے۔ میں ایسے انسان کے ساتھ جو انسانوں کے سائے سے بھی بھاگے کروں''۔ غصے سے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔

''انکار کردو'' ....ایک باغیانہ خیال اس کے دماغ میں اُبھرا۔

''انکار کر دوں، انکار'۔اس نے دو تین بار خود سے کہا۔لیکن اپنے ہی یہ الفاظ اُسے اجنبی لگے۔ایک مقدس چہرہ بے پناہ شفقت لئےنظروں کے سامنے آ گیا۔

''پوچھیں گی تو کیا کہوں گی؟ کہ کیوں نہیں جانا چاہتی؟ وہ مجھے اور عامر کو جتنا پیار کرتی ہیں اتنا شاید ہی اپنی ساری اولاد کے بچوں میں سے کسی کو کرتی ہوں؟ ممی کے طرزِ سلوک سے تو پہلے ہی دل برداشتہ ہیں۔میرے انکار پر انہیں یقیناً تکلیف ہوگی۔کہیں وہ اس انکار کو گستاخی پر محمول نہ کریں۔

اس نے ایک تجویز اور سوچی لیکن اس کا بھی کھوکھلا پن اُسے فوراً نظر آ گیا۔

''اتنے دنوں سے شور مچا رہی تھی اور اب یکدم ارادہ کیسے بدل دیا؟'' کیا وہ یہ نہ سوچیں گی۔

''اور پھر وہی عذاب۔وہ مجھے اکیلا نہیں بھیجیں گی اور ساتھ کوئی ملے گا نہیں۔''

''کس مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔''اس نے جلتی آنکھوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے سوچا۔''کتنی بار کہا ہے کہ اکیلے جانے سے مجھے کوئی پکڑ نہیں لے گا۔بچہ نہیں ہوں کہ راستہ بھول جاؤں گی۔لیکن اب ان کے وہم کا کیا کیا جائے؟ انہیں تو اکیلے بھیجنے کا نام سن کر ہی ہول آنے لگتا ہے۔خود کمزور ہیں۔گرمی کی شدت اور لمبا سفر انہیں سخت تکلیف دے گا۔اسما پھوپھو ویسے مجبور ہیں۔بس واحد علاج یہی ہے کہ میں زبان بند کر کے کل اس کے ساتھ چلی جاؤں'۔

سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔طبیعت پر سخت وحشت سوار تھی۔کل اس وقت وہ کہاں ہو گی......اور اس خیال ہی سے اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔دو مہینے کیسے گذر گئے؟ یوں جیسے دو دن ہوں......اس نے آنکھیں زبردستی بند کر لیں اور نیند کو پکارنے لگی۔ساری رات خواب میں بھی وہ اسما سے منیب کے ساتھ بھیجنے پر الجھتی رہی۔صبح ہوئی آنکھ کھلتے ہی وہی تلخ احساس پھر دماغ میں رینگ گیا۔اس کے چہرے پر پھیلی تکان اور بے آرامی کے تاثرات دیکھ کر اسما پریشان ہو اٹھی۔

تازہ دودھ کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولی۔

کیوں رانی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

پیار سے اُس نے اس کے بالوں کی لٹ کان کے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

''میں ٹھیک ہوں اسما پھوپھو''۔وہ انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی''۔

ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے سامان سمیٹا اور رفاطمہ اور اسما کے ساتھ شہر جانے کے لیے تانگے میں سوار ہو گئی۔ان لوگوں سے جُدا ہونے کے احساس سے اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔جیسے ابھی چھلک جائیں گی۔اس کی مغموم اور خوبصورت آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اسما خود بھی آبدیدہ ہو گئی۔وہ کتنے شوق سے چھٹیوں کا انتظار کیا کرتی تھی۔اشرف کے بچوں سے اُسے جو قلبی لگاؤ تھا۔وہ کسی سے پوشیدہ نہ تھا۔اس کی ممتا کے سارے جذبات ان بچوں کے وجود میں سمٹ آتے۔دھیرے سے اس کا سر اپنے قریب کرتے ہوئے اس نے اس کی پیشانی پر پیار کیا اور بولی۔

''یوں روتے نہیں رانی۔خدا تمہیں خیریت سے گھر پہنچائے۔اگلی چھٹیوں میں پھر سہی''۔

ان دونوں کے ساتھ شبیہ منیب کے گھر داخل ہوئی۔روشن نے آگے بڑھ کر گلے سے لگایا اور پیار کیا۔

''روشن آپا منیب کہاں ہے؟''اسما نے پوچھا۔

اس سے پیشتر کہ روشن کچھ جواب دیتیں۔منیب ایک دلآویز مسکراہٹ ہونٹوں پر لیے کمرے سے نکلتے دکھائی دیئے۔

شبیہ کا رُخ اسی طرف تھا۔نگاہوں کا ایک لمحے کے لیے تصادم ہوا اور اسے ان میں وہی بے نیازی سے لیئے جذبات نظر آئے۔اسما کے قریب آ کر قدرے جھکتے ہوئے انہوں نے سلام کیا۔

اسما شکایتی انداز میں بولی ''کل کہاں غائب تھے؟''

مجھے سخت افسوس ہے اسما خالہ۔ میں اپنے ایک دوست کے ہاں چلا گیا تھا۔اس نے رات کا کھانا کھانے سے پہلے اٹھنے ہی نہ دیا۔''انہوں نے شائستگی سے معذرت کی۔

''بہت اچھا کیا بھیا۔مہمانوں کو گھر بلا کر خود دوسرے کے ہاں مہمان جا بنے۔'' اسما نے ہنستے ہوئے کہا۔

میں سخت شرمندہ ہوں۔اسما خالہ''۔

''معذرت کرتا پھرتا ہے زمانے بھر کا مغرور'' ۔اس نے تلخی سے سوچا۔''

''منیب بیٹے!شیبہ کا خیال رکھنا'' روشن نے کہا۔

''جی ہاں اب ساتھ جا رہی ہیں خیال تو رکھنا ہی ہوگا۔''انہوں نے کسی قدر مسکراتے ہوئے کہا۔

دل جل کر کباب ہی تو ہوگیا۔شدت سے جی چاہا چیخ کر کہہ دے''مجھے نہیں ضرورت اپنے پاس رکھو ایسی بھوکی ننگی ہمدردی کو۔''

باغی خیالات ذہن کو ترغیب دے رہے تھے۔کہ جانے ہی سے انکار کردو نتیجہ چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو۔لیکن پھر مجبوری۔چاہتے ہوئے بھی کب ایسا ہوسکتا تھا؟ گستاخی کا وہ تصور ہی کرسکتی تھی لیکن اسے عملی جامہ نہیں پہنا سکتی تھی۔وقت ہو رہا تھا۔

روشن اور فاطمہ نے اڈے پر جانا چاہا۔لیکن منیب نے انہیں منع کردیا۔جاتے ہوئے وہ سب سے گلے ملی۔لیکن غصے کی وجہ سے اس کی آنکھ سے ایک آنسو نہ نکلا......قدموں کو بیزاری سے زمین پر پٹختی ہوئی وہ ان کے پیچھے پیچھے چل دی۔ہاتھ میں بریف کیس پکڑے منیب اس سے کچھ فاصلے پر چل رہے تھے۔خود اعتمادی سے اٹھتے ہوئے قدم پروقار شخصیت کا پتہ دے رہے تھے۔ان کا نوکر شیبہ کا مختصر سا سامان پکڑے ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

اڈے پر پہنچ پر ہجوم سے قدرے ہٹتے ہوئے انہوں نے اٹیچی کیس اور دوسرا سامان ایک

جگہ رکھوایا اور نوکر سے بولے۔''تم لوگ یہیں ٹھہرو میں سیٹ بک کروالوں۔''

اور تیزی سے دوسری طرف چلے گئے ...... کتنی ہی دیر گزر گئی۔وہ پریشان ہو گئی۔ایک بار تو اس نے سنجیدگی سے سوچا کہ وہ اپنا سامان اٹھوا کر گاڑی میں لے جائے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کی نظروں کے سامنا اما کا چہرہ تھا۔دادی اماں کا چہرہ تھا اور اس بد دماغ انسان کا چہرہ تھا۔سب لوگ کیا کہیں؟ کیوں اکیلی چلی گئی؟ کیا بات تھی اتنی باتیں بننے کا راستہ کھل جائے گا۔

''یہ سب اُس نے بیزاری سے یہ سب سوچا۔''کاش میں گاؤں آتی ہی نہ''۔

''آیئے''اپنے بالکل قریب ہی اُسے آواز سنائی دی......پلٹی تو وہ جُھکے ہوئے اٹیچی کیس پکڑ رہے تھے۔بس کے اندر قدم رکھتے ہی یوں لگا جیسے وہ کسی جہنم میں داخل ہو گئی ہو۔سستے قسم کے سگریٹوں کے دھوئیں سے ساری بس میں گھٹن کی سی کیفیت تھی۔سوٹ کیس اور گٹھڑیاں راستہ روکے پڑی تھیں۔کوئی گذرے بھی تو کیونکر اور سب سے بڑ کر مردوں کی نگاہیں۔پتہ نہیں کیسے ان سب کو پھلانگتی ہوئی وہ آگے بڑھی اور کھڑکی کے ساتھ والی جگہ پر بیٹھ گئی۔اس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔بس چلی تو تازہ ہوا کے اندر آنے سے سکون سا ملا۔رفتار میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہو رہا تھا۔ شہر نظروں سے اوجھل ہو گیا اور اب لہلہاتے ہرے بھرے کھیت حدِ نظر کو پھیلے نظر آ رہے تھے۔

بس ایک جگہ رُکی۔یہاں سے چند مسافر سوار ہوئے۔ایک معمر سا انسان ان کی سیٹ کے قریب آ کر منیب سے مخاطب ہوا۔

''صاحبزادے! آپ ذرا اپنی سواری کے ساتھ ہو جائیں''۔

اخبار پر جمی نگاہیں اٹھیں۔انتہائی ملائمت سے انہوں نے کہا۔

''بزرگوار میں یہ پوری سیٹ ریزرو کرا چکا ہوں''۔

لہجے میں نرمی شیبہ کو حیران کر دینے کے لیے کافی تھی۔جانے وہ انہیں کیا سمجھ رہی تھی؟ معمر شخص خاموش ہو گیا۔لیکن چند ہی لمحوں بعد دوبارہ ان سے مخاطب ہوا''یہ درست

ہے کہ آپ یہ سیٹ بک کروا چکے ہیں۔لیکن انسانیت کا بھی کچھ تقاضہ ہے۔میں کھڑا ہوں اور آپ بیٹھے ہیں۔اپنے تھوڑے سے آرام کی خاطر دوسروں کو تکلیف دینا آپ جیسے مہذب اور شائستہ نوجوانوں کو زیب نہیں دیتا۔''

وہ پریشان ہو گئے۔خالی سیٹ کو ایک نظر دیکھا اور پھر نگاہیں خود بخود شیبہ کی طرف اٹھ گئیں۔چند لمحوں کے تذبذب کے بعد وہ کھڑے ہو گئے۔

''آپ تشریف رکھیے میں کھڑا ہوئے جاتا ہوں''۔

''نہیں نہیں صاحبزادے! میرا مقصد آپ کو اٹھانا ہرگز نہ تھا۔یہ بچی آپ کے ساتھ ہی سفر کر رہی ہے نا؟''

معمر مرد نے انہیں کندھوں سے پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں''انہوں نے جواب دیا۔''تو پھر آپ اپنی سواری کے ساتھ بیٹھ جائیے۔میں ادھر بیٹھ جاتا ہوں۔''......عجیب گومگو کا عالم تھا۔کیا کرے اور کیا نہ کرے۔والا معاملہ ہو گیا تھا۔لیکن اب مزید کسی سوال کا موقع دینا بے وقوفی تھی۔صورتِ حال کے پیش نظر منیب درمیانی جگہ پر آ گئے۔

برق کا سا تیز احساس شیبہ کے رگ و پے میں دوڑ گیا۔جب منیب کے شانے اس کے شانوں سے ٹکرائے۔چہرہ سرخ ہو گیا۔صورتِ حال اس کے سامنے تھی۔اپنے سارے وجود کو کھڑکی کی طرف سمیٹتے ہوئے اس نے چور نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ان کے چہرے پر پریشانی جھلک رہی تھی اور وہ اپنا زیادہ تر بوجھ ساتھی پر ڈالے ہوئے تھے۔

کتنی دیر گذر گئی۔جسم کا داہنا حصہ دُکھنے لگا۔گردن اکڑ گئی۔لیکن اس پر ہی بس ہوتا تو غنیمت تھی۔اب ایک اور مصیبت اُسے اپنے سر پر منڈلاتی نظر آ رہی تھی۔

''اس کا دل متلا رہا تھا......''خدایا میری عزت آج تیرے ہاتھ ہے۔'' دل کی گہرائیوں سے دعا نکلی۔لیکن معلوم ہوتا تھا کہ دعا شرفِ قبولیت حاصل نہ کر سکی۔دل یکدم گھبرایا۔

زبردست متلی محسوس ہوئی۔کھڑکی سے منہ باہر کرنے کی دیر تھی جو کچھ کھایا پیا تھا۔سب نکل گیا۔

پشیمانی کے احساس سے دل تڑپ اٹھا۔

احساسِ ندامت آنسو بن کر حسین آنکھوں سے ٹپک پڑے۔

اور شرمندگی چہرے کو اندر کرنے کی راہ میں حائل ہوگئی۔

کھڑکی کے شیشے سے سر ٹکائے وہ سسک اٹھی۔کیا کہتا ہوگا وہ بھی کس مصیبت کو ساتھ لے آیا ہوں۔

لیکن مصیبت کبھی اکیلی نہیں آتی۔اُلٹیوں کا جو سلسلہ شروع ہوا تو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے اندر ایک چیز بھی نہیں رہے گی۔حواس اڑے جا رہے تھے۔سر چکرا رہا تھا۔آنکھوں کے گرد اندھیرا چھایا جا رہا تھا۔

صورتِ حال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے منیب بھی پریشان تھا۔

تھرموس سے کپ میں پانی انڈیلا اور اُسے تھما دیا۔بغیر کچھ کہے اس نے کپ تھام کر ہونٹوں سے لگالیا۔نڈھال ہوکر سر اس نے اگلی سیٹ کے راڈ سے ٹکالیا تھا چند لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ دل پھر متلایا اور پانی کے گھونٹ جو تھوڑی دیر قبل پیئے گئے تھے نکل گئے اس بار تو ایسے یوں لگا جیسے انتڑیاں بھی باہر نکل جانا چاہتی ہوں۔چہرہ زرد ہوگیا تھا۔

منیب کچھ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔کہ کیا کریں چلتی بس میں کیا ہوسکتا تھا؟

آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔گہرے اضطراب سے اس نے ایک بار پھر منہ باہر نکالا۔نکلنے کو تو کچھ باقی نہ رہا تھا۔تکلیف کی زیادتی سے ہونٹ سفید پڑ گئے تھے۔ہاتھ پیروں میں تشنج جیسی حالت تھی جس کی وجہ سے وہ بار بار ہاتھ اور پاؤں پٹخ رہی تھی۔بے ہوشی جیسی حالت طاری ہو رہی تھی۔

وہ میرے ساتھ سفر کر رہی ہے اس کی حفاظت مجھ پر مقدم ہے۔منیب نے سوچا اور پھر ہر احساس سے بے نیاز ہوکر اس نے شیبہ کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر تیزی سے مسلا اور

ادھر ادھر لڑھکتا ہوا سر اپنے شانے سے ٹکا لیا۔ دایاں ہاتھ سر پر مضبوطی سے رکھ دیا۔ تا کہ ادھر ادھر سر کنے نہ پائے۔

بھینی بھینی خوشبو ان کے نتھنوں میں گھس گئی۔ لیکن وقت ایسی باتوں کے سوچنے کا نہ تھا۔ نبض پر ہاتھ رکھ کر دیکھا کافی سست تھی۔

''زندگی حادثات سے عبارت ہے۔ کبھی یہ حادثات خوش گوار اور حسین واقعات کو جنم دیتے ہیں اور کبھی غمناک آہوں، سسکیوں اور محروم تمناؤں کو حادثات جن سے کبھی کبھی زندگی کے دھارے بدل جاتے ہیں۔ ایک ڈگر پر چلتا ہوا جیون اپنا رُخ موڑ لیتا ہے کیا یہ ایک خوشگوار حادثہ ہیں کہ ایک خوشگوار حادثہ نہیں۔ کہ اس وقت ایک پیاری سی اجنبی لڑکی بے بسی اور لاچار کی حالت میں میرے شانے سے سر ٹکائے پڑی ہے۔'' وہ باہر فضا میں دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے۔

''معبودِ حقیقی ہمیں اپنے ہر فعل کیلئے تیرے سامنے جواب دہ ہونا ہے۔ ہمارے ایمان میں استقامت پیدا کرنا کہ ہم آزمائش کی ان کڑی گھڑیوں میں نیکیوں کے ساتھ پورے اتر سکیں۔ یہ ایک معصوم سی امانت جو کچھ وقت کے لیے مجھے سونپی گئی ہے۔ میں ایسے پاکیزگی کے ساتھ اس کے لواحقین کو سونپ سکوں۔'' انہوں نے عجز سے دعا مانگی۔

دو ڈھائی گھنٹے یونہی گذر گئے۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ چونک اُٹھی۔

''اُف .....'' سیدھی ہوتے ہوئے اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''یہ مجھے کیا ہو گیا تھا؟ شرم سے وہ کٹی جا رہی تھی۔ منیب اس کی پریشانی سمجھتے تھے۔

دھیرے سے بولے ''گھبرایئے نہیں۔ آپ اور آپ کی عزت کی حفاظت میرا فرض ہے۔

باقی سارا وقت وہ آنچل سے چہرہ کسی حد تک چھپائے کھڑکی کے پٹ سے سر ٹکائے بیٹھی رہی۔ منیب نے گرم گرم چائے اُسے پینے کیلئے دی پہلے تو اس نے انکار کیا۔ لیکن پھر ان کے پیہم اصرار پر اُسے پینا پڑی۔

منزل آ گئی تھی ۔اُس نے اٹھنا چاہا تو ٹانگوں نے جواب دے دیا۔آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔اگلی سیٹ کی پشت پکڑے وہ کھڑی تو ہو گئی لیکن یکدم چکر سا آ گیا۔گرنے ہی والی تھی' کہ منیب نے اُسے بازوؤں کے سہارے سے تھام لیا کچھ پتہ نہیں چلا کہ کس طرح اور کیسے اتری اور کیسے گھر پہنچی؟

ڈاکٹر اشرف اور بیگم اشرف کوئی بھی گھر نہ تھا۔عمر اور عامر بھی موجود نہ تھے فوراً نکو اور دوسرے نوکر بھاگے بھاگے آئے ۔اسے دیکھا تو حیران ہی رہ گئے ۔

منیب نے انہیں کیفیت بتائی ۔فوراً نوکر ہسپتال کی لیڈی ڈاکٹر بلانے کے لیے بھیج دیا گیا ۔نکو دوسری خادمہ کی مدد سے اسے کمرے میں لے گئی۔

”مجھے اب چلنا چاہیے۔“ اور ٹیکسی میں بیٹھ کر وہ اپنی رہائش گاہ کی طرف چل دیئے ۔

باب نمبر: 23

ٹیکسی آفیسرز میس کے کمپاؤنڈ میں جا کر رک گئی۔دروازہ کھول کر منیب باہر نکلا۔بل کی ادائیگی کے بعد ابھی دو قدم ہی اٹھائے ہوں گے کہ سامنے سے رضوان آتا دکھائی دیا۔

پچیس چھبیس سالہ صحت مند رضوان جو فضائیہ میں گراؤنڈ انجینئر تھا اور منیب کا جگری دوست تھا۔اسے دیکھتے ہی بھاگا۔مسکراہٹ سے اس کے ہونٹ پھیلے جا رہے تھے۔قریب آ کر ہاتھ پیشانی پر رکھتے ہوئے قدرے جھک کر بولا۔

''اکیلے اکیلے ہی؟''

''کیا مطلب؟''استفہامیہ نظروں سے منیب نے دیکھا۔

''میں تو بیگم منیب کا بھی منتظر تھا۔جوڑا دیکھنے کی آس لگائے بیٹھا تھا۔لیکن تم تنہا ہی چلے آ رہے ہو۔''

اس نے منیب کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے شوخی سے کہا۔

''خوب''منیب کے لبوں پر سنجیدہ سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔دھیرے سے بولے۔

''ارے بابا یہ میں دو دن کیلئے گیا تھا تم کس چکر میں پڑ گئے ہو۔تم آخر چکر شروع کب کرو گے؟ وہ ہنسا۔ہٹو جانے دو۔تھکا ہوا ہوں۔فریش ہو کر تم سے نمٹوں گا۔

کمرے میں پہنچ کر خود کو بستر پر گراتے ہوئے منیب بولا۔

''گرمی میں لمبا سفر بھی تھکا ڈالتا ہے۔''

''تمہیں کس حکیم نے مشورہ دیا تھا کہ چار یوم کے لیے گھر جاؤ۔ بھاگے بھاگے گئے تھے کہ شاید خالہ نے کوئی گڑبڑ کی ہو۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دل کی کلی نہیں کھلی۔''

''ہوسکتا ہے کھل ہی گئی ہو۔'' منیب مسکراہٹ دبا گیا۔

یہ کہنے کی دیر تھی کہ رضوان جونک کی طرح چمٹ گیا۔

آخر بڑی مشکل سے منیب نے یقین دلایا کہ یہ بات تو محض مذاق کے طور پر کہی ہے۔

''میری بات مانو منیب۔ کنورے کا ڈم چھلا اب اتار پھینکو۔ سمجھتے نہیں ہو!''

''واہ سمجھنے کی بات ایک ہی کہی، لوگ تو چالیس چالیس سال کے کنوارے بھی جچتے ہیں۔ میں تو خیر سے ابھی انتیس سال کا ہی ہوں''۔

''ان خوش فہمیوں میں مبتلا نہ رہنا پیارے! چالیس سال کے کنوارے جب شادی کرنا چاہتے ہیں تو لڑکیاں ناک پر انگلیاں رکھ کر کہتی ہیں۔'' توج یہ بڑھا چھا کیا ہمارے لیے ہی رہ گیا ہے اور ان کی مائیں گویا یوں گوہر فشانی کرتی ہیں۔

''اے غضب ہوگیا! کیسا زمانہ آ گیا ہے۔ میری چاندسی بنو کو مانگتے اس بڈھے کھوسٹ کو شرم نہ آئی۔'' آنکھیں مٹکاتے ہوئے رضوان نے کمال اداکاری سے کہا۔

رضوان کی اس ایکٹنگ پر ہنستے ہنستے منیب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آنکھوں کے کونے صاف کرتے ہوئے وہ بولا۔

''بھئی یہ بات تو تب ہوگی جب ہم چاندسی بنو مانگیں گے۔ لیکن جب اپنے ہی جیسی کسی بڈھی روح کو تلاش کریں گے تو یہ صورت ہی پیدا نہ ہوگی۔''

''سرکار وہ بھی نہیں ملے گی۔ اخبار میں اشتہار دینا پڑے گا۔''

''اشتہار دینا بڑے جان جوکھوں کا کام ہے۔ ضرورت محسوس ہوئی تو اس کوچے میں بھی قدم رکھ لیں گے۔''

’’اشتہار کا مضمون تو تم سے بنایا نہیں جائے گا۔منیب تمہاری اُردو بہت کمزور ہے۔‘‘

’’اردو اخبار میں نہ دیں گے۔انگریزی اخبار میں دے دیں گے؟‘‘

’’خیر اس نیک کام کے لیے مجھے یاد کر سکتے ہو۔‘‘

’’شکریہ ہمدردی اپنے پاس ہی رکھو۔میری بیوی کو اپنی فصیح و بلیغ اُردو سے متاثر کرنے چلے ہو۔ایسا کبھی نہیں ہوگا۔‘‘

’’سنو تو‘‘......................رضوان نے کچھ کہنا چاہا۔

لیکن منیب نے فوراً ہی اس کی بات کاٹ دی۔

’’بس بس اور کچھ سنانے کی ضرورت نہیں۔بکواس بند ہونی چاہیے۔اتنا تو ہو نہ سکا کہ چائے ہی پلوا دیتے کس قدر تھکن محسوس ہو رہی ہے......اُف خدایا۔‘‘

’’لو معاف کرنا!مجھے خیال ہی نہ رہا۔لو میں ابھی کہہ کر آتا ہوں۔‘‘

’’خیال بھلا کیسے رہے دماغ تو شادی بیاہ کے چکروں میں پھنسا ہوا ہے۔‘‘

منیب نہانے کے لیے چلا گیا۔چائے آچکی تھی۔رضوان آرام کرسی پر نیم دراز منیب کا انتظار کر رہا تھا۔

تنگ آ کر چلایا۔

’’بندہ خدا!کیا اشتہار کا مضمون تیار کر رہے ہو؟‘‘

چائے ٹھنڈی ہو رہی تھی وہ پھر چیخا۔

’’منیب اب نکلو گے،یا نہیں۔چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے‘‘۔

تولیہ شانوں پر ڈالے وہ کمرے میں آ گیا۔

’’کیا اودھم مچا رکھا تھا؟‘‘اُس نے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے کہا۔

’’یہ سولہ سنگار بعد میں کر لینا۔تمہیں کوئی پسند کرنے تو نہیں آ رہا۔چائے پی لو پہلے۔‘‘

اس نے کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

''کاہے کی زبان لگی ہوئی ہے تمہیں۔خاموش ہونے میں ہی نہیں آتی۔

''اورتم کیسے ڈاکٹر ہو جو آج تک یہی نہ جان سکے''۔

''منیب میں تو تمہارے غم میں گھلا جا رہا ہوں''۔

''کیوں؟'' اس نے شوخ نظروں سے اُسے دیکھا۔''

''تمہاری حالتِ زار پر''۔

''میرے غم میں گھلنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔اپنی فکر کرو۔سمجھے''۔

مجھے سمجھ نہیں آتی کہ اب تمہاری خالہ کیا سوچ رہی ہیں؟

رضوان نے متفکرانہ انداز میں کہا۔

''یہ تو تم اُنہی سے پوچھ سکتے ہو۔میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں''؟

''سوچتی ہوں گی ابھی تو میرا منیب بچہ ہے۔ننھا منا بچہ دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے۔ اپنا ہی ہوش نہیں بھلا بیوی کو کیا سنبھالے گا''؟

''بہت بدتمیز ہوتے جا رہے ہو۔مجھے تو غریب فوزیہ پر ترس آ رہا ہے۔مٹی پلید کر ڈالو گے۔سمجھ نہیں آتی تم جیسے باتونی انسان کے ساتھ کیسے گذارہ کرے گی''؟

''گزارہ تو ایسا شاندار ہوگا کہ لوگ رشک کریں گے۔''

''اتنا زعم ہے۔''

''اور نہیں تو کیا۔''

''میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ اس نوکری کے چکر کو چھوڑ و دو اور فلموں میں کام کرنا شروع کر دو۔خوب نام پیدا کرو گے۔وہاں تم جیسے بھانڈوں کے لیے بڑا اسکوپ ہے۔''

کسی فلمساز سے تمہاری واقفیت ہے تو مجھے لے چلو۔تم جانتے ہو کہ سفارش کے بغیر آج کل کام نہیں بنتا۔''

''خود ہی کوشش کر دیکھو میں تو اس راہ گذر سے بھی واقف نہیں۔''

''تو پھر ایسا کرنے کی مجھے کس جُرم میں سزا دے رہے ہو۔''

''تمہاری کرتوتیں دیکھ کر۔''

''تمہارے نزدیک فن کی یہ قدر ہے۔''

''واہ واہ کیا کہنے ہیں فنکار کے۔'' منیب کا انداز تکلم اتنا تمسخرانہ تھا کہ رضوان بھی ہنس پڑا۔

''منیب چاول کھلا دو نا۔''

''پک رہے ہیں، شام کو جس قدر رچا ہو کھا لینا۔'' منیب نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے جواباً چوٹ کی۔

''یار تم بات کا جواب کیوں نہیں دیتے؟۔اسے نظر انداز کیوں کر دیتے ہو۔''؟

''لایعنی باتیں نظر انداز ہی کی جاتی ہیں۔ڈھنگ کی کوئی بات کرو تو جواب بھی ملے۔''

کس کے انتظار میں بوڑھے ہوتے جا رہے ہو؟ کون سی پری تمہارے دل پر سایہ کیئے ہوئے ہے۔بتا دو مجھے......آخر چھپاتے کیوں ہو''؟

یہاں تو کوئی لولی لنگڑی بھی دل کی دنیا پر سایہ فگن نہیں ہے اور تم پریوں کی باتیں کر رہے ہو۔''

''روزانہ ہزاروں عورتیں اور لڑکیاں تمہارے پاس آتی ہیں۔ایک بھی پسند نہیں آئی کیا۔''؟

''صاحبزادے میں نے کبھی کسی کو اس نظر سے نہیں دیکھا۔''

منیب نے اُسے کانوں سے پکڑتے ہوئے کہا۔

''سمجھ گیا، سمجھ گیا۔دعویٰ بہت بڑا ہے پارسائی میں آپ کو۔زاہد و عابد و پارسا ڈاکٹر میرا کان براہِ کرم چھوڑ دو۔''

''خدا کے لیے اب جاؤ۔میرا مغز چاٹ لیا ہے تم نے''۔

منیب نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''یہی بات میں تم سے کہنے والا تھا۔''

کمرے میں برقی پنکھا اپنی پوری رفتار سے چل رہا تھا۔منیب بستر پر چت لیٹا بظاہر اپنے سامنے دیوار پر آویزاں پینٹنگ کی ایک تصویر کا جائزہ لے رہا تھا۔لیکن دراصل وہ خیالات کی بھول بھلیوں میں اُلجھا ہوا تھا۔معصوم سا ایک چہرہ اپنی تمام تر رعنائیوں اور دلفریبیوں سے بار بار اس کی نگاہوں کے سامنے ابھر رہا تھا۔پھر یہی چہرہ زردی لیے تکلیف کی شدت سے بے چین ہوتا دکھائی دیا۔حسین آنکھوں میں آنسو اور ہاتھوں کی اضطراری حالت میں پٹخنا یاد آیا۔ایک لطیف سا بوجھ شانے پر محسوس ہوا۔گھنیرے بالوں کے ہالے میں ایک دلآویز چہرے کا آنکھیں بند کیے۔نیم بے ہوشی کی حالت میں ان کے کندھوں سے سرک جانا انسانی ہمدردی کے گہرے جذبات کے تحت اس کے سر پر ہاتھ رکھنا۔کتنی دیر بعد اس کا ہوش میں آنا اور ایک اجنبی انسان کے شانے پر سر رکھے دیکھنا سب اسے بے طرح یاد آ رہا تھا۔تصور کی آنکھ چہرے پر دوڑتی شرم وحیا کی لہریں دیکھ رہی تھی۔دن کے واقعات کسی حسین سپنے کی طرح اس کے سامنے رقص کر رہے تھے۔

''آہ وقت کتنا ظالم ہے''؟اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے سوچا۔

کتنا ظالم ہے جو ایسے حسین لمحے یوں اڑا لے جاتا ہے۔کاش انسان کا بس چلے تو ان حسین لمحوں کو امر بنا دے۔وقت کو کبھی گزرنے نہ دے۔کائنات کی گردش کو روک لے۔لیکن انسان بے بس ہے۔مجبور ہے۔ان خاردار راہوں پر چلنے سے مَیں نے حد درجہ گریز کیا۔جہاں تک ممکن ہوا خود کو بچانے کی کوشش کی لیکن اب اس کا کیا کیا جائے۔کہ قدرت خود مواقع بہم پہنچا رہی ہے۔

اُسے پہلی ملاقات یاد آ گئی۔جب وہ چند چیزیں پہنچانے ان کے گھر گیا تھا۔ڈاکٹر اشرف کے متعلق وہ اکثر اخبار میں پڑھ چکا تھا۔ویسے بھی روشن ان کے متعلق اسے کافی بتا چکی تھی۔ان سے ملنے کا منیب کو بے حد اشتیاق تھا۔لیکن قدموں کی چاپ پر جب نگاہیں اٹھیں تو وہاں ایک

بھولی بھالی معصوم سی لڑکی کھڑی تھی۔چہرے پر پھیلی بے پناہ ملاحت اور معصومیت ایک انسان کو فوراً متاثر کر دینے کے لیے کافی تھی۔وہ احتراماً کھڑا ہو گیا۔ڈاکٹر صاحب موجود نہیں تھے۔وہاں بیٹھنا فضول لگ رہا تھا اور جب جانے کے ارادے سے اٹھا تو گھبرائی ہوئی آواز اور چہرے پر پریشانی کے تاثرات دیکھ کر چائے کے لیے بیٹھنا پڑا۔

واپس آتے ہوئے اس کے محسوسات بالکل انوکھے سے تھے۔وہ ایسی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔جس سے وہ کبھی دوچار نہ ہوا تھا۔سمجھ نہ آتی تھی کہ وہ اپنے احساسات وجذبات کو کیا نام دے؟

وہ ٹھوس کردار کا مالک تھا۔زمانے کے تفکرات،مصائب وآلام نے اسے کم عمری میں ہی وہ سب کچھ سکھا دیا تھا۔جس کے لیے ایک عمر چاہیے۔وہ نگاہوں میں حد درجہ پختگی اور بصیرت رکھتا تھا۔ملازمت کے سلسلے میں فضائیہ کے افسروں کے خاندانوں سے اس کا واسطہ رہتا تھا۔لیکن یہ صورتِ حال عجیب سی تھی۔یوں لگ رہا تھا جیسے جیون کی حسین راہ اُسے اب خوش آمدید کہہ رہی ہو۔

جس پر چل کر انسانی زندگی کی تکمیل ہوتی ہے۔یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے تنہائیوں کا خلا کسی کی جانفزا مسکراہٹوں سے اب پورا ہو جائے گا۔یوں جیسے اب زندگی میں قوسِ قزح کے رنگ بکھرنے والے ہیں۔کھوئے کھوئے سے وہ حسین اور مدھم خیالات میں اُلجھ رہا تھا۔لیکن خمار کچھ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔آنکھوں پر چھائے حسین اور خوشنما پردوں کو عقل نے ایک ہی جھٹکے میں تار تار کر دیا۔ہر چیز بے نقاب ہو کر سامنے آ گئی۔جذباتی لمحات بیت گئے۔واقعی اس نے سوچا تو اپنے پاگل پن پر خود ہی ہنسی آ گئی۔بغیر سوچے سمجھے وہ کس دنیا میں پہنچ گیا تھا۔تصورات کہاں سے کہاں لے اڑے تھے۔کتنے دلفریب منظر اس نے دیکھ لیے تھے۔لیکن اس سب کی حقیقت نہ رکی جھنکار آج کی دنیا کی کمزوری بن چکی ہے۔ہر چیز بکتی ہے۔انسان بکتے ہیں۔ایمان بکتا ہے۔حتیٰ کہ خلوص و پیار کو بھی دولت کے ترازو میں تولا جاتا ہے۔اس کے جذبات کو کون دیکھے گا۔کون

جانے گا۔ کہنے کو وہ ایک ڈاکٹر ہے مگر اس کا کوئی بینک بیلنس نہیں۔ جائیداد اور کوٹھیاں نہیں۔ اگر وہ ان خاردار راہوں پر چل نکلا اور پاؤں لہولہان کرنے کے باوجود بھی منزل حاصل کرنے میں ناکام رہا تو کیا بنے گا؟''

یہی سب کچھ سوچ کر اس نے ہر خیال کو اپنے دماغ سے باہر نکال دیا۔

یہی وجہ تھی کہ ایک دن جب اُس نے اس پیاری سی لڑکی کو بنڈل اٹھائے بازار میں جاتے دیکھا۔ لیکن انتہا درجے کی بے اعتنائی سے وہ اپنے راستے پر خاموشی سے چلتا گیا۔ پلٹ کر ایک بار بھی دیکھنے کی کوشش نہ کی اور پھر کتنے ہی دنوں تک ایک نامعلوم سی خلش نے اسے بے چین رکھا۔

اور اب اس کے لبوں پر سنجیدہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''کیا اپنا پلہ ایک بار پھر چھڑا لوں۔ ان بہاروں سے کنارہ کشی کر لوں۔ جو میرے باغ زیست کو سجانا چاہتی ہیں۔ ان خواہشوں اور اُمنگوں کو کچل دوں جو ہر نوجوان کی طرح میرے سینے میں بھی پوشیدہ ہیں۔

''نہیں! میں انسان ہوں...... میرے سینے میں بھی ایک دل ہے۔

اس دل میں بھی زندگی کی تمنائیں مچلتی ہیں۔ میں اب خود پر جبر نہیں کروں گا۔ اپنا دامن نہیں چھڑاؤں گا۔ ان بہاروں سے کھیلوں گا جو مجھے پکار رہی ہیں۔ میں اس راہ پر چلوں گا۔ جو خطرناک تو ہے لیکن حسین بھی ہے۔

''وہ زندگی کس قدر پھیکی اور ویران ہے جو کسی کے پیار سے محروم ہے۔''

وہ انتیس برس کا ہو چکا تھا۔ عمر عزیز کا ایک حصہ یونہی بیت گیا تھا۔

روشن اس کی شادی کے لیے کتنی بے چین تھی۔ ویسے اس کے لیے رشتوں کی کمی بھی نہ تھی۔ لیکن اس نے اس مسئلے پر ڈھنگ سے سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ بڑا لائق ڈاکٹر تھا۔ ہمیشہ نہ صرف امتیازی نمبروں سے پاس ہوا بلکہ گولڈ میڈل حاصل کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جلد ہی آرمڈ سروسز کے

لیے منتخب ہو گیا۔

حال سے وہ مطمئن تھا اور مستقبل حوصلہ افزا تھا۔لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس کا کوئی خاندان نہیں تھا۔

''آہ ماضی'' ۔کرب سے اُس کے ہونٹوں سے نکلا۔

ماضی جو روشن تھا۔لیکن سنگینی کی حد تک دردناک بھی تھا۔کوئی یقین کر سکتا ہے کہ میں کس باپ کا بیٹا ہوں۔میرے باپ دادا کیا تھے؟ میرے پاس تو چند یادداشتوں کے سوا کچھ بھی نہیں، کچھ بھی تو نہیں''۔

پانچ چھ سالہ ایک شوخ و شریر لڑکے کی آواز اُسے نینی تال میں واقع اس خوبصورت بنگلے میں لے گئی۔جسے اس کے دادا کرنل رحمٰن نے گرمیاں گذارنے کے لیے تعمیر کروایا تھا۔تقریباً چار پانچ پشت سے ان کی نسل اکیلی چلی آ رہی تھی۔اس کے پردادا اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ دادا بھی اکیلے ہی تھے۔اس کے باپ کا بھی کوئی بھائی نہ تھا اور وہ خود بھی اکیلے تھے۔لیکن اُن کا خاندان ممتاز خاندان تھا۔پردادا ایک بہت بڑے جاگیردار تھے۔دادا رحمٰن انڈین آرمی میں ڈاکٹر کرنل تھے۔جنہیں دوسری جنگِ عظیم میں سنگاپور کے محاذ پر بہترین طبی خدمات ادا کرنے پر حکومت برطانیہ نے وکٹوریہ کراس عطا کیا تھا۔اس کے باپ بھی ایک لائق ڈاکٹر تھے۔

جب حالات کو سمجھنے اور جاننے کا شعور ہوا تو پتہ چلا کہ وہ جسے اپنا ابو سمجھتا ہے ابو نہیں دادا ہیں۔ابو تو تبھی چھوڑ کر چلے گئے تھے جبکہ اسے دنیا میں آئے ہوئے چند یوم ہی ہوئے تھے۔باپ سے مثالی محبت کرنے والی ماں بھی اُن کے پیچھے ہی چلتی بنی۔

کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں قالین پر کھیلتے ہوئے وہ پاس بیٹھی ہوئی روشن سے اس تصویر کے متعلق پوچھا کرتا۔جو ایک مرد اور عورت کی خوبصورت تصویر تھی جب وہ روشن کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو دیکھتا تو اس کی تیزی رفو چکر ہو جاتی۔گلے میں بانہیں ڈال کر وہ پوچھتا۔

''ماما آپ روتی کیوں ہیں؟''

"بیٹے میں نے تمہیں کتنی بار بتایا ہے کہ یہ تیرے ابو اور امی ہیں۔"

"میلے ابو اور امی؟ وہ ہیں؟" وہ حیرانی سے پوچھتا۔

اس بات کا روشن نے کبھی جواب نہ دیا تھا۔

وہ اس تصویر کو بھی بڑے غور سے دیکھا کرتا جس کے متعلق اس کے دادا بتایا کرتے تھے، اس کے ابو کے گہرے دوست کی تصویر ہے۔

وقت نے کچھ چھلانگیں اور لگائیں۔دھیرے دھیرے اُسے اپنے دادا اور ماما کی اداسی کا سبب معلوم ہوا۔

روشن کی جھولی میں بھی قدرت نے غم ہی غم ڈال رکھے تھے۔شادی کے دوسرے سال ہی محبوب شوہر داغ جدائی دے گیا۔کومل سا بچہ جسے روشن نے شوہر کی نشانی سمجھ کر سینے سے لگا لیا۔ ہیضے کا شکار ہو کر چل بسا۔بہن اور بہنوئی دونوں فوت ہو گئے۔کون سا دکھ تھا جو قدرت نے اسے نہ دیا تھا۔کرنل رحمٰن نے اسے اپنے پاس رہنے پر مجبور کیا۔وہ خود بھی تو ڈانواں ڈول ہو رہی تھی۔ منیب کی شکل میں اس کی ممتا بھی تسکین پا گئی۔

وہ بہت ہی پیارا اور ذہین لڑکا تھا۔کرنل رحمٰن اور روشن کی جان۔اس کی سکول سے رپورٹ آتی تو کرنل رحمٰن کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو جاتا۔اس کی پیشانی پر والہانہ انداز میں پیار کرتے ہوئے وہ اس کی درازیٔ عمر کے لیے ہاتھ پھیلا دیتے۔

لیکن قسمت نے ابھی اس معصوم بچے کو کچھ اور دکھ دینے تھے۔تقسیم کے سوال پر ملک میں گڑبڑ مچی ہوئی تھی۔شہری فضا کو سازگار نہ دیکھتے ہوئے وہ اپنی آبائی زمین پر چلے گئے۔دن بھر اس کے دادا اپنے منیم جی سے حساب کتاب لینے میں مصروف رہے اور پھر تھک کر جلد ہی سو گئے۔ وہ حضرت عمرؓ فاروق کی سیرت پر ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔کہ اچانک اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے ہلکی ہلکی سرگوشیوں کی آواز سنی۔عقبی دروازے سے باہر نکلا۔

سرگوشیوں کی آواز بدستور آ رہی تھی۔یوں جیسے کوئی سازش ہو رہی ہو۔اس کا دل

دھڑک اٹھا۔تھوڑا سا آگے ہو کر وہ لون میں چنبیلی کے پودے کے پیچھے دبک گیا۔یہ دیکھنے کے لیے کہ کون ہے۔

''اُف اس نے جو کچھ دیکھا۔کاش وہ کبھی نہ دیکھتا۔تین نقاب پوش ہاتھوں میں چمکتی تلواریں لیے آ رہے تھے۔اس کا خون رگوں میں جم گیا۔ہلنا چاہا لیکن ایسا معلوم ہو رہا تھا۔جیسے زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لیے ہوں۔ایک بار تو وہ تڑپا کہ اندر بھاگ جائے لیکن وحشت اور خوف کے باعث ٹانگوں نے اٹھنے سے جواب دے دیا۔کتنی ہی دیر ہو گئی تھی۔پتہ نہیں اندر کیا ہو رہا تھا؟ کافی دیر بعد وحشت کا اثر کچھ کم ہوا۔تو وہ کمرے میں داخل ہوا۔اندر داخل ہوتے ہی اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔اس کا دادا خون میں نہایا ہوا تھا۔وہ چکرا کر گر پڑا اور جب اسے ہوش آیا تو روشن اسے اٹھائے پاکستان آنے والے کسی قافلے میں شامل سفر کر رہی تھی۔یہ ہیبت ناک منظر ایک بار پھر اس کے سامنے ابھرا اور وہ پھر بے ہوش ہو گیا۔راستے کی تکلیف کے متعلق وہ بالکل بے خبر تھا۔وہ ہوش میں آتا۔کچھ دیر پھٹی پھٹی نگاہوں سے صورتِ حال کا جائزہ لیتا اور پھر بے ہوش ہو جاتا۔حتیٰ کہ وہ ایک دن پاکستان کی سرزمین میں داخل ہو گئے۔لیکن وہ اتنا خوفزدہ ہو چکا تھا کہ بات ہی نہیں کرتا تھا۔روشن سخت فکر مند تھی۔وقت نے انہیں آسمان سے اٹھا کر زمین پر دے مارا تھا۔اس نے کتنے جتن کیے۔کتنی کوششیں کیں تب کہیں جا کر اُس نے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کی۔

اس کی تعلیم کے لیے روشن نے کتنی تکالیف اٹھائیں؟ اسے کاش کوئی منیب سے پوچھتا۔

اس نے بھی خوب حقِ خدمت ادا کیا۔اتنا لائق نکلا کہ روشن کی ساری تکلیفیں دور ہو گئیں۔

اور وہ ساری مصیبتیں بھول گئیں۔تجربات کی بھٹی نے منیب کو کندن بنا دیا تھا۔اس نے کبھی ماضی کو یاد نہ کیا۔روشن اگر اس دور کو یاد بھی کرتیں تو اس کے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار دیکھ کر خاموش ہو جاتیں۔حالات نے اسے صرف ایک سبق سکھایا تھا۔کہ دوسروں پر بھروسہ کرنے

کی بجائے اپنے بازوؤں پر اعتماد کرو۔ ورنہ کچلے جاؤ گے اور اس نے یہ سبق اچھی طرح یاد کر لیا تھا۔ حالات سے پوری طرح سمجھوتہ کر لیا تھا۔ ایک بار بھی کسی نے اُس کی زبان سے نہیں سنا کہ وہ کیا تھے اور انقلاب نے انہیں کیا بنا ڈالا؟ اس کا کہنا تھا کہ خوش گوار ماضی کو دہرانا اور ''پدرم سلطان بود'' پر غرور کرنا باعزم لوگوں کا کام نہیں۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ ایک شخص خود اپنی ذات کو ملک وملت کی تعمیر کے لیے کس حد تک مفید ثابت کرتا ہے۔

اور یہی وجہ تھی کہ اپنے اعلیٰ کردار اور خیالات سے اپنے حلقہ احباب میں کافی ہر دلعزیز تھا پھر ایک دلآ ویز سراپا اس کی نگاہوں کے سامنے ابھرا۔ دل کے کسی گوشے سے صدا آئی۔

''کیا فیصلہ ہے اب تمہارا؟''

''فیصلہ''

مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیل گئی۔ کروٹ لیتے ہوئے اس نے خود سے کہا:۔

''میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اپنے مقدر سے اپنی خوشیاں واپس لوں گا۔ حالات خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔''

''جانے اب اس کی طبیعت کیسی ہے؟ صبح میں فون کروں گا اور شام کو اس کے گھر جاؤں گا۔''

اگلی صبح جب وہ ہسپتال کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ تو انہیں تار ملا۔ تار ڈھاکہ سی۔ ایم۔ ایچ ہسپتال کے ڈاکٹر کرنل کی طرف سے دیا گیا تھا۔ جس میں اس کے عزیز دوست اویس کی شدید بیماری کی اطلاع تھی۔

''اویس بستر مرگ پر ہے۔'' کچھ بھی تو یاد نہ رہا۔ فوراً چھٹی کی درخواست دی۔ سیٹ بک کروانے کے لیے ہوائی اڈے فون کیا اور چھ بجے وہ ڈھاکہ جا رہا تھا۔

باب نمبر: 24

"بھئی تمہاری مس صاحبزادی اب بالکل ٹھیک ہیں۔انہیں آرام کرنے دو۔"

ڈاکٹر ضیاء نے تسلی دینے کے انداز میں ان نوکروں سے کہا جو اترے ہوئے چہروں سے اس کے بستر کے گرد کھڑے تھے۔ڈاکٹر کی بات پر ننکو کے سوا سبھی چلے گئے۔

"ڈاکٹر صاحب آج آجائیں گے نا۔ننکو نے لیڈی ڈاکٹر سے پوچھا۔"

"اُمید تو ہے۔آگے دیکھیں۔ڈاکٹر ضیا نے انجکشن لگاتے ہوئے کہا۔

پچھلے چار پانچ برس سے ڈاکٹر اشرف ہر ماہ کے تین چار دن ان دور دراز کے علاقوں میں گزارتے۔جہاں طبی سہولتوں کا کوئی انتظام نہ تھا۔اکثر و بیشتر علاقوں میں لوگوں کی مدد سے انہوں نے چھوٹے چھوٹے کلینک کھلوائے اور وہاں ان کے متعین کیے ہوئے کمپونڈر اس جذبہ و لگن سے کام کر رہے تھے۔جو ایک ڈاکٹر کی فطرت کا خصوصی حصہ ہے۔سیدھے سادے دیہاتی لوگ انہیں ایک فرشتہ سمجھتے۔موت کے ہاتھوں بیزار مریض آتے اور جب نئی زندگی پا کر جانے لگتے تو تو فرطِ عقیدت سے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر آنکھوں سے لگانے کی کوشش کرتے۔تب وہ بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں ہاتھ چھڑاتے ہوئے عاجزی سے کہتے۔

"گناہگار نہ کیجئے!میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔یہ تو میرا فرض تھا"۔

زیادہ خطرناک مریضوں کو وہ اپنے ہسپتال لے آتے اور شاید یہ انہی لوگوں کی دعاؤں کا اثر تھا کہ ہسپتال دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔حالانکہ ہسپتال میں آنے والے مریضوں کا دوتہائی حصہ غریبوں پر مشتمل ہوتا۔جن کا علاج مفت ہوتا تھا۔

لیکن امیر طبقہ بھی ڈاکٹر اشرف کی طرف رجوع کرتا اور صحت یاب ہونے پر دل کھول کر عطیہ دے جاتا۔

ڈاکٹر صاحب نے بھی کیا طبیعت پائی ہے۔خود کو مریضوں کے لیے ہی وقف کر دیا۔ ایک دن بھی سکون سے گھر نہیں گذارتے۔''ننکو نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''وہ انسانیت کے اتنے بلند مقام پر ہیں ننکو! کہ ہم جیسے لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ انہیں اپنے فن اور مریضوں سے عشق ہے۔وہ بہت عظیم ہیں۔''ڈاکٹر ضیا کے لہجے میں بے پناہ عقیدت تھی۔۔بے حد احترام تھا۔

عمر کرکٹ کھیل کر گھر واپس آیا تو پتہ چلا۔ویسے ہی بلا ہاتھ میں پکڑے دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔

''شیبہ آپی''بہن کو بے سدھ پڑے دیکھ کر وہ چلایا۔

''یوں نہیں''ڈاکٹر ضیا اس کی گھبراہٹ پر مسکرا اٹھیں۔

''میری آپی ٹھیک ہیں نا ڈاکٹر!''وہ بہن کے قریب آ کر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھامتا ہوا بولا۔

شیبہ نے آنکھیں کھولیں۔بازو پھیلائے اور عمر کو بانہوں میں سمیٹ لیا۔

اس کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے مدھم سی آواز میں بولی۔

''میں ٹھیک ہوں گھبراؤ نہیں عمر!''

''آپ کو کیا ہو گیا آپی؟''اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

''کچھ نہیں ہوا عمر! بس میں سفر کی وجہ سے طبیعت ذرا خراب ہو گئی ہے۔''ڈاکٹر نے عمر کو

تسلی دی۔

''دادی اماں اور اسما پھوپھو ٹھیک تھیں نا۔'' عمر نے پوچھا۔

''بالکل ٹھیک تھیں۔'' شیبہ نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر ضیاء چلی گئیں۔ ساڑھے آٹھ بجے جب عمر بس جوس دے رہا تھا۔ بیگم اشرف عامر کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئیں۔ ماں کو دیکھتے ہی اس نے اٹھنا چاہا لیکن عامر بہن سے یوں لپٹ گیا کہ وہ اٹھ ہی نہ سکی۔ بیگم اشرف نے اس کے رخسار تھپتھپاتے ہوئے وجہ پوچھی۔

وجہ جان کر بھڑک ہی تو اٹھیں۔ نخوت سے بولیں۔

تمہیں بس میں سفر کرنے کا مشورہ کس دیوانے نے دیا تھا؟''

جواب دینے کی بجائے اس نے خاموش رہنا ہی زیادہ مناسب سمجھا۔

''بیگم اشرف غصے سے بڑبڑائیں۔ ان گنوار دیہاتنوں کو خیال نہ آیا، لڑکی کو بس میں نہ بھیجیں''۔

عمر اور شیبہ کا چہرہ ماں کی اس بات پر سرخ ہو گیا۔

''ممی''

عمر نے کچھ کہنے کے لیے زبان کھولی ہی تھی کہ بہن نے آنکھیں دکھائیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بات بڑھے۔ نگاہوں کا مفہوم سمجھ کر عمر کے الفاظ گلے ہی میں گھٹ کر رہ گئے۔ بیگم اشرف گردن موڑ کر عمر کی طرف دیکھتے ہوئے غصے سے پیچ و تاب کھاتی ہوئے بولیں۔

''رک کیوں گئے؟ کیا کہنا چاہتے تھے تم؟''

''کچھ نہیں'' اس نے غصے اور ناگواری کے ملے جلے جذبات سے کہا۔

''اُن کے خلاف ایک بات بھی کہہ دوں تو انہیں آگ لگ جاتی ہے اور میرے خلاف وہ خواہ زہر اُگلتے رہیں۔'' ان کا غصہ عروج پر پہنچا ہوا تھا۔

''نہیں ممی آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے ۔ دادی اماں اور اسما پھوپھو آپ کی بہت تعریف کرتی ہیں ۔''

اُس نے قدرے چاپلوسی کرتے ہوئے کہا۔

''بس رہنے دو میں سب جانتی ہوں ۔اس ڈائن کا میرے سامنے کبھی نام بھی نہ لینا۔ ظالم اور سفاک عورت ۔پتہ نہیں کیا کیا کرتی رہتی ہے؟''

''اُنہیں کرنے کرانے کی کیا ضرورت پڑی ہے'' حد درجہ ضبط کے باوجود بھی عمر بولنے سے باز نہ رہ سکا۔اور یہی چیز بیگم اشرف کو مشتعل کر گئی۔کڑک کر بولیں ۔

''تمہیں اب بھی شک ہے ۔تم ابھی تک اسے جھوٹ خیال کرتے ہو۔تمہارے نزدیک وہ بہت نیک اور پارسا ہیں ۔آنکھوں کو ذرا کھول کر دیکھو کیا ان پر پردہ پڑا ہوا ہے کیا تمہارے دل ان کی مٹھی میں نہیں ہیں ؟ تمہاری زبانیں ان کے قابو میں نہیں ،اور تم بالکل وہی نہیں کرتے جو وہ چاہتی ہے ۔تم لوگوں نے ماں کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا ہے ۔میرا تو دل جل کر کوئلہ ہو گیا ہے ۔جی چاہتا ہے کبھی تمہاری منحوس شکلیں نہ دیکھوں ۔لیکن ماں ہوں ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو جاتی ہوں ۔کوئی بات نہیں سارے بدلے لے اگر ایک ہی دفعہ نہ لیے ۔تو میرا نام بھی فریدہ نہیں ؟''

دندناتے ہوئے وہ پردہ اٹھا کر باہر چلی گئیں ۔

''خدا جانے ممی کے دل کو کیا ہو گیا ہے؟ کیا کیا غلط فہمیاں دماغ میں سما گئی ہیں''؟ شیبہ نے دُکھی لہجے میں کہا۔

اور عامران تمام باتوں سے بے نیاز اس کے گلے میں بانہیں ڈالے دادی اور اسما پھوپھو کے متعلق پوچھ رہا تھا۔تلخ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی

''ان میں سے ایک بھی تو ایسا نہیں جو اُن کے نام کی مالا نہ جپتا ہو۔بے لوث محبت اور خلوص اگر جادو ہے تو اسما پھوپھو یقیناً جادوگر ہیں ۔شیبہ نے دل ہی دل میں سوچا''۔

رات کے دس بجے ڈاکٹر اشرف کی کار پورچ میں آ کر رُکی تو نوکر نے انہیں شیبہ کی آمد اور خرابی طبیعت کی اطلاع دی۔

سیدھے وہ اس کے کمرے کی طرف بھاگے۔عمر کرسی پر بیٹھا کسی کتاب کے مطالعہ میں غرق تھا۔شیبہ پر غنودگی سی طاری تھی۔ابھی تک اس کے دماغ میں پٹرول کی بُو رچی ہوئی تھی۔باپ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر عمر مسکراتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

ڈاکٹر اشرف اس کے کندھے تھپتھپاتے ہوئے شیبہ کی طرف لپکے۔

''کیا ہوا شیبہ کو؟''ان کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔

''بس میں سفر کرنے کی وجہ سے طبیعت خراب ہو گئی تھی۔عمر نے جواب دیا۔

دھیرے سے جھک کر انہوں نے ہاتھ پیشانی پر رکھا۔اس کے ساتھ ہی شیبہ کی آنکھ کھل گئی۔باپ کو اپنے اوپر جھکا ہوا دیکھ کر اس نے بازو پھیلا دیئے۔ننھے سے بچے کی طرح انہوں نے اسے بازوؤں میں اٹھا لیا۔باپ کے سینے سے سر لگاتے ہوئے نہ معلوم کیوں اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

اس کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

بیٹے آپ نے فون کیا ہوتا۔میں گاڑی بھیج دیتا''میں بالکل ٹھیک ہوں پاپا۔آپ فکر نہ کریں۔''

کتنی ہی دیر وہ اس سے گھر والوں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔

اور پھر نیند سے اس کی آنکھیں بوجھل ہوتی دیکھ کر آہستگی سے اُسے لٹا کر عمر کو اپنے ساتھ لے گئے۔

صبح وہ اٹھی تو اس کی طبیعت کافی سنبھلی ہوئی تھی۔غبار کچھ کم ہو گیا تھا۔آنکھیں کھلی تھیں اور گزشتہ دن کا سفر اپنی تمام تر شرمندگیوں اور ندامتوں کے ساتھ اُسے یاد آ رہا تھا۔

''خدایا میں اتنی بے سُدھ کیوں ہو گئی تھی۔اس سے میں مر کیوں نہ گئی۔وہ کیا کہتے

ہوں گے۔کیسی واہیات اور بدتمیز لڑکی ہے۔''

اُسی لمحے باوقار سی ایک آواز میں کہے گئے چند الفاظ اس کی سماعت سے ٹکرائے۔

''مطمئن رہیے آپ اور آپ کی عزت کی حفاظت میرا فرض ہے۔''

ذہن نے کتنی بار یہ الفاظ دہرائے۔کتنی ہی باتیں آہستہ آہستہ یاد آتی گئیں۔ان کا پوری سیٹ ریزو کروانا۔درمیانی جگہ چھوڑ کر کونے پر بیٹھنا۔اس معمر انسان کا جگہ کے لیے تقاضا کرنا۔اُن کی ہچکچاہٹ اور تذبذب، پھر مجبور ہو کر درمیانی جگہ پر آجانا۔اجسام کا باہمی ٹکراؤ، ان کی پریشانی اور حتی الامکان اپنے بوجھ کو ساتھی پر ڈالنے کی کوشش، سب ان کی شرافت اور اعلیٰ کردار کی کھلی نشانیاں تھیں۔ان کا بلند ظرف اس شبیہہ کی مانند نظر آتا تھا۔جو اپنی پوری تابانیوں سے آئینہ میں جگمگا رہی ہو۔واقعی وہ بہت ٹھوس کردار کے مالک ہیں۔اماں پھوپھو ٹھیک ہی کہتی تھیں۔

پھر اُسے ان کا پُر خلوص رویہ یاد آیا۔پانی اور چائے دینا، بسوں کے اڈے پر پہنچ کر اس کا کھڑا نہ ہو سکنا۔آنکھوں میں بے بسی اور بے چارگی کی کیفیت دیکھنا۔بازو سے پکڑ کر انتہائی شفقت سے نیچے اتارنا۔

یہ سب باتیں اُسے بے طرح یاد آرہی تھیں۔

''اتنا آگے مت بڑھنے کی کوشش کرو کہ واپس لوٹتے وقت تکلیف ہو یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ اس نے یہ سب کچھ تم پر رحم کھاتے ہوئے کیا ہے۔''

ذہن نے آگے بڑھتے ہوئے خیالات کو یکدم روک دیا۔

''مجھ پر رحم کھاتے ہوئے ......نہیں ......نہیں۔'' اُس نے اس خیال کو دل سے نکالنا چاہا۔وہ بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔آنکھیں پوری طرح پھیل چکی تھیں۔

چونک کیوں گئی ہو؟ حیران کیوں ہو اٹھی ہو۔حقیقت تلخ ہوتی ہے نا۔

یقیناً اس نے تم پر رحم کھایا ہے۔اس لیے کہ اُس وقت تم پوری طرح اس کے رحم و کرم پر تھیں۔''دماغ نے بھرپور حملہ کیا۔

نہیں یہ غلط ہے۔ یہ جھوٹ ہے۔ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں مظلوم نہیں تھی جس پر رحم کھایا جاتا۔''......دل نے اس خیال کو شکست دینا چاہی۔

جھوٹ کیسے ہے؟ غلط کیوں ہے؟ یہ بے بسی اور بے چارگی نہیں تھی تو اور کیا تھا۔کہ تم یوں بے سُدھ ہو کر اس کے شانے سے جا لگی تھیں۔ایک انسان جب اس حد تک مجبور ہو جائے تو اس پر رحم ہی کھایا جاتا ہے۔''

لیکن دل بھی دماغ کے خلاف لڑائی کے پورے ہتھیاروں سے لیس معلوم ہوتا تھا۔

''رحم کیوں اسے ہمدردی کا نام بھی تو دیا جا سکتا ہے۔''

''کیسی ہمدردی؟ ذرا ٹھنڈے دل سے غور تو کرو۔عمیق نظروں سے جائزہ تو لو۔ جذبات سے ہٹ کر حقیقت کو پرکھنے کی کوشش تو کرو۔صورتِ حال تم پر خود ہی آشکارا ہو جائے گی۔ وہ تم سے بازار میں ملا۔لیکن اس نے تمہیں ملنا تک گوارا نہ کیا۔تم اُن کے گھر گئیں۔پورے چھ گھنٹے وہاں گذارے لیکن وہ نہیں آیا۔ان الفاظ کو یاد کرو جو اُس نے روشن کے کہنے پر کہے تھے۔''

اب ساتھ جا رہی ہیں۔خیال تو رکھنا ہی پڑے گا۔''

کتنی مجبوری ہے ان الفاظ میں۔کیا تم خود نہیں سوچ سکتیں؟ ان ٹھوس حقائق کے سامنے کیا تم کہہ سکتی ہو کہ اُس نے تم پر رحم نہیں کھایا۔اس کی آنکھوں سے ٹپکتا وہ انداز نخوت تم کیوں بھول گئیں؟

اور ہاں ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ابھی دیکھ لینا وہ تمہیں بیمار چھوڑ کر گیا ہے اس کا فرض ہے کہ وہ خود تمہاری عیادت کے لیے آئے یا فون پر پوچھے۔چلو فیصلہ ہو جائے گا۔''

''خدایا''اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔دماغ چکرا رہا تھا۔ذہن کھول رہا تھا۔جسم جل رہا تھا۔

اضطراری حالت میں وہ کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ہتھیلیوں کو مل رہی تھی۔

''نہیں نہیں ایک خوددار انسان دوسروں کی خودی کبھی مجروح نہیں کرتا''۔

اس کے دل نے مبہم سی تسلی دی۔لیکن دماغ کی یورش اتنی زیادہ تھی کہ یہ معمولی تسلیاں خس وخاشاک کی طرح بہہ گئیں۔

ایک جھٹکے سے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر اُس نے باہر جھانکا۔اگست کے آخری دنوں کا سورج صبح سے ہی آگ برسانے لگا تھا۔ایسی آگ جیسی کہ اس کے دل میں لگی ہوئی تھی۔وہ پلٹی کسی پل اُسے چین نہیں آرہا تھا۔

''اللہ کرے اگر مجھے اس شدنی کا پتہ ہوتا تو میں وہیں انکار کر دیتی۔بلا سے اگر دادی اماں ناراض ہو جاتیں۔کم ازکم میری غیرت اور خودداری تو نہ کچلی جاتی۔آہ میں کیسے وہ وقت لاؤں۔وہ وقت جو گذر گیا کبھی لوٹ کر نہ آئے گا۔اور وہ داغ جو سینے پر ایک بار پڑ گیا کبھی نہ مٹ سکے گا۔''

آج یونیورسٹی کھل رہی تھی۔اس نے کروڑ بار نہیں تو لاکھ بار ضرور خدا کا شکر ادا کیا ہوگا۔ پچھلے چند دنوں سے خود سے الجھ الجھ کر وہ نیم پاگل ہو گئی تھی اور جب اپنی توہین کا احساس شدت اختیار کر جاتا تو وہ جلتی کڑھتی اپنے آپ کو کوستی۔لیکن کچھ بھی تو نہ کر پاتی۔دل اور دماغ ایک دوسرے کے خلاف سرگرمی سے صف آرا ہوتے۔لیکن فتح ہمیشہ دماغ کی ہوتی۔شروع شروع کے ایک دو دن وہ لاشعوری طور پر کسی کی آمد اور فون کی منتظر رہی لیکن یہاں بھی اسے زبردست شکست ہوئی اور اسے اس حقیقت کو ماننے ہی بن پڑی کہ واقعی جو کچھ اس نے کیا تھا سب رحم کے وقتی جذبے کے تحت کیا تھا۔ورنہ حقیقتاً وہ انتہا درجے کا خود پرست انسان ہے۔

رحم کا یہ احساس اس کے تن بدن میں آگ لگا جاتا۔وہ کھولتی ہوئی خود سے کہتی۔

''ایک انسان دوسرے انسان سے نفرت کرنے کا حق رکھتا ہے۔دشمنی رکھ سکتا ہے۔وہ اگر چاہے تو ہمدردی کر سکتا ہے لیکن ایک انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی پر رحم کھائے۔ایک خود دار انسان پر رحم کھانا تو اس کی خودداری اور غیرت کے منہ پر طمانچہ ہے۔اس کی انانیت کو مجروح کرنے کے مترادف ہے۔''

ایسے ہی خیالات میں وہ سارا دن الجھی رہتی۔ کتابیں سامنے کھلی ہوتیں لیکن وہ ایک لفظ بھی نہ پڑھ سکتی۔ اتنے دنوں پہلے وہاں سے صرف اس امید پر بھاگی تھی کہ گھر جا کر کچھ تیاری کر سکے گی۔ لیکن اسے یہ نہ معلوم تھا کہ ایک نئی مصیبت جان سے چمٹنے کا انتظار کر رہی ہے۔

سواسات بجے جب اس کی گاڑی، کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ کے کمپاؤنڈ میں جا کر رُکی تو کار سے نکلتے ہی وہ بھاگی، تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ لیڈیز روم کی طرف لپکی۔ اندر جاتے ہی جونہی فوزیہ، نغمہ، عذرا اور عطیہ نے اسے دیکھا۔ سب زوردار قہقہے لگاتی اس کی طرف جھپٹیں۔

یکدم اتنے سارے بازو گردن میں حمائل ہو گئے۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ اتنا بے پناہ شور اور پھر سب سے بڑھ کر ان کا تنگ گھیرا۔ وہ چلائی۔

''خدا کے لیے اب مجھے چھوڑو گی بھی یا یونہی میرا کچومر نکالنے کا ارادہ ہے۔''

اس نے خود کو ان کے گھیرے سے آزاد کرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''تجھ جیسا بے مروت انسان دُنیا میں شاید ہی کوئی نظر آئے۔ ستر بار ہم تیرے گھر گئے۔ بہتر بار تجھے فون کیے۔ لیکن ہر بار ایک ہی جواب ملا'' بیگم صاحبہ ! ابھی گاؤں سے واپس نہیں آئیں۔'' نغمہ نے اسے کندھوں سے پکڑ کر خوب زور سے ہلاتے ہوئے کہا۔

''وہاں جا کر اسے سریش لگ گئی تھی۔ تمہیں نہیں معلوم نغمہ'' عطیہ نے چوٹ کی۔

''وہاں اس کے کزن وزن آئے ہوں گے نا عیش رہے ہوں گے۔ دین دنیا ہی کھو بیٹھی تھی۔'' عذرا نے تنک کر کہا۔

''بالکل۔ لیکن عذرا سویٹ آئینے میں اپنا ہی چہرہ نظر آتا ہے۔'' اس نے قدرے مسکراتے ہوئے دائیں آنکھ دبا دی۔

''ہوش میں آؤ۔ ڈاکٹر رانا کلاس لے رہے ہیں۔ متین نے اندر آتے ہوئے کہا۔

سب نے کتابیں سنبھالیں۔ اور دوپٹے ٹھیک کرتی آگے پیچھے کلاس روم کی طرف

بڑھنے لگیں۔ عطیہ کچھ آگے جا رہی تھی۔ رُک کر شیبہ کا انتظار کرنے لگی۔ جب وہ قریب آ گئی تو اس کے کان کے قریب منہ لے جاتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

''شیبہ تمہارے اس ''وردی والے'' کا کیا حال ہے؟''

''میرا وردی والا؟'' شیبہ نے اس کی طرف تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''دماغ خراب ہو گیا ہے۔ علاج کراؤ اس کا ورنہ پاگل خانے جانے کی نوبت آ جائے گی۔''

''مزاج برہم کیوں ہو گئے ہیں جناب کے؟ میں نے صرف حال ہی پوچھا ہے چال نہیں۔''

عطیہ نے ذو معنی بات کہتے ہوئے گہری نظروں سے اُسے دیکھا۔ انداز غصیلا تھا۔

''کیوں خیریت ہے؟ کیا لڑائی ہو گئی ہے؟ عطیہ نے اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوتا دیکھ کر قدرے حیرانی سے کہا۔

عقل کے ناخن لو عطیہ! تم نے کب اس کے ساتھ میری گہری چھنتے دیکھی ہے جو لڑائی کا کہہ رہی ہو۔''

''اچھے بھلے اس کے ذکر پر تم یوں سیخ پا ہو رہی ہو تو اور کیا کہوں؟''

''بس میں اس کے متعلق ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتی۔'' شیبہ نے انتہائی کٹیلے لہجے میں کہا۔

''اے ہے۔ کیا قصور سرزد ہو گیا اس غریب سے جو یوں اس کا نام بھی سننے سے بیزار ہو۔'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''جان نہ پہچان تمہیں بڑی ہمدردی ہو رہی ہے اس سے۔'' شیبہ جل ہی تو اٹھی تھی۔

''ہاں تو میری اس سے دشمنی بھی کیا ہے؟ خود ہی سوچو نا!'' عطیہ نے قصداً اُسے چھیڑا۔

''دفع ہو پھر'' شیبہ غصے سے منہ پھلاتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ لیکن عطیہ نے اس کا

بازو پکڑ کر پیچھے گھسیٹ لیا اور مسکراتے ہوئے بولی"۔

"بھئی ہماری شیبہ ہم سے ناراض نہ ہو۔ ہماری کیا مجال جو ہم کبھی اس پیارے سے انسان کا ذکر کریں۔ چلو غصہ تھوکو۔" عطیہ نے اس کا داہنا ہاتھ دبایا۔

کلاس روم آ گیا تھا۔ ورنہ شیبہ کچھ اور سنا دیتی۔ پہلا دن تھا۔ پریڈ ادھر اُدھر کی باتوں میں گذر گیا۔

بارہ بجے وہ سب کینٹیریا کھانا کھانے چلی گئیں، میز کے قریب بیٹھتے ہوئے فوزیہ نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اطلاع عام ہے کہ عذرا بائیس اکتوبر کو ہاتھوں میں مہندی رچانے کا نیک ارادہ رکھتی ہے۔"

"سچ؟" سبھی چلا اٹھیں۔ بھلا عطیہ اور خاموش رہ جاتی یکدم چیخی۔

"بڑی جلدی مچا رکھی ہے تیرے انجینئر نے۔ چند مہینے اس سے اور صبر نہیں ہو سکتا تھا۔ ایم ایس سی کی ڈگری کے ساتھ ساتھ متقی کا گولڈ میڈل بھی مل جائے گا۔"

سبھی کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ عذرا کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔

"ہاں منی تیرے رومانس کا کیا حال ہے۔ بے چارے نے کتنی منزلیں طے کی ہیں؟"

نغمہ نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے مُنی سے پوچھا۔

"ہاں واقعی ہم تو بھول ہی گئے۔ مُنی اِمنا تیرے گھر گیا تھا۔ کیا فیصلہ ہوا۔" شیبہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ممی نے تو پسند کر لیا ہے ڈیڈی بھی رضامند ہو گئے ہیں۔" مُنی نے کباب کھاتے ہوئے مزے سے تفصیل سنائی۔

"مجبوری کا نام شکریہ پیاری۔ پسند تو کرنا ہی تھا۔ صاحبزادی جو دل دیئے بیٹھی تھی"۔ عطیہ نے گہری چوٹ کی۔

''منی تو اس بات پر تلملا اٹھی ۔ چلاتے ہوئے بولی ۔

''تم کون ہو میرے معاملات میں دخل دینے والی؟ ہمیشہ دل جلانے کی بات کرتی ہو ۔ خبردار......''

''بس بس اب لڑائی نہ شروع کر دینا ۔'' شیبہ نے مداخلت کی ۔

چائے پی کر وہ ڈیپارٹمنٹ کی طرف جانے لگیں ۔ تو عطیہ نے شیبہ سے کہا ۔

''بھئی کچھ میرے پلے بھی ڈالو، کیا بات ہے؟''

شیبہ سمجھ گئی تھی کہ وہ کیا پوچھنا چاہتی ہے، تیزی سے بولی ۔

''تیرا دماغ سچ مچ ٹھکانے نہیں ہے ۔ مَیں تو فکرمند ہوں ۔ کہ تیرا ڈاکٹر کیا کہے گا؟ کس پاگل لڑکی سے واسطہ پڑ گیا ہے ۔''

''کوئی بات نہیں ہم انشاء اللہ اسے بھی پاگل بنا ڈالیں گے ۔ کہنے سننے کا سوال ہی ختم ہو جائے گا ۔''

لیکچرار آصف کی کلاس تھی، یہ نئے لیکچرار صفدر کی جگہ آئے تھے ۔ عطیہ آخری سیٹ پر بیٹھی شیبہ سے سرگوشیوں میں کہہ رہی تھی ۔

''اس کی آنکھوں میں قیامت کی چمک ہے ۔ شیبہ دیکھا بھی نہیں جاتا ۔''

''اور تمہارا دیکھے بغیر گذارہ نہیں ہے ۔'' شیبہ نے کاپی پر لکھتے ہوئے آہستہ سے کہا ۔''

دن تیزی سے گذرتے جا رہے تھے ۔ آج کل وہ ہر احساس سے بے نیاز پڑھائی میں ہمہ تن مصروف تھی ۔ پچھلے دنوں جو ٹسٹ ہوئے اس میں پہلی بار اس کی بجائے اس کا کلاس فیلو اسلم فرسٹ آیا ۔ سبھی حیران رہ گئے کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا ۔ وہ ڈیپارٹمنٹ کی ذہین ترین طالبہ سمجھی جاتی تھی ۔ آنسو اس کی آنکھوں سے اُس دن چھلکنے کے لیے مچلتے رہے ۔ لیکن اس نے ان پر قابو پائے رکھا ۔ اب وہ سخت فکرمند تھی کہ کہیں دسمبر ٹسٹ میں اپنی اپوزیشن نہ کھو بیٹھے اور یہی وہ احساس تھا جس نے اُسے جھنجھوڑ کے رکھ دیا ۔

ٹھیک نو بجے اُس نے پنسل رکھ دی۔ڈایا گرام مکمل ہو چکی تھی اوراب بھوک زوروں پر تھی۔کھانے کے کمرے میں آئی تو میز پر صرف عمر اور عامر تھے۔بیگم اشرف کسی جلسے میں گئی ہوئی تھیں اورڈاکٹر صاحب شاید ہسپتال میں تھے۔''

''نانو پاپا کو کھانے کا کہہ آنا تھا۔''

''پاپا نہیں آئیں گے......چند آفیسرز ہسپتال دیکھنے آئے ہوئے ہیں۔''

عمر نے پلیٹ میں چاول ڈالتے ہوئے کہا۔

''آپی آج میں نے پی۔اے۔ایف سٹیڈیم میں کرکٹ میچ دیکھا۔پی۔اے۔ایف کے ایک ڈاکٹر منیب فرخ نے اتنے شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔انہوں نے ستاسی رنز بنائے۔ان کے کھیل کو تماشائیوں نے بہت پسند کیا۔وہاں موجود کئی لوگ ان کے اخلاق کی بھی تعریف کر رہے تھے۔''

عمر اس کے جذبات سے بے نیاز اُسے کھیل کی تفصیل بتا رہا تھا اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔جیسے عمر کی زبان سے نکلتا ہوا ہر لفظ اس کے ذہن پر کسی ہتھوڑے کی طرح پڑ رہا ہو۔

توہین کا وہ احساس جسے اس نے کسی حد تک دبا دیا تھا پوری شدت سے دوبارہ جاگ اٹھا۔کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

لوگ تو احمق ہیں جو تن کے اُجلے پن کو دیکھتے ہیں۔انہیں باطن کی سیاہیوں کا علم نہیں۔''

اس نے کھولتے ہوئے خود سے کہا۔

باب نمبر: 25

ساڑھی کا پلو ٹھیک کرتے ہوئے اُس نے ایک نظر قدِ آدم آئینے پر ڈالی۔ اس کا میک اپ سے بے نیاز چہرہ اس شگفتہ گلاب کی طرح تھا جسے شبنم رات بھر نہلاتی رہی ہو اور صبح اس کی پنکھڑیاں اپنے چہروں پر شبنمی موتیوں کو لیے حسن و دلکشی کا دلفریب سماں پیدا کر رہی ہوں ساڑھی کے پلو سے خود کو اچھی طرح لپیٹتے ہوئے وہ باپ کے کمرے میں داخل ہوئی۔ ڈاکٹر اشرف تھوڑی دیر قبل قرآن پاک کی تلاوت سے فارغ ہو کر ان مریضوں کی فائلیں دیکھ رہے تھے۔ جن کا انہیں آج آپریشن کرنا تھا۔ شیبہ کمرے میں داخل ہوئی۔ تو باپ کو فائلوں پر جھکا دیکھ کر اس کی بھنویں تن سی گئیں۔

''واہ پاپا آپ ابھی تک ایسے ہی بیٹھے ہیں۔ میں تیار ہو کر بھی آ گئی ہوں۔ ان لوگوں نے ٹھیک آٹھ بجے کا وقت دیا تھا۔ پہنچتے پہنچتے تو دس بج جائیں گے۔''

ڈاکٹر اشرف بیٹی کے انداز پر شفقت سے مسکرائے اور پدرانہ محبت کی گہری نظر اس پر ڈالتے ہوئے بولے۔

''صبح ہی صبح لڑنے کا موڈ بنا لیا ہے۔ میرے پاس آ کر بیٹھو۔ تو میں تمہیں کچھ بتاؤں''۔

بس دیکھا نہ پاپا۔ اس نے کسی قدر جھلاتے ہوئے کہا۔

''مجھے پہلے ہی خدشہ تھا کہ آپ اِدھر اُدھر کے بہانے بنائیں گے کبھی نہیں جائیں

گے۔وہ فرش پر پیر پٹخ رہی تھی۔

''میری بیٹی تو اب ولی ہو گئی ہے کچھ بانٹنا چاہیے مجھے''۔انہوں نے مسکراتے ہوئے بیٹی کا غصہ زائل کرنے کیلئے کہا۔

''بس پاپا آپ مجھے بنائیں نہیں۔فوراً تیار ہو جائیں۔آج میں کچھ نہیں سنوں گی۔'' اس نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔

''بڑا زبردست الٹی میٹم دیا ہے۔لیکن بیٹے میری مجبوریوں کو بھی تو دیکھو آج مجھے چھ آپریشن کرنے ہیں۔ان میں سے تین تو بہت زیادہ خطرناک ہیں جنہیں کل تک کے لیے ملتوی کرنا انتہائی خطرناک ہے۔

''اللہ۔پاپا آپ کو کبھی مریضوں اور آپریشنوں سے نجات بھی ملے گی وہ روہانسی ہو کر بولی۔

''ہاں بیٹے زندگی میں تو ان سے چھٹکارا مشکل ہے۔لیکن موت مجھے ان سب سے جدا کر دے گی۔''

''پاپا''وہ ان کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے چیخی۔

''خدا ہماری زندگی بھی آپ کو دے دے۔پاپا آپ نے کیسی بات کہی ہے؟''۔اس کا لہجہ انتہائی دردناک ہو گیا تھا۔آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

''موت تو ایک اٹل حقیقت ہے اس سے کیا گھبرانا۔''؟

لیکن بیٹی کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھ کر وہ خود بھی اداس ہو گئے۔اس کے چہرے کو پیار سے اوپر اٹھایا۔آنسو صاف کیے اور دھیرے سے بولے۔

''تمہاری ممی بھی تو ساتھ جا رہی ہیں۔''

''کہاں پاپا؟انہوں نے کل شام ہی جانے سے انکار کر دیا تھا۔''

تفکر سا ان کے چہرے پر پھیل گیا۔وہ کچھ سوچ میں پڑ گئے تھے۔

دراصل مجھے ....

باپ کی پریشانی اچھی طرح سمجھتی تھی۔ان کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

ٹھیک ہے پاپا۔آپ کی تو مجبوری ہے۔میں عطیہ کو فون کرتی ہوں اس نے کمرے سے باہر جاتے ہوئے کہا۔

فون کیا لیکن عطیہ جا چکی تھی۔اب تنہا جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔پیکٹ اٹھایا اور پورچ کی طرف بڑھی۔پچھلی سیٹ پر کھڑکی کے راستے اُس نے پیکٹ پھینک دیا۔

اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی سٹارٹ کر دی۔چھوٹی چھوٹی سڑکوں کو کراس کرتی گاڑی اب تیزی سے مین روڈ پر دوڑ رہی تھی۔شہر کی حدود پیچھے رہ گئی تھیں۔کار دوڑتی رہی حتیٰ کہ اس نے گاڑی اس کچی سڑک پر موڑ دی جو سیدھی عذرا کی کوٹھی کو جاتی تھی مین روڈ سے دس میل کے فاصلے پر زمینوں کے درمیان عذرا کے دادا نے اپنی رہائش کیلئے عالیشان گھر تعمیر کروایا تھا۔اور یہیں اس کی دادی کی خواہش کے مطابق شادی کی رسوم ادا ہونا تھیں۔

اچانک ایک آواز پیدا ہوئی اور چلتی گاڑی یکدم رُک گئی۔اس نے گیئر بدلنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکلی۔انجن کے ڈھکن کو اٹھایا۔لیکن دیکھتی کیا۔مشینری کے متعلق تو کوئی خاص علم نہ تھا۔چند ایک پرزوں کو دیکھا۔جن میں خرابی کا احتمال ہو سکتا تھا۔لیکن وہ بالکل ٹھیک تھے۔دوبارہ چلانے کے لیے بیٹھی۔لیکن گھر گھر کی آواز کے سوا کچھ بھی تو نہ ہو سکا۔پھر دو تین مرتبہ کوشش کی لیکن ہر کوشش ناکام ثابت ہوئی۔تھک کر وہ ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

اب اس نے گردوپیش کا جائزہ لینا شروع کیا۔خودرو جھاڑیاں کیکر اور ببول کے درخت اونچی نیچی کھائیاں۔حدِ نظر کسی گاؤں کے آثار اُسے دکھائی نہ دیئے۔یکدم خوف سے اسے جھرجھری سی آ گئی۔

””اگر مجھے کوئی یہاں آ کر پکڑ لے تو میں کیا کر سکتی ہوں؟ میری تو آواز بھی یہاں

ویرانوں میں دب کر رہ جائے گی یا اگر کوئی جنگلی جانور ہی آ جائے تو '' وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ جیسے واقعی کوئی گھات لگائے بیٹھا ہو اور پھر کار کا دروازہ کھول کر اس میں داخل ہو گئی۔ کار کے شیشے چڑھا لیے، خوف سے اسے کپکپی محسوس ہونے لگی۔

'' خدایا کس منحوس گھڑی میں گھر سے نکل آئی۔ کم از کم سید علی کو ہی لے آتی۔ مرد تھا۔ سہارا ہی ہو جاتا۔'' پھر اسے عذرا پر بے تحاشہ غصہ آنے لگا۔

'' کم بخت اتنی دور بھلا شادی رچانے کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن غور کرنے پر وہ بھی بے قصور نظر آئی۔ کیونکہ اس نے تو پہلے ہی بتا دیا تھا اس کی دادی شہر میں شادی کرنا نہیں چاہتیں۔ خود پر بے طرح غصہ آیا۔ اپنے آپ کو کوستے ہوئے بولی'' چلی تھیں بے چاری ڈرائیونگ کرنے۔ پہلے ماہر تو بن جاؤ۔ لو اب مزہ چکھو ان ویرانوں میں''۔

دس بج چکے تھے۔ پون گھنٹہ ہو چکا تھا اور اسے دُور دُور تک کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔

'' یوں ہمت ہار بیٹھو گی تو کچھ نہیں بنے گا۔ باہر نکل کر دیکھو۔ شاید کوئی ایسا شخص نظر آ جائے جو تمہاری مشکل حل کر سکے۔'' اس کے دماغ نے تجویز پیش کی۔

وہ کار سے باہر نکلی۔ ذرا فاصلے پر ببول کا ایک درخت تھا۔ جس کی چھاؤں چھدری چھدری سی تھی۔ تیز دھوپ سے پناہ لینے کے لیے وہ درخت کے نیچے جا کھڑی ہوئی لیکن دل اتنا بے سکون تھا کہ وہاں بھی چین نہ ملا۔ تیز تیز قدموں سے دوبارہ کار کی طرف لپکی۔ اور اندر آ کر بیٹھ گئی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سخت بے کلی محسوس ہو رہی تھی۔ سڑک پر تھوڑی دور چلتی پھر واپس آ جاتی یوں جیسے کار اس کی آخری پناہ گاہ ہو۔''

اسی طرح ساڑھے گیارہ بج گئے۔ اب تو صبر کی انتہا ہو گئی تھی۔ اُس نے پیدل چلنے کے متعلق سوچا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ ہائے کہتے ہوئے اپنے رخساروں پر تھپڑ مار رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔'' خدایا تو میری مدد کے لیے غیب سے کسی فرشتے کو بھیج میرے حال پر رحم کر۔''

وہ ببول کے درخت کے نیچے کھڑی کبھی سامنے دیکھتی اور کبھی پیچھے کہ شاید کوئی گاڑی یا انسان نظر آ جائے لیکن ہر طرف مایوسی ہی مایوسی تھی۔ساری تیزی اورشوخی رفو چکر ہوگئی تھی۔صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔وہ اسی درخت سے ٹیک لگائے پھوٹ پھوٹ کر رودی۔آنسو ذرا تھمے تو ایک بار پھر اس نے سامنے کی طرف دیکھا۔کوئی متحرک چیز دکھائی دی۔جلدی سے آنکھیں صاف کیں۔ اُسے اپنی بصارت پر شبہ ہو رہا تھا۔لیکن غور سے دیکھنے پر کار تیزی سے آگے بڑھتی نظر آئی۔دل میں خوشی کی لہری اٹھی۔اور قلب کی عمیق گہرائیوں سے تشکر کے کلمات نکلے۔

کار جوں جوں نزدیک آتی جا رہی تھی۔اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔

اب کار خاصی قریب آ گئی۔یکدم اسے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔اس نے جو کچھ دیکھا تھا اس پر یقین کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔تیزی سے پلکیں جھپکتے ہوئے اس نے ایک بار پھر غور سے سامنے دیکھا۔''نہیں۔نہیں وہ نہیں ہو سکتا۔مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔''

لیکن وہ غلط فہمی کہاں تھی؟ وہ نظر کا دھوکا کب تھا؟ وہ تو ایک اٹل حقیقت تھی۔جسے جھٹلانا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔کار آگے بڑھ رہی تھی۔اسکی کار کے نزدیک پہنچ کر کار نے آگے جانے کے لیے راستہ بنایا۔وہ دیوانوں کی طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ذرا فاصلے پر جا کر رُک گئی اور اس میں سے ایک خوش پوش نوجوان اتر کر اس کی طرف بڑھا۔سورج کی وہ تیز کرنیں۔جو اس کے جسم میں چبھ رہی تھیں۔اب اسے اپنے دل میں چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

واقعی وہ بصارت کا فریب کہاں تھا؟ وہ منیب ہی تھے۔جو پُروقار قدموں سے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں وہی گہرا غرور لیے اس کی طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے۔''

غصے سے اس نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیے۔

''خدایا میں نے فرشتے کے لیے دعا کی تھی۔ایک ایسے انسان کی مدد نہیں مانگی تھی جو تیری مخلوق پر رحم کھاتا ہو۔''

وہ قریب آ رہے تھے اور اسے اپنے اعضا میں سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی ۔ یوں دل دھڑک رہا تھا کہ اس کی دھڑکن کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی ۔

’’قریب آ کر انہوں نے اپنے مخصوص لہجے میں پوچھا۔

’’آپ؟ خیریت تو ہے؟‘‘

اس کا دل بری طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا۔دل چاہا کہ کہہ دے۔

’’اتنی موٹی موٹی آنکھیں رکھتے ہوئے بھی کیا اندھے ہو؟ نظر نہیں آتا خیریت ہوتی تو مجھے اس جنگل میں کھڑے ہونے کا کیا شوق تھا؟‘‘

بولنا چاہا لیکن ہونٹوں نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔اپنی بے بسی اور شکست کے احساس سے اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہہ نکلے ۔

صورتِ حال کو منیب سمجھ گئے تھے ۔زیادہ گفتگو اس لیے مناسب نہ سمجھی ۔کہ اگلی کار میں کچھ بیٹھے کچھ لوگ اُن کے منتظر تھے ۔واپس پلٹے کسی کو پکارا۔دوسرے لوگ بھی گاڑی سے نکل آئے ۔انجن کا ڈھکن اٹھا دیا گیا۔ان کے ساتھ دو اور نوجوان گاڑی پر جھک گئے ۔

وہ دیکھ رہی تھی گھنے بالوں کا گچھا جھکنے کے ساتھ ہی ان کی پیشانی پر بکھر جاتا۔اور ایک جھٹکے سے وہ انہیں پیچھے کر لیتے ۔کتنے دلکش اور وجیہہ نظر آ رہے تھے اس سے ۔

انجن کا ڈھکن گرا دیا گیا۔جانے انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کیا کہا وہ سب اپنی گاڑی کی طرف چلے گئے ۔اگلی گاڑی سٹارٹ ہو گئی تھی ۔

جیسے کسی نے مسمریزم کر دیا ہو۔دروازہ کھلا اور وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی ۔یوں لگ رہا تھا۔جیسے دماغ کام کرنا بھول گیا ہو۔گہری نیند سو گیا ہو۔

دھیمی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر پھیلی ہوئی تھی ۔کار کو ہلکی رفتار سے چلاتے ہوئے انہوں نے دھیرے دھیرے معذرت کے وہ الفاظ کہنے شروع کیے جن کے اظہار کے لیے وہ ایک عرصے سے موقع کی تلاش میں تھے ۔

""مس شیبا اتنی مدت بعد احوال پرسی کرتے ہوئے مجھے بڑا عجیب سا محسوس ہو رہا ہے۔ اپنے الفاظ بھی اجنبی لگ رہے ہیں لیکن کچھ ایسی مجبوری راہ میں حائل ہو گئی تھی کہ چاہتے ہوئے بھی آپ کی مزاج پرسی نہ کر سکا۔ اپنے ایک عزیز دوست کی علالت کے سلسلے میں مجھے ڈھاکہ جانا پڑا اور جب وہاں سے لوٹا تو مجھے آپ کو فون کرنا کچھ عجیب سا لگا۔ سوچتا تھا آپ سے خود مل کر معذرت کروں۔"

لیکن وہ تو گم سم جانے فضا میں کیا تلاش کر رہی تھی۔ دماغ بالکل سن تھا۔

کوئی معذرت کر گیا ہے کسی نے اپنی مجبوری بیان کی ہے۔ کوئی کیا کہہ گیا ہے؟ دماغ نے کوئی لفظ بھی نہ سنا تھا۔

ادھر اس کے جذبات سے بے نیاز منیب سوچوں کے حسین تانے بانے میں الجھے ہوئے تھے۔ سوچ رہے تھے کہ اس پیاری سی لڑکی کی ہمراہی میں ان کا یہ دوسرا سفر ہے۔

وہ جیون کتنا سندر ہوگا۔ جو ایسے ہمسفر کی ہمراہی میں گذرے۔

باب نمبر: 26

وہ سب صبح نو بجے سے اس کا انتظار کر رہی تھیں۔راہ دیکھتے دیکھتے ان کی آنکھیں بھی تھک گئی تھیں اور اب تشویش شروع ہو گئی تھی کہ آخر وہ ابھی تک آئی کیوں نہیں۔

''خدا کرے اس کے گھر خیریت ہو۔میرا دل گھبرا رہا ہے۔''عذرا نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

''سنو تم اپنے دل کو ٹھکانے پر رکھو۔دل کے گھبرانے کے ابھی بہت سے مواقع آئیں گے۔''نغمہ نے چوٹ کی۔

''عارفہ!ذرا شاہد سے جا کر پوچھو کہ وہ اپنی نازک طبع بیگم صاحبہ کے لیئے دل کو تقویت دینے والا مربہ لایا ہے یا نہیں؟''

''نری احمق ہو تم بھی راحیلہ۔''عارفہ نے چوٹ کی۔

''پگلی اس کی کیا ضرورت تھی۔شاہد تو بذات خود دل کو تقویت دینے والی چیز ہیں۔ان کی موجودگی میں عذرا کا دل گھبرائے کیسی انہونی بات کہہ رہی ہو تم!''عطیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''واقعی بات تو لاجواب ہے۔''سب نے ہنستے ہوئے داد دی۔

سوا بارہ بج رہے تھے۔عطیہ بے چین ہو کر کمرے سے باہر نکلی۔

چھت پر پہنچ کر اس نے متلاشی نگاہیں سڑک پر دوڑائیں اور کسی متحرک چیز کو دیکھ کر اس کے دل نے گواہی دی کہ یقیناً شیبہ کی ہی کار ہے۔

تھوڑی دیر وہ کھڑی رہی اور پھر یقین ہو جانے پر نیچے اُتر آئی۔

برآمدے کے آخری ستون کے سہارے کھڑی وہ کار کے گیٹ میں داخل ہونے کی منتظر تھی۔کار گیٹ میں داخل ہوئی لیکن اس کی آنکھیں حیرانی سے پھیل گئیں۔وہ شیبہ کو اس وردی والے کے ساتھ کار میں بیٹھا دیکھ رہی تھی۔

آگے بڑھنا چاہا۔لیکن کسی خیال کے پیش نظر اس نے فوری طور پر اپنے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک لیا اور تیزی سے ستون کی آڑ میں ہو گئی۔

''یقیناً میرا حافظہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا یہ وہی ہے۔

کار کی نوجوان نے باوقار انداز میں سیٹ کا دروازہ کھولا اور باہر آ گیا۔پھر بڑی تمکنت سے آگے بڑھا اور پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔شیبہ پیکٹ سنبھالے باہر نکلی۔چہرے سے بے بسی اور بے چارگی مترشح تھی۔بغیر ادھر اُدھر دیکھے وہ آگے بڑھی۔عطیہ نے ایک نظر منیب پر ڈالی۔

تیزی سے عطیہ اس کی طرف بڑھی، پیکٹ اس کے ہاتھوں سے تھامتے ہوئے بولی۔

''یہ کیا ہے؟ تمہیں تو اس کا نام تک سننا گوارا نہ تھا اور اب یہ سب کیا چکر ہے؟

آبگینوں کو ٹھیس لگ گئی تھی۔آنکھیں چھلک پڑیں۔موٹے موٹے آنسو رخساروں پر بہہ نکلے۔عطیہ گھبرا گئی۔فوراً تیزی سے اسے قریبی کمرے میں لے گئی۔اتفاق سے کمرہ خالی تھا۔پیکٹ کرسی پر پھینک کر وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''کیا ہوا شیبہ گھر پر تو خیریت ہے نا''؟

لیکن جواب ندارد۔بس یوں محسوس ہو رہا تھا۔جیسے برسات ان آنکھوں میں اتر آئی ہو۔دریا نے بند توڑ دیا ہو۔حسین شبنمی آنکھیں اشکوں کے دریا میں نہا رہی تھیں۔

''شیبہ میرا دل پھٹ رہا ہے۔خدا کے لیے مجھے کچھ بتاؤ تو سہی۔خالہ خیریت سے ہیں بتا؟''

اپنا سر اُس کے کندھے سے نکالتے ہوئے شیبہ بڑی مضطرب آواز میں بولی ۔

"سب خیریت سے ہیں، لیکن اپنے دل کا غبار نکال لینے دو مجھے عطی ۔"

کافی دیر بعد جب اس کے آنسو تھمے تو عطیہ اسے ملحقہ باتھ روم میں لے گئی۔

منہ ہاتھ دھلایا اور پھر عطیہ کے اصرار پر اس نے ساری بات سنا دی۔

"ایک بات بتاؤں؟" عطیہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کہو" اُس نے سوالیہ انداز میں عطیہ کی طرف دیکھا ۔

"زیادہ ذہانت نے تمہارا دماغ خراب کر دیا اور کوئی بات نہیں ۔"

اس میں دماغ کی خرابی کی کیا بات ہے؟ عطی تمہیں درد کیسے محسوس ہو؟

تم کیسے اُس آگ کی حدت کا اندازہ کر سکتی ہو جس میں میں جل رہی ہوں تم میرے احساسات سے واقف بھی کیسے ہو سکتی ہو اس لیے کہ چوٹ جسے لگتی ہے ۔ درد وہی محسوس کرتا ہے ۔

فضول اور خود ساختہ غموں کے چکر میں پڑی ہوئی ہو بظاہر کوئی حقیقت نہیں ۔ خود سوچو کہ اُسے تم پر رحم کھانے کی کیا ضرورت تھی؟ تم یہ مانتی ہو کہ وہ اعلیٰ اور ٹھوس کردار کا مالک ہے میں نے اسے دیکھا ہے بات صرف اتنی ہے کہ اُس میں خود اعتمادی بہت زیادہ ہے ۔"

میرا دل چاہتا ہے کہ اپنا خون کر ڈالوں ۔ وہ کیا کہتا ہوگا؟ کہ یہ ویرانوں میں میری مدد کا انتظار کر رہی تھی ......افسوس تو مجھے اس بات پر ہے کہ اتنے دن میں پریشان ہوتی رہی ۔ سوچتی رہی کہ اگر مجھے کبھی وہ ملا تو اسے اچھی طرح بتاؤں گی ۔ کسی پر رحم کس طرح کھایا جاتا ہے ۔ لیکن ستم ہے کہ قدرت نے ایک بار پھر مجھے اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ۔ میں نے بولنا چاہا لیکن میری زبان نے ساتھ نہ دیا ۔ جانے کیوں میں اتنی بے بس ہو کر رہ گئی تھی ۔"

"تمہارا یہ فلسفہ میری سمجھ سے بالاتر ہے ۔ رونا دھونا چھوڑو اور چلو وہ سب لوگ تمہاری وجہ سے سخت پریشان ہیں ۔"

"عطی میں تمہیں کیسے سمجھاؤں؟" وہ پریشان ہو کر بولی۔

"رحم اور ہمدردی کے جن چکروں میں تم مبتلا ہو۔ مجھے وہ سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ میرا دماغ اتنا تیز کہاں کہ ان خودساختہ چکروں کو سمجھتا پھرے۔ چھوڑو ان باتوں کو چلو۔"

وہ اسے بازو سے تھامے باہر لے آئی اور جب وہ عذرا کے کمرے میں داخل ہوئی تو سبھی چلا اٹھیں۔

"اتنی دیر کیا کرتی رہیں آخر؟" وہ سبھی سوالیہ نگاہیں لیے پوچھ رہی تھیں" کرنا کیا تھا؟ ان ویرانوں میں اس کی جان کو رو رہی تھی۔" عطیہ نے عذرا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا کہوں اب تمہیں دلہن بنی بیٹھی ہو معاف کیے دیتی ہوں۔ ورنہ آج تم پر مجھے جتنا غصہ آیا تھا شاید ہی کبھی آئے۔" شیبہ نے عذرا کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

عذرا نے ایک ادا سے بانہیں اس کے گلے میں ڈال دیں اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

لیکن کچھ تفصیل سننے میں نہیں آئے گی کہ آخر میری جان کو رونے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

مختصراً اس نے کار کے خراب ہو جانے کے متعلق بتایا۔

"لیکن یہ تو بتاؤ کہ پھر تم یہاں تک کیسے پہنچیں؟"

نغمہ نے شیبہ کو بات ختم کرتے دیکھ کر شوخ لہجے میں پوچھا۔

"ان ویرانوں میں بھٹکتی اس شہزادی پر ایک شہزادہ رحم کھا کر یہاں چھوڑ گیا ہے۔" عطیہ نے گہری نظروں سے اُسے دیکھا۔

"تو یہ بات ہے۔ میں نہ کہوں کہ آنکھوں میں اتنا خمار کہاں سے آ گیا ہے۔ کہاں ہے وہ شہزادہ۔ ہم بھی اس کا دیدار کریں۔" فوزیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

عطیہ ہوش کے ناخن لو۔ کیوں بے پر کی اڑانے پر کمر باندھی ہوئی ہے۔" شیبہ نے

خشمگیں نگاہوں سے اُسے گھورا۔

''نہیں وہ ٹھیک کہتی ہے، راحیلہ نے عطیہ کی طرف داری کی۔

''تمہارا سر ٹھیک کہتی ہے۔'' شیبہ نے بے حد جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کون ہے وہ عطیہ بتاؤ نا۔'' عذرا نے پوچھا۔

''کمال ہے دماغ ٹھکانے ہے تمہارا۔ اس کی بے سروپا باتوں کو سچ سمجھ رہی ہو۔ وہ تو جب تک الٹی سیدھی ہانک نہ لے تب تک اسے چین نہیں آتا۔ اچھی بھلی عادت کو جانتے ہوئے بھی ایسے کہہ رہی ہو۔

''لیکن سوال یہ ہے کہ آخر تم یہاں تک پہنچیں کیسے؟'' اب کے فوزیہ نے پوچھا۔''

''اللہ تم لوگوں سے بچائے، اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

''ان کے چند مہمان کار میں آ رہے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنی کار میں لفٹ دے دی۔'' شیبہ نے تیزی سے کہا۔

آخر تمہیں یہ ڈرائیونگ کا شوق کیوں چڑھا۔ اتنی ماہر ہو تم۔ کم از کم ساتھ کوئی نوکر ہی بٹھا لاتیں۔ لو تو کہانی کیسے بنتی۔ وہ خوش پوش سا شہزادہ کیسے ملتا جس کا عطیہ ذکر کر رہی ہے۔

فوزیہ نے آنکھیں نچائیں۔

شیبہ نے کھا جانے والی نظروں سے عطیہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

''بکواس کرو نا اب بتاؤ نہیں''۔

''بھئی میں یونہی اسے تنگ کرنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ ورنہ ایسی کوئی بات نہیں۔''

ایک بج رہا تھا سبھی کھانا کھانے کے لیے باہر چلی گئیں۔

لیکن شیبہ ان سب کے اصرار کے باوجود بھی کھانے کے لیے باہر نہ گئی۔ وہ ڈرتی تھی پھر سامنا نہ ہو جائے۔

کھانا کھا کر جب سب کمرے میں آئیں تو اس نے عطیہ کی طرف دیکھا۔ جہاں ایک

معنی خیز مسکراہٹ رقصاں نظر آئی۔ لیکن اس مسکراہٹ کا مفہوم اس کی سمجھ میں نہ آسکا۔ واپسی پر عطیہ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''سنو شیبہ وہ بڑی پیاری شخصیت کا مالک ہے۔ اس کا رکھ رکھاؤ اور طور اطوار عام لوگوں سے مختلف ہیں۔

''بند کرو یہ بکواس۔ تمہاری یہ دلیلیں مجھے متاثر نہیں کرسکتیں۔ میں اسے خوب سمجھتی ہوں۔''

شیبہ تلخی سے بولی۔

باب نمبر: 27

لیڈیز روم میں داخل ہوتے ہوئے شیبہ نے نغمانہ سے پوچھا۔

"بھئی عطیہ کی کچھ خبر ہے؟"

"شاید وہ ٹیکنالوجی ڈیپارٹمنٹ کی طرف گئی ہے۔" نغمانہ نے جواب دیا۔

دراز کھولتے ہوئے اس نے پریکٹیکل کی کاپی نکالی۔ ورق الٹ پلٹ کر دیکھے اور نوٹ بک ہاتھ میں پکڑے ڈاکٹر رانا کے کمرے کی طرف چلنے لگی۔

وہ اپنی ترنگ میں چلی جا رہی تھی۔ دروازے کا پردہ ہٹا کر اندر جھانکا اور یکدم یوں پیچھے ہٹی جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہے۔

منیب کمرے میں ڈاکٹر رانا سے باتوں میں مصروف تھے۔

ڈاکٹر رانا اسے پردہ ہٹاتے اور چھوڑتے دیکھ چکے تھے۔ تیزی سے بولے۔

"شیبہ اندر آؤ بھئی۔ پلٹ کیوں گئی ہو؟"

وہ بلا رہے تھے۔ لیکن وہ باہر پریشان سی دل پر ہاتھ رکھے سوچ رہی تھی۔

"خدایا مجھ سے کیا گناہ سرزد ہو گیا ہے؟ جس کی پاداش میں مجھے اتنی کڑی سزا مل رہی ہے۔ یہ شخص تو میرے لیے عذاب بن گیا ہے۔ پہلا زخم ابھی مندمل نہیں ہوتا کہ ایک اور چرکہ لگ جاتا ہے اور وہ میری بے بسی کا تماشہ دیکھ کر محظوظ ہوتا ہے۔

''میں نہیں کرواتی سائن، واپس جاتی ہوں، نہ اندر جاؤں گی اور نہ اس کی شکل دیکھوں گی۔واپس جانے ہی لگی تھی کہ ڈاکٹر رانا کو اس کے قدم پردے کے نیچے سے نظر آئے۔

انہوں نے دوبارہ آواز دی۔

''جائے رفتن نہ پائے ماندن والا معاملہ ہو گیا تھا۔

''شیبہ بھئی اندر آؤ نا کیا کام تھا؟ واپس کیوں جا رہی ہو''؟ ان کے لہجے میں شفقت تھی۔

''سر کاپی پر سائن کروانے تھے۔آپ مصروف ہیں۔میں نے سوچا پھر کبھی سہی''۔اس نے پردے کے پاس آ کر جان چھڑانے والے لہجے میں کہا۔

''نہیں بھئی میں کوئی خاص مصروف نہیں۔کاپی لے آؤ۔ہو سکتا ہے بعد میں سائنس کانفرنس کی مصروفیت میں وقت نہ ملے''۔

اور اب شیبہ کو کمرے میں جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔اندر داخل ہوتے ہی اس نے ایک نظر منیب پر ڈالی۔نگاہوں کا تصادم ہوا اور یہ تصادم منیب کے چہرے پر بڑی دل خوش کن مسکراہٹ بکھیر گیا۔لیکن شیبہ کا دل جل کر رہ گیا۔آنکھوں میں غرور کی جھلکیاں کچھ اور بھی نمایاں محسوس ہوئیں۔کاپی اس نے ڈاکٹر رانا کی طرف بڑھا دی۔

''باہر کیوں کھڑی رہیں؟'' انہوں نے کاپی کھولتے ہوئے پوچھا؟

''آپ بیٹھئے'' منیب اسے کھڑے دیکھ کر بولے۔

اور اس سے اس کا دل چاہا، کرسی اٹھا کر اس کے منہ پر دے مارے۔کہہ دے مجھے ایسی روکھی، پھیکی، بھوکی، ننگی ہمدردی نہیں چاہیے۔اپنے پاس رکھو اسے میں تو اس برے وقت کو روتی ہوں، جب مجھے بے بس ہو کر تمہاری امداد قبول کرنا پڑی تھی ۔''لیکن کچھ بھی تو نہ کہا جا سکا۔ویسے ہی کرسی کی پشت سے لگی کمرے کی چیزوں کا جائزہ لیتی رہی۔یوں جیسے اُس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔''

''شیبہ بیٹھو بھئی؟'' ڈاکٹر رانا نے کاپی پر لکھتے ہوئے کہا۔

اور مجبوراً اُسے بیٹھنا پڑا۔

اس کے چہرے پر پھیلی تلخی اور بیزاری کے سائے منیب کو پریشان کر دینے کے لیے کافی تھے۔نوکر چائے لے آیا تھا۔ٹرے میں دو کپ دیکھ کرڈاکٹر رانا نے اسے تیسرا کپ لانے کے لیے کہا۔

''میں چائے نہیں پیوں گی''۔وہ پریشان ہو اٹھی تھی۔

جان اچھی مصیبت میں پھنس گئی تھی۔کہاں تو وہ کمرے میں آنا نہیں چاہتی تھی اور کہاں اب اسے اس بد دماغ انسان کے سامنے بیٹھ کر چائے پینی پڑ رہی تھی۔

''چائے سے انکار تو کفرانِ نعمت ہے۔خود پیو اور ہمیں بھی پلاؤ''۔ڈاکٹر رانا خوشدلی سے بولے۔

کاپی پر سائن کرنے کے ساتھ ساتھ وہ منیب سے باتیں بھی کیے جا رہے تھے۔

''تمہیں کب جانا ہے؟''ڈاکٹر صاحب نے ان سے پوچھا۔

''سترہ کو مجھے وہاں جا کر چارج لینا ہے۔''

منیب مجھے تمہارے سکویڈرن لیڈر ہونے کی خوشی تو بہت ہے لیکن تمہارے کراچی تبدیل ہونے کا افسوس بھی ہے۔''

کمرے کی سرد سر د بوجھل فضا کچھ دیر پہلے اُسے ہلکی ہلکی ٹھنڈک اور ناگواری کا شدید احساس دلا رہی تھی اب یوں لگا جیسے سارے ماحول میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا ہو گئی ہو۔مسرت اور طمانیت کا گہرا احساس اُس کے چہرے پر پھیل گیا۔جیسے کسی نے مژدہ جانفزا سنا دیا ہو۔واقعی اس کے لیے اس سے بڑھ کر اور خوش خبری بھی کیا ہو سکتی تھی۔اطمینان کا گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے کئی بار خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو اب اس مصیبت سے تو جان چھٹی۔

''تم سترہ کو جا رہے۔پھر تو منیب تم ہماری سائنس کانفرنس میں شرکت کر سکتے ہو''

ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

نوکر تیسرا کپ لے آیا تھا۔ڈاکٹر رانا نے اسے چائے بنانے کے لیے کہا۔لرزتے ہاتھوں سے اس نے چائے دانی اٹھائی ۔یونیورسٹی میں اپنے چار سالہ قیام کے دوران اسے ڈاکٹر رانا پر پہلی بار بری طرح غصہ آیا۔کس شان سے چائے تیار کرنے کا نادر شاہی حکم صادر فرما دیا تھا" اس نے تلخی سے سوچا۔

چائے اس نے کپوں میں انڈیلنی شروع کی ۔ڈاکٹر رانا کے لیے وہ پہلے بھی چائے بنا چکی تھی ۔اور جانتی تھی کہ وہ کیسی چائے پیتے ہیں ۔اپنے اور ان کے کپوں میں دودھ ڈال لیا۔لیکن تیسرے کپ میں دودھ ڈالنے کا مرحلہ ابھی باقی تھا۔گو ایک بار پہلے وہ ان کے گھر بغیر دودھ کی چائے پی چکے تھے ۔لیکن پھر بھی، کیا جانتی تھی، وہ ہمیشہ ایسی ہی چائے پیتے ہیں۔

دودھ دان اس کے ہاتھ میں تھا اور تیسرا کپ اس کے سامنے میز پر پڑا تھا۔تذبذب کے عالم میں وہ کپ سے اٹھتی بھاپ کو دیکھ رہی تھی ۔کتنے ہی لمحے اسی طرح گذر گئے ۔دھیرے سے اس نے ڈاکٹر رانا پر ایک نظر ڈالی ۔صرف اس اُمید پر کہ وہ اس کی مشکل حل کر سکیں ۔لیکن وہ کاپی پر جھکے لکھنے میں مصروف تھے ۔بے اختیار نگاہیں منیب کی طرف اٹھ گئیں ۔

دودھ دان ہاتھوں میں لرز گیا ۔پلکیں بوجھل ہو کر گر گئیں ۔عارض شہابی ہو گئے ۔

منیب داہنے ہاتھ کو ہتھیلی پر ٹکائے اس کی حرکات غالباً چہرے پر پھیلی کشمکش کی کیفیات نہایت دل چسپی سے دیکھ رہے تھے ۔شاید رحم آ گیا تھا۔فوراً ہی بول اٹھے ۔دودھ مت ڈالیے، اور چینی صرف آدھ چمچ"

لیکن بدحواسی میں اس نے دودھ بھی ملا دیا۔اور چینی کا بھی پورا چمچ ڈال دیا۔ہاتھوں میں ارتعاش تھا۔کانوں کی لویں جل رہی تھیں ۔کسی کی نگاہوں کی تپش اسے ابھی تک اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھی۔

منیب مسکرائے ۔کپ اٹھایا اور ہونٹوں سے لگا لیا۔ہونٹوں کے ساتھ ساتھ آنکھیں بھی گہری شوخی لیے مسکرا رہی تھیں ۔اس کی بدحواسی پر یقیناً وہ محظوظ ہوئے تھے۔

کاپی بند کر کے ڈاکٹر صاحب نے ایک طرف رکھ دی اور چائے کا کپ اٹھا لیا۔

''ڈاکٹر صاحب آپ کا فون۔'' نوکر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے انہوں نے معذرت کی اور فون سننے کے لیے چلے گئے۔ اس نے ابھی چائے کا ایک ہی گھونٹ بھرا تھا اور اب اس گھونٹ کو حلق سے نیچے اتارنا اس کے لیے مصیبت بن گیا تھا۔

معاشرتی آداب اگر اس کے پاؤں کی زنجیر نہ بنے ہوتے اگر اسے ڈاکٹر صاحب کا خیال نہ ہوتا تو وہ کبھی کی جا چکی ہوتی۔ وہاں بیٹھنا اور اس انسان کے سامنے چائے پینا اسے محال نظر آ رہا تھا۔ کسی ایسے کام کو کرنا حقیقت بڑا کٹھن ہو جاتا ہے۔ جسے کرنے کے لیے انسان کی طبیعت نہ چاہتی ہو۔

''آپ اس دن خیریت سے گھر پہنچ گئی تھیں۔ کہیں گاڑی پھر تو خراب نہیں ہوئی۔'' منیب نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''جی نہیں گھر کہاں پہنچی ہوں۔ وہیں ویرانوں سے بھٹکتی بھٹکاتی چلی آ رہی ہوں۔'' لہجے میں تلخی منیب سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ لیکن وہ خاموش ہو گئے۔

تبھی ڈاکٹر راناکمرے میں آ گئے۔ شیبہ نے خالی کپ میز پر رکھا۔ کاپی اٹھائی اور سلام کر کے باہر آ گئی۔

''واہ رے تیری خودغرضی'' اس نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سوچا۔

اپنی اہمیت کا احساس دلا گیا۔ بیماری میں تو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ فون پر ہی خرابی طبیعت کا پوچھ سکتا۔

اور اب بھلا اگر یہ وہاں نہ پہنچتا تو میں نے کیا وہیں ٹھوکریں کھاتے رہنا تھا۔''

وہ اپنی اُس وقت کی بے بسی اور بے چارگی کو یکسر فراموش کر چکی تھی۔

عطیہ کو سامنے سے آتے دیکھ کر شیبہ غصے سے بولی۔

''بیگم صاحبہ کہاں مٹر گشت کر رہی تھیں؟''

لیکن اس کی بگڑی صورت دیکھ کر اس کے قریب آتے ہوئے بولی۔

''کیا ہوا صورت پہ ابھی سے بارہ بج رہے ہیں۔''

''ٹیکنالوجی ڈیپارٹمنٹ کا ایک لڑکا فی دن گزرے مجھ سے ایک کتاب لے گیا تھا۔ کتنے دن انتظار کرتی رہی۔ آج پتہ کرنے گئی تو معلوم ہوا صاحبزادے خیر سے کافی دنوں سے یونیورسٹی ہی نہیں آرہے ہیں۔

''لیکن وہ ہے کون؟''شیبہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''ہوگا کوئی خدا کا بندہ۔ میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔''

وہ ریلنگ کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

''ہوں معلوم ہوتا ہے صورت دیکھ کر کتاب دی تھی۔ اب مزہ چکھو تمہارے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔

''بچ بڑا سویٹ تھا۔''......عطیہ نے داہنی آنکھ دباتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''شیبہ! دیکھو تمہارا وردی والا۔ تم پر رحم کھانے والا۔''عطیہ نیچے دیکھتی ہوئی چلائی۔

''کچھ عقل کی بات کرو عطی!''شیبہ نیچے دیکھتے ہوئے بولی۔

نیچے منیب اپنی کار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی شیبہ بغور دیکھ رہی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ وہ واقعی منفرد شخصیت کا مالک ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے نفرت کا بھرپور احساس جاگ اٹھا۔

''میں نے آج تک کسی انسان کے چہرے پہ اتنا وقار اور کسی کی چال میں اتنی خود اعتمادی نہیں دیکھی جتنی اس انسان کے چہرے اور چال میں ہے۔''عطیہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''اور یہ بھی کہو، جتنا بد دماغ اور خود پسند انسان یہ ہے دنیا میں شاید ہی کوئی اور ہو۔''......

شیبہ نے نفرت سے ہونٹ سکیڑے۔

''لیکن مجھے تو اس کا تجربہ نہیں ۔ میں ایسا کیوں کہوں؟'' عطیہ اسے جلاتے ہوئے بولی۔

''لیکن مجھے تو ہے۔'' شیبہ نے تیز لہجے میں کہا۔

''ضروری نہیں تمہارے تجربات درست ہی ہوں۔غلط بھی تو ہو سکتے ہیں۔''

''میں نے جو کچھ دیکھا ہے۔جو کچھ محسوس کیا ہے۔تم اس کی تہہ سے آگاہ نہیں''۔شیبہ لیڈیز روم کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

''سائنسی کانفرنس تو بہت اعلیٰ سطح پر ہو رہی ہے''۔نغمہ نے کانفرنس کے سلسلے میں ہونے والی تیاریوں سے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

''بھئی کینیڈا،مغربی جرمنی اور چیکوسلواکیہ کی یونیورسٹیوں کے پروفیسرز شرکت کے لیے آرہے ہیں۔اعلیٰ سطح پر تو ہونی ہی ہے۔'' شیبہ آپریٹس پر جمی گرد کپڑے سے صاف کرتے ہوئے بولی۔

''اور اپنے ملک کے بھی سائنس دان، پروفیسرز اور اولڈ سٹوڈنٹس شرکت کریں گے۔'' عطیہ نے مزید تفصیل بتائی۔

باب نمبر: 28

آفیسرز میس کے ایک کمرے میں منیب آرام کرسی پر نیم دراز کسی کتاب کے مطالعہ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پاؤں پلنگ کی پٹی پر رکھے ہوئے تھے اور ٹانگوں پر قیمتی گرم کمبل تھا۔ یہ محویت ''ہیلو'' کی آواز سے ٹوٹ گئی۔ نگاہیں اٹھا کر دائیں طرف دیکھا۔ رضوان ایک خوش پوش شخص کے ساتھ کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ نو وارد کو آتے دیکھ کر منیب کھڑے ہو گئے۔ رضوان نے قریب پہنچ کر تعارف کروایا۔

''منیب یہ میرے ماموں حسن اعجاز ہیں۔ ڈھاکہ جیوٹ مل میں کیمیکل انجینئر ہیں اور یونیورسٹی میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔

پھر منیب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ماموں سے مخاطب ہوا۔

''میرے دوست ڈاکٹر منیب فرخ ہیں۔ سکویڈرن لیڈر ہو کر سترہ کو کراچی جا رہے ہیں۔

ہاتھ آگے بڑھے۔ چند رسمی الفاظ کا تبادلہ ہوا اور باتیں شروع ہو گئیں۔

یونیورسٹی کے ایک ڈاکٹر سے میرے گہرے مراسم ہیں۔ انہوں نے دعوت نامہ مجھے بھی بھیجا ہے اور آنے کے لیے بھی پُر زور تاکید کی ہے۔

منیب نے کہا۔

’’تم مدعو ہو منیب، پھر ضرور چلو۔ بچ لطف رہے گا، رضوان نے چٹکی بجائی۔

ہاں آرادہ تو میرا ان کا ہر سیشن اٹینڈ کرنے کا ہے۔ بہت معلوماتی اور پر فخر تھا مے ہوں گے۔

میرے تو سر پر سے گذر جائیں گے۔ رضوان ہنسا۔

منیب کیلئے تو یہ کانفرنس کچھ اس خیال سے بھی اہم تھی کہ وہاں شیبہ سے ٹکراؤ کا امکان بھی تھا جو بہر حال اُس کے لیے ایک پر مسرت عمل تھا۔ ان کا عہدہ بڑھ گیا تھا۔ لیکن شیبہ کے شہر سے چلے جانے کا روح فرسا تصور انہیں بے چین کیے ہوئے تھے۔ دو ماہ کے دوران وہ اسے دو مرتبہ دیکھ چکے تھے اور دونوں ملاقاتیں اتفاقیہ رنگ میں گہرائی لیے ہوئے تھیں۔ انہیں خدائے عظیم سے قوی امید تھی کہ وہ ان کی محبت کو ضرور کامیاب بنائے گا۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر رضوان دوبارہ منیب کے کمرے میں آیا۔

’’تم کل چل رہے ہونا۔ منیب! مجھے ضرور ساتھ لے کر جانا۔ رضوان بچوں کی طرح مچل رہا تھا۔

’’بڑی دلچسپی ہے؟ کہتے بھی ہو کہ پلے کچھ نہیں پڑے گا اور جانے کے لیئے مرے بھی جا رہے ہو۔

’’کبھی پاگلوں کی سی باتیں کرنے لگتے ہو۔ مجھے ان بور کرنے والے مذاکرات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں تو بس یونیورسٹی کی لڑکیوں کو ایک نظر‘‘........ بڑی شریر مسکراہٹ لبوں پر لیے رضوان نے سر جھٹکتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

’’ہوں اور اگر اس نظر بازی کے چکر نے کہیں جوتے لگوا دیئے تو‘‘...... منیب مسکرا رہے تھے۔

’’نہیں پیارے ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔‘‘

اگلا دن طلبا اور طالبات کے لیے ایک اہم اور مصروف دن تھا۔ یونیورسٹی کے

وسیع وعریض ہال میں نشستوں کا شاندار انتظام تھا۔ سٹیج کو خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ ہال کے عقبی دروازے پر تھرڈ ایئر آنرز کا ایک لڑکا جواد آنے والوں کے کارڈ احتیاط سے چیک کرتا اور انہیں اندر جانے کی اجازت دیتا۔ ڈاکٹر رانا کی خصوصی تاکید تھی کہ بغیر کارڈ کے کسی شخص کو اندر نہ آنے دیا جائے۔ تبھی اسے وہ پیغام یاد آیا جو ڈاکٹر رانا نے ڈاکٹر صدیقی کے لیے دیا تھا۔ وہ کتنے بڑے پاگل پن کا ثبوت دے چکا تھا۔ پیغام کی اہمیت اس امر کی مقتضی تھی کہ اُسے فوراً پہنچایا جائے۔

پریشان سا ہو کر اس نے اِدھر اُدھر کسی معتمد شخص کی تلاش میں نظریں دوڑائیں، اسی وقت شیبہ کوریڈور میں سے گذر رہی تھی۔

''مس شیبہ پلیز ذرا یہاں آیئے''۔

اپنا نام سن کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر جان کر جواد کے قریب آئی۔ جواد اس سے تھوڑی دیر کے لیے وہاں کھڑے ہونے کی درخواست کر رہا تھا۔ کچھ دیر تذبذب کے بعد بولی۔

''دیکھئے ذرا جلدی آئیں''۔

اس نے اندر نگاہ دوڑائی۔ ہال تقریباً بھر گیا تھا۔ اور اب نئے آنے والے اپنے لیے جگہ تلاش کر رہے تھے۔

''لیجئے'' گھمبیر سی آواز پر اس نے تیزی سے رُخ پلٹا۔

اور

اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑک اُٹھا۔ چہرے پر خون سمٹ آیا۔ اس کے سامنے دلآویز شان لیے منیب کھڑے مسکرا رہے تھے۔ وہی مخصوص تبسم مسکراہٹ آنکھوں اور ہونٹوں پر بکھری ہوئی تھی۔ مضبوط مردانہ ہاتھ نے اسے کارڈ تھما دیا تھا۔ کارڈ کیسے پکڑا؟ کچھ بھی پتہ نہ چلا۔ وہ آگے بڑھ گئے تھے۔ اپنی تمام تر نفرت کے باوجود بھی اس انسان کا سامنا کرنا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس کی ہمیشہ یہی کیفیت ہوتی۔ غالباً وہ لاشعوری طور پر اسکی شخصیت سے مرعوب ہو چکی تھی۔

جواد آ گیا تھا۔معذرت کرتے ہوئے اس نے کارڈ شیبہ سے لے لئے۔افسردہ سی چال چلتی ہوئی وہ آگے بڑھنے لگی۔وہ بڑی پریشان تھی۔ذہنی خلفشار آنکھوں میں اتر آیا تھا۔منیب کی مسکراہٹ اُسے ہمیشہ اپنا مذاق اڑاتی نظر آتی۔بس نہ چلتا تھا ورنہ آنکھوں اور ہونٹوں سے وہ اسے نوچ ہی ڈالتی۔۔بے ربط سی سوچیں، دامن پکڑے ہوئے تھیں۔

خود پر غصے کے ساتھ ساتھ اس انسان پر بھی ذہن کھول رہا تھا۔

''بھلا یہاں ٹپکنے کی کیا ضرورت تھی؟ کوئی پوچھے تمہیں اس مضمون سے کیا دلچسپی؟ اُلوؤں کی طرح بیٹھ کر شکلیں دیکھنے سے فائدہ؟''

کتنی ہی دیر تک وہ خود سے الجھتی رہی۔مختلف واقعات آنکھوں کے سامنے آتے چلے گئے۔یکدم برق کی طرح ایک خیال اس کے دماغ میں اُبھرا۔

''آج بازی تمہارے ہاتھ ہے۔قدرت نے تمہیں ایک سنہری موقع مہیا کیا ہے۔سارے احسانوں کا بدلہ اتر جائے گا۔انہیں جگہ پیچھے ملی ہے۔تم انہیں جگہ آگے دلا کر احسان کے بار کو ہلکا کر سکتی ہو۔آج تمہارا اُن پر رحم کھانے کا موقع ہے۔آج وہ بھی تمہارے رحم و کرم پر ہے۔......اٹھو''۔

اور واقعی اس خیال کے تحت اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔انتہائی تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے، وہ اگلے دروازے سے ہال میں داخل ہوئی۔یہ خیال ہی اس کے لیے کتنی خوشی اور تسکین کا باعث بن رہا تھا کہ آج وہ اس کا غرور توڑ دے گی۔آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔۔بے چین نظروں سے اس نے پچھلی سیٹوں کا جائزہ لیا۔پہلے دائیں طرف اور پھر بائیں طرف دیکھا۔لیکن وہ مغرور اور بد دماغ انسان اُسے کہیں نظر نہ آیا۔مایوسی سے اس کی آنکھوں کی جوت مدھم پڑ گئی۔بڑے ہی دُکھ سے اس نے سوچا۔

''آج ایک موقع مجھے حاصل ہوا تھا۔سو اس سے فائدہ اٹھانا بھی میرے مقدر میں نہیں''۔

دوبارہ بغور دیکھا۔لیکن کہیں بھی وہ یا اس کا ساتھی دکھائی نہ دیئے۔نگاہیں پھیلتی پھیلتی اگلی نشستوں کی طرف اٹھنے لگیں۔

اور پھر یکدم اُسے محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے گہری تاریکیاں آ گئی ہوں۔ہال میں پھیلی ہوئی روشنی کا احساس بالکل مفقود ہو گیا۔اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔جبکہ وہ منیب کو دوسری قطار کی درمیانی سیٹ پر بڑی شان سے بیٹھے دیکھ چکی تھی۔یوں محسوس ہو رہا تھا۔جیسے کسی نے بلندی سے اٹھا کر کسی گہرے کھڈ میں پھینک دیا ہو۔وہاں سے نکل کر تیزی سے کامن روم میں چلی گئی۔وہاں کوئی نہیں تھا۔شکست خوردہ انداز میں اس نے خود کو کرسی پر گرا دیا۔آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔اس کا تنفس اتنا تیز تھا کہ وہ دل کی دھڑکن کی آواز بھی بخوبی سن سکتی تھی۔وہ بری طرح جل رہی تھی۔آنکھیں جل رہی تھیں۔ہاتھ پاؤں جل رہے تھے۔اور سارا وجود دھڑ دھڑ جل رہا تھا۔کوئی احساس بھی تو ایسا نہ تھا۔جو اس آگ کی تپش کو کم کر سکتا۔اس پر پھوار کا کام دے سکتا۔ہر واقعہ بھڑکتے ہوئے ان شعلوں کو ہوا دے رہا تھا۔سر بری طرح میز پر پٹختے ہوئے اس نے لمبی آہ بھری۔

''یہ کیسی منحوس گھڑی تھی۔جب میں نے اس انسان کی شکل دیکھی۔چہرے پر پھیلا ہوا وقار نگاہوں میں تمکنت اور شخصیت کی دل آویزی کس کام کی۔جبکہ انسان انسانیت کے جوہر سے ہی محروم ہو۔آخر میرا جرم بھی کیا ہے؟ مجھ سے کیا قصور سرزد ہو گیا ہے؟ جو ہر بار میری خودداری کو مجروح کیا گیا۔میرے پندار پر گہری چوٹیں لگائی گئیں۔میری بے بسی کا مذاق اڑایا گیا۔صرف اس لیے کہ میں مجبور تھی۔کسی کی مجبوری کا یوں تماشا دیکھنا کتنا بڑا ظلم ہے۔

لیکن یہ سب اُسے کون سمجھائے۔

طنزیہ مسکراہٹ اُسے یاد آئی اور انگاروں پر لوٹا گئی۔

''سوچ رہا ہو گا کہ مجھے تلاش کرتی پھر رہی ہے۔آہ جو کچھ بھی سوچتی ہوں اس کے برعکس ہی ہوتا ہے، چلی تھی احسان کا بدلہ اُتارنے و کسی کا غرور توڑنے لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ ایک

بار پھر تضحیک کا نشانہ نہ بن جاؤں گی ۔میری بدحواسی پر ہنستا تو ہوگا''۔

تڑپ کر وہ اٹھی ۔اور چلتے ہوئے وجود کو سمیٹے باہر سڑک پر نکل آئی ۔سامنے سے آنے والی ایک ٹیکسی کو ہاتھ دیا اور گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

ہال میں کچھ تو دوسرے لوگوں اور واپسی پر اپنے ماموں کی وجہ سے رضوان منیب سے کوئی بات نہ کہہ سکا۔لیکن ماموں کو اپنے کمرے میں چھوڑ کر وہ بھاگا ہوا منیب کے پاس آیا اور چھوٹتے ہی تیز لہجے میں بولا ۔

''یہ تم نے چوری چھپے کام کرنے کب سے شروع کر دیئے ہیں؟''

منیب اس کا مطلب سمجھ گئے تھے ۔لیکن تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے بولے ۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہی کہ اس دل پر تو کسی اندھی لولی لنگڑی لڑکی کا سایہ تک نہیں ۔تمہارے دل کی دنیا پر وہ پری کب سے سایہ فگن ہے ۔''؟

''یہ پریوں والے قصے میری تو سمجھ سے بالا تر ہیں ۔انسانوں کی بات کرو تو کچھ بتاؤں بھی''۔

میں پوچھتا ہوں، کہ وہ پری جو حضور کی شکل مبارک دیکھتے ہی نہال ہوگئی تھی ۔جس کی پلکیں آپ کی صورت دیکھتے ہی تیزی سے جنبش کرنے لگی تھیں اور وہ جس کے ہاتھ آپ سے کارڈ تھامتے سے لرز رہے تھے ۔وہ کون ہے؟''

''میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔''

''ہوں تو یہ انداز ہیں ۔واہ! ہماری بلی ہمیں سے میاؤں ۔ٹھیک ٹھیک بتاؤنا منیب!''

بھئی تمہیں ساتھ کس لیئے لے کر گیا تھا۔'' منیب نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ویسے انتخاب لاجواب ہے'' رضوان خوشی سے چہکا۔

''جلدی بہکنے لگتے ہو ۔کیسا انتخاب اور کس کا انتخاب؟ ایک بار ان کے گھر ضرور گیا تھا۔

بس اتنی سی بات ہے ۔جس کا تم نے افسانہ بنا ڈالا ہے۔"

بھئی ایک بار ویسے گئے تھے اور دوسری بار دُلہا بن کر چلے جاؤ گے"۔باقی رہی بات افسانے کی تو پیارے افسانے سے حقیقت بنتے کون سی دیر لگتی ہے ۔اس زمانے میں تو یہ کام اور بھی آسان ہو گیا ہے ۔لیکن یار تم تو کراچی جا رہے ہو۔اور وہ .....ابھی تو گلستانِ محبت میں پیار کے شگوفے کھلے ہی ہیں۔

"خدا کے لیے بس کرو۔اس نثر نما شاعری کو اپنے تک محدود رکھو۔مجھے سنانے کی ضرورت نہیں۔"

باب نمبر: 29

دسمبر کا مہینہ کڑکڑاتی سردی، دُھند، کہر، سنہری چمکیلی دھوپ اور طویل راتیں لیے ہوئے تھا۔ آج کل یونیورسٹی کی فضا پر خوب رنگ چڑھا ہوا تھا۔ طالب علم بے حد مصروف تھے۔ کلاسیں انتہائی باقاعدگی سے ہوتی تھیں۔ پریکٹیکل تیزی سے ختم ہو رہے تھے۔ کسی کو کچھ ہوش نہ تھا۔ ہر ایک پر امتحان کا بھوت سوار تھا۔ امتحان شروع ہو گئے اور ختم بھی ہو گئے۔ جب امتحانوں سے فراغت ملی تو ایک دن ڈیپارٹمنٹ میں یہ افواہ سنی گئی کہ ایک گروپ دسمبر کی تعطیلات میں کراچی، حیدرآباد اور ملتان جا رہا ہے۔ لڑکیوں میں خوب گرما گرم بحث ہوئی۔ چند ایک نے کراچی کو سراہا۔ چند ایک نے خامیاں نکالیں۔ غرض ہر ایک اپنی اپنی رائے کے مطابق اظہار خیال کر رہا تھا۔ لیڈیز روم میں ایک شور مچا ہوا تھا۔

شیبہ اس ہنگامے سے الگ تھلگ ایک کونے میں کھڑی بظاہر کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ لیکن حقیقتاً وہ سوچوں کے عمیق سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”خدایا یہ پروگرام یہیں ٹھپ ہو کر رہ جائے۔ اور اسے عملی شکل کبھی نہ مل سکے۔“ اس نے دعا مانگی۔

سوچیں بڑھ رہی تھیں اور عالم تصور میں وہ کراچی کی کسی شاہراہ، کسی پارک، کسی سینما ہاؤس میں اس بددماغ انسان سے خود کا ٹکراؤ ہوتا دیکھ رہی تھی۔

''کراچی اتنا بڑا شہر ہے ۔وہاں تم اسے یقیناً نہ دیکھ سکو گی۔'' دل کے کسی گوشے سے صدا آئی ۔

''لاہور بھی تو کم بڑا شہر نہ تھا۔نہیں مَیں کبھی کراچی نہ جاؤں گی ۔مَیں اس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی ۔مجھے اس سے شدید نفرت ہے۔'' اس کا ذہن چیخ اٹھا۔

گیارہ بجے کے قریب ڈاکٹر رانا کی کلاس ہوئی ۔آج انہوں نے فضا میں ہلکی ہلکی گنگناہٹ، چہروں پر معنی خیز مسکراہٹ اور نگاہوں میں اشتیاق کی سی کیفیت دیکھی تو مسکراتے ہوئے بولے:

''کوئی خاص بات معلوم ہوتی ہے آج تو۔''

بس اتنی سی بات کہنے کی دیر تھی ۔شور مچ گیا۔لڑکیاں اپنی اپنی ہانکنے لگیں،اورلڑکے الگ شور مچانے لگے۔

ایم ایس سی کے ذمہ دار لڑکےاورلڑکیوں کو یوں بچگانہ انداز میں چلاتے اورشور مچاتے دیکھ کر ڈاکٹر رانا بے اختیار ہنس دیئے ۔پھر انہیں خاموش کرواتے ہوئے تسلی دینے کے انداز میں بولے ۔

''بھئی اگر آپ لوگ جانے کے اتنے ہی خواہش مند ہیں تو مَیں آج ہی ڈائریکٹر صاحب سے بات کیے لیتا ہوں۔''

شیبہ کی خاموشی عطیہ کے لیے معنی خیز تھی ۔کلاس سے نکل کر اس نے قدرے پریشانی سے پوچھا۔

''تم اتنی گم صُم کیوں ہو؟''

''کوئی خاص بات نہیں''۔شیبہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''چلو خاص نہیں تو عام ہی کہہ ڈالو۔رخِ روشن پر افسردگی سی طاری ہے آخر کیوں؟''

باب نمبر: 30

لیکن وہ خاموشی سے سامنے دیکھتی رہی۔

''شیبہ میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی ہے کہ کراچی جانے کے نام پر تم نے کس جوش کا مظاہرہ نہیں کیا۔تم کچھ نہیں بولیں۔''

''بولوں کیا جبکہ مجھے جانا ہی نہیں ہے۔''اس نے ٹھوس لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''کیا کہا؟''عطیہ کو اپنی سماعت پر دھوکہ سا ہوا۔

''تم نہیں جاؤ گی تم نے ایسا کیوں سوچا؟ تمہارے بغیر وہاں جانے کا کیا لطف؟''عطیہ کی آنکھیں حیرانی سے بھری ہوئی تھیں۔

''بھئی یہ تو میری مرضی پر منحصر ہے۔''شیبہ نے کسی قدر سنگدلی سے جواب دیا۔

عطیہ نے اس وقت خاموشی زیادہ مناسب سمجھی۔

اگلے دن گروپ کے کراچی، حیدرآباد اور ملتان جانے کا اعلان کر دیا گیا۔ روانگی میں دسمبر کی شام کو تھی۔

''بات بنی نا اب تو۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ والے کام ڈاکٹر رانا کو ہی زیب دیتے ہیں۔'' نغمہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر رانا زندہ باد''عطیہ نے نعرہ لگایا۔

''کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ ہم لوگ ہر چیز بھول سکتے ہیں۔لیکن ڈاکٹر راna کو کبھی نہ بھول سکیں گے۔انہوں نے اپنی محبت اور پُرخلوص رویے سے ہمارے دلوں میں جو لو جگائی ہے وہ ہمیشہ روشن رہے گی۔''عذرا نے جذباتی ہو کر کہا۔

''واقعی یہ بالکل ٹھیک ہے''۔فوزیہ اور دوسری لڑکیوں نے اس کی تائید کی۔لڑکیاں خوشی خوشی پروگرام کی تفصیلات مرتب کرنے لگیں۔لیکن ان کی حیرانی کی انتہا رہی۔جب شیبہ نے جانے سے انکار کر دیا۔کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔کہ آخر اس کے انکار کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟اور جب اس سے نہ جانے کا سبب دریافت کیا گیا۔تو یہ کہتے ہوئے اس نے بات ٹالنے کی کوشش کی ''میں پہلے بھی دو تین مرتبہ کراچی دیکھ چکی ہوں۔''لیکن یہ عذرا انہیں مطمئن نہ کر سکا۔نغمہ نے دھیرے سے کہا۔

''شیبہ سوچو اور غور کرو،تمہاری کمی ہمیں کتنی محسوس ہو گی؟تمہیں شاید اپنی اہمیت کا احساس نہیں تم ہمیں بڑی عزیز ہو اور تمہارے بغیر ٹرپ پر جانے کا تصور ہی بڑا روح فرسا ہے۔'' عذرا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''شیبہ لوگ تو کہتے ہیں،دوستوں کی موجودگی میں جہنم بھی جنت سے کم نہیں۔

کراچی کوئی تم نے ہی تو اکیلے نہیں دیکھا۔ہم میں سے بیشتر دیکھ چکی ہیں۔خود میں وہاں دو مرتبہ ہو آئی ہوں۔لیکن پھر بھی جانے کے لیے تیار ہیں،صرف اس لیے کہ ایسے مواقع زندگی میں بار بار نہیں آتے۔''

''سب کے لطف کو کرکرا کرنے کی کوشش نہ کرو شیبہ!''

فوزیہ نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

اور وہ حیران پریشان اُن کے چہروں کو بے بسی سے تکے جا رہی تھی۔وہ تو اگر اسے جہنم میں بھی دھکا دینا چاہتیں تو اُسے انکار نہ تھا۔لیکن اب وہ کیا کرے؟

آنکھوں میں یاس نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔

نگاہیں سے مجبوری اور بے بسی مترشح تھی۔
پلکوں میں چھپے آنسو باہر نکلنے کے لیے بے تاب تھے۔
لیکن دل و دماغ میں اٹھتے ہوئے طوفانوں کو وہ پوری طرح ضبط میں رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

درد کی تشہیر سے اسے نفرت تھی۔
لیکن مستقبل میں مزید کسی ذلت کو برداشت کرنے کے لیے وہ ہرگز تیار نہ تھی۔
ندامتوں کے داغ ہی نہ دھوئے جا سکے تھے اور یہی چیز ایک بار پھر اس کے انکار کا موجب بن گئی۔
ایک ایک لڑکی نے اس کی منتیں کیں۔ مگر اسے نہ ماننا تھا نہ مانی۔ ان سب کی دل شکنی اُسے گوارا تھی۔ لیکن تضحیک کے انگاروں سے وہ خود کو مزید جلانا نہیں چاہتی تھی۔ پہلے ہی بہت جل چکی تھی۔

لڑکیاں ورطہ حیرت میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ وہ ضرورت سے زیادہ حلیم الطبع واقع ہوئی تھی۔ بعض اوقات اپنی طبیعت پر جبر کرتے ہوئے بھی وہ دوسروں کی خواہشات پوری کرنے سے نہ ہچکچاتی تھی۔ لیکن آج تو حد ہو گئی تھی۔ عطیہ نے تنہائی میں اس سے پوچھا تو وہ روہانسی ہو کر بولی۔

"میں تمہارے جذبات کا احترام کرتی ہوں۔ مجھے احساس ہے۔ لیکن عطی مجھے مجبور نہ کرو۔"

"خاک احترام ہے۔ کیا احساس ہے تمہیں۔ یوں سب کو نا امید کر دیا ہے۔ سب کے جذبات کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ کم از کم تم سے ایسی توقع نہ تھی۔"
"لیکن مَیں کیا کروں؟ لہجہ اداس تھا۔
"آخر تمہارے انکار کی وجہ کیا ہے؟ جو کچھ تم کہہ رہی ہو وہ بالکل غلط ہے اور اس پر ہم میں سے کسی کو بھی اعتبار نہیں۔"

''تم نے مجھے عاجز کر دیا ہے۔اس نے جھنجھلاتے ہوئے کہااور تب ساری حقیقت معہ تمام خدشات کے اُسے سنا دی۔بات ختم ہوئی تو عطیہ اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکی۔پھر کسی قدر غصے سے بولی۔

''میرا دل تمہاری عقل پر ماتم کرنے کو چاہتا ہے۔''

''شوق سے کر سکتی ہو۔کھلی اجازت ہے۔'' شیبہ نے اطمینان سے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔''

فلاسفر صاحبہ! اس بیچارے کو اور کوئی کام تھوڑا ہی ہوگا۔سوائے اس کے کہ وہ ان سڑکوں اور تفریح گاہوں کی پیمائش کرتا پھرے جہاں شیبہ بیگم تشریف لے جائیں گی۔عقل سے سوچو کراچی اتنا بڑا شہر ہے۔وہاں صرف سات آٹھ دن رہنا ہے۔خواہ مخواہ الٹی سیدھی سوچوں سے اپنا دماغ خراب کر رہی ہو۔''

''یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔مَیں نہیں جاؤں گی۔تم نہیں جانتیں کہ دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے۔مَیں پہلے ہی کافی ذلت اٹھا چکی ہوں۔''

''اللہ! شیبہ تم اتنی سنگدلی کا کیوں ثبوت دے رہی ہو؟ تمہیں احساس نہیں۔'' عطیہ نے ہر طرف سے مجبور ہو کر اس پر ایک اور وار کیا۔

''تمہیں میری پریشانی میری مجبوری سے کوئی ہمدردی نہیں''۔شیبہ پریشان ہو کر بولی۔

''کتنی بار کہوں شیبہ کہ تم نے خود ساختہ نفرت کے جال اپنے گرد بُن لیے ہیں۔غلط فہمیوں نے حقیقت کے چہرے پر دبیز نقاب ڈال دی ہے۔تمہارے دماغ کو اُلجھا دیا ہے۔وہ انسان اتنا کم ظرف کبھی نہیں ہوسکتا۔وہ تو بڑی پیاری شخصیت کا مالک ہے۔کیوں غلط انداز میں سوچ رہی ہو۔''

''عطیہ تم میرا فیصلہ نہیں بدل سکتیں۔مَیں وہاں بالکل جانا نہیں چاہتی۔خدا کے لیے مجھے مجبور نہ کرو۔''

ٹھیک ہے اگر تمہیں فیصلے میں تبدیلی سے گریز ہے تو مَیں نے بھی سوچ لیا ہے کہ مَیں ہرگز نہیں جاؤں گی۔" عطیہ نے تیز لہجے میں کہا اور چلی گئی۔

وہ تنہا رہ گئی۔سخت پریشان تھی۔عطیہ اس کی بہت پیاری اور بہترین دوست تھی۔

شیبہ کے انکار سے اُسے دلی تکلیف ہوئی تھی۔

"خدایا کس عذاب میں پھنس گئی ہوں۔پُرسکون زندگی میں پریشانیاں ہی پریشانیاں جمع ہو گئیں۔ذہن مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔"

اُس دن عطیہ منہ بنائے الگ الگ پھرتی رہی۔دوسری لڑکیاں بھی کچھ ناراض دکھائی دے رہی تھیں۔اگلے دن عطیہ اور عذرا ڈاکٹر رانا کے پاس گئیں۔انہیں صورتحال سے آگاہ کیا۔ ان سب کو یقین تھا کہ وہ ڈاکٹر رانا کا کہنا کبھی نہیں ٹال سکے گی۔بس یہی ایک آخری صورت تھی جس پر وہ آس لگائے بیٹھی تھیں۔

شیبہ یونیورسٹی آئی تو ڈاکٹر رانا کا چپڑاسی اُسے بلانے آیا۔جب وہ ان کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ شفقت سے اسے دیکھ کر مسکرا دیئے۔اپنے قریب بٹھاتے ہوئے دھیرے سے بولے۔

"مجھے معلوم ہوا ہے، تم ٹرپ پر نہیں جا رہی ہو اور بات بھی میرے علم میں آئی ہے کہ تمہارا انکار کسی خاص مجبوری کی بنا پر نہیں ہے۔

شیبہ کبھی کبھی زندگی میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب اپنے جذبات کچل کر دوسروں کے جذبات کا احترام کرنا پڑتا ہے اور یہی وہ مقام ہے، جہاں انسانیت تکمیل پاتی ہے۔

جہاں انسان عظمت کی بلندی سے ہمکنار ہوتا ہے، تم کراچی پہلے بھی دیکھ چکی ہو۔

یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ایسے مواقع زندگی میں بار بار نہیں آئیں گے۔طالب علمی کا یہ دور ختم ہو جائے گا۔تم لوگ نئی زندگی میں قدم رکھو گی۔نئی ذمہ داریوں اور فرائض کے بوجھ تلے تمہارے کندھے دب جائیں گے اور تم زندگی کی گہما گہمی میں اُلجھ جاؤ گی۔

زندگی غموں اور خوشیوں کا مرقع ہے ۔ گم اور خوشی ساتھ ساتھ چلتے ہیں ۔ جب تفکراتِ روزگار اور غم و آرام کے جھگڑ انسان کے اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں ،تب یہی حسین لمحات، یہی یادیں، اپنی رعنائیوں سے ماضی کے دریچے سے جھانکتی ہیں اور تب واقعی طور پر انسان اپنے مصائب سے آزاد ہو جاتا ہے ۔

یہ دَور کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا ۔ یہ ساتھی بچھڑ جائیں گے ۔ تب تم چاہو گی ۔ تمنا کرو گی کہ اے کاش ایک دفعہ وہی دور پلٹ کر آ جائے ۔ لیکن گذرا ہوا وقت کبھی پلٹ کر نہیں آتا ۔ یہ یادیں انسانی زندگی کا بہترین سرمایہ ہوتی ہیں ۔'' ڈاکٹر رانا نگاہیں فضا میں جمائے خوابناک لہجے میں بول رہے تھے یوں جیسے انہیں اپنا زمانہ یاد آ رہا ہو ۔ کتنی ہی دیر بعد انہوں نے شبیہ سے پوچھا ۔

''میں تمہاری رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں شبیہ ۔''

وہ بالکل خاموش تھی ۔ جو رُخ انہوں نے اُسے دکھایا تھا جس اپنائیت سے انہوں نے اصرار کیا تھا ۔ اس کے پیش نظر انکار کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی ۔

''نہیں بالکل نہیں ۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا ۔

''سر میں جاؤں گی ۔'' اس کا لہجہ جذباتی تھا ۔

''شاباش! مجھے تمہاری سعادت مندی سے یہی توقع تھی ۔ اب جاؤ اور لڑکیوں کو خوشخبری سناؤ ۔

جب وہ کامن روم میں آئی تو نغمہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں پوچھا ۔

''ڈاکٹر رانا نے تمہیں کیوں بُلایا تھا ؟''

''تمہارے دیئے گئے پیغام پہنچانے کے لیے ۔'' اس نے کسی قدر مسکراتے ہوئے کہا ۔

''تو پھر پیغام وصول کرنے والے کا ردِ عمل کیا ہے؟'' عذرا نے تیزی سے پوچھا ۔

''اس نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں ۔'' شبیہ نے عطیہ کی طرف گہری نظروں سے دیکھا ۔

سبھی خوشی سے چلا اٹھیں ۔عطیہ سے تو ضبط نہ ہو سکا ۔خوشی سے اسکے گلے میں بانہیں ڈال دیں ۔

تبھی شیبہ کو ڈاکٹر رانا کے الفاظ یاد آ گئے ۔

"یہ وقت یہ ساتھی ایک دن بچھڑ جائیں گے ۔"

باب نمبر: 31

اپنے سروں کو دوپٹوں اور رومالوں سے ڈھانپے اور اوور کوٹوں کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ کی لڑکیاں پلیٹ فارم پر اِدھر اُدھر ٹہل رہی تھیں۔ پلیٹ فارم کی دودھیا روشنی میں اُن کے چہرے بڑے ہی معصوم دکھائی دے رہے تھے۔ بیشتر لڑکے اور لڑکیاں آ چکے تھے لیکن ابھی کچھ اور بھی آنے والے تھے۔ جانے ولوں کی کُل تعداد ساٹھ تھی۔

اکیس لڑکے اور انتالیس لڑکیاں۔ دور سے لڑکیوں کو شیبہ عطیہ اور ان کے ساتھ شیبہ کے دونوں چھوٹے بھائی آتے دکھائی دیئے۔ سیاہ رنگ کے کوٹ میں شیبہ کا صبیح و دلکش چہرہ چمک رہا تھا۔

ریلوے والوں نے دو بوگیاں ٹرین کے ساتھ ان لوگوں کیلئے لگا دیں۔ لڑکیاں اپنے کمپارٹمنٹ میں جا کر اپنا سامان درست کرنے لگیں اور لڑکوں نے دوسرے ڈبے پر قبضہ جما لیا۔

روانگی کا وقت ہو رہا تھا۔ سیٹی کی تیز آواز سنائی دی۔ شیبہ نے بھائیوں کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے انہیں اتر جانے کے لیے کہا۔ پہیے ہلے اور گاڑی نے خفیف سی حرکت کی۔ پلیٹ فارم پر کھڑے بہت سے لوگوں نے رومال فضا میں لہرائے۔ گاڑی کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ اسٹیشن نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ ہوا کے سرد تھپیڑے تیزی سے کھڑکیوں کے راستے اندر آ رہے تھے۔ لڑکیوں نے فوراً شیشے چڑھا دیئے۔

دس بجے کے قریب انہوں نے کھانا کھایا۔گرم گرم چائے پی۔کھانے پینے سے فراغت پاکر انہوں نے اپنے اپنے بستر سیٹوں پر جمائے اور کمبلوں میں دبک کر چلغوزوں کا دور شروع کیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی ہو۔تین بجے تک وہ دنیا بھر کے موضوعات پر باتیں کرتی رہیں اور یہ موضوع کیا تھے؟ یہی کہ کون کون کس کس سے لگاؤ رکھتی ہے؟ شادی کیلئے کوئی سکوپ ہے یا نہیں۔محبت کی شادی پروان چڑھتی ہے یا چند ماہ بعد ختم ہو جاتی ہے۔اپنے اپنے دلائل کو پُر زور بنانے کے لیے حمایت اور مخالفت میں خوب خوب مثالیں پیش کی گئیں۔شوہر کی مثالی خوبیاں زیر بحث لائی گئیں۔شادی کیلئے مناسب عمر پر غور و خوض ہوا۔ساتھی لڑکوں اور کنوارے لیکچرارز کو کسوٹی پر رکھا گیا۔بعض کو رد کر دیا گیا اور بعض کو کامیاب قرار دیا گیا۔

''ہم سے زبردست غلطی ہوئی''شیبہ نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔

''کیا''

سبھی لڑکیاں چونک کر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

''بھئی ایک عدد مولوی اور نکاح کے لیے چھوارے،ضرور لانے چاہیں تھے۔تاکہ ان رشتوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا سکتا جو ہم نے یہاں تجویز کیے ہیں۔''شیبہ نے اسی انداز میں کہا۔

''اور ان دُم چھلوں کے ساتھ جب گھر جائیں تو کیا ہو۔یہ بھی سوچا ہے؟''نغمہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔کیونکہ شیبہ تو سبھی کو فیل کر چکی ہے۔وہ تو کسی یونانی شہزادے کی منتظر ہے۔''فوزیہ نے چوٹ کی۔

گھبرانے والی کونسی بات ہے بالکل اسی طرح اٹھا کر باہر گلی میں پھینک دیئے جاؤ گے جس طرح گھر کا کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے۔''عطیہ تمسخرانہ انداز میں بولی۔

''بس کرو اب ان چکروں کو تین بج رہے ہیں۔اب بھی نہ سوئے تو صبح سر پھٹیں گے۔''

اگلے دن تقریباً ایک بجے کے قریب وہ لوگ کراچی پہنچ گئے۔لمبے سفر نے ان سب کو

تھکا دیا تھا۔

ڈاکٹر صدیقی اور ڈاکٹر رانا یونیورسٹی ہوسٹل میں جگہ کا پتہ کرنے چلے گئے ۔ بقیہ لوگوں نے سٹیشن کے باتھ روم میں باری باری جا کر منہ دھویا۔چائے پی اور اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔

''بھئی انتظام تو پہلے ہو جانا چاہیے تھا''فوزیہ نے ہولڈال کا فیتہ کستے ہوئے کہا۔

''کراچی یونیورسٹی ہوسٹل کو جگہ کے لیے تو لکھا گیا تھا۔لیکن ان لوگوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ویسے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔کہیں نہ کہیں انتظام ہو ہی جائے گا۔''یہ شیبہ کی آواز تھی۔

شام تک وہ لوگ اپنی دو بوگیوں میں جو ریلوے والوں نے فالتو لگائی تھیں' بیٹھے ان کا انتظار کرتے رہے۔شام گہری ہوتی جا رہی تھی، دونوں ڈبے الگ کر کے ایک دوسری لائن پر کھڑے کر دیئے گئے۔تقریباً سات بجے ڈاکٹر رانا ان کے کمپارٹمنٹ میں آئے۔لڑکیاں انہیں دیکھتے ہی''سر کہاں چلنا ہے؟''

''فی الحال تو یہیں رہنا ہے کیونکہ یونیورسٹی ہوسٹل میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات آئے ہوئے ہیں۔انہوں نے بتایا ہے کہ ہم آپ کو معذرت کا خط لکھ چکے ہیں۔گورنمنٹ کالج نے بھی جگہ دینے سے معذروی ظاہری کی ہے۔دو ایک ملنے والے بھی تھے وہ یہاں موجود نہیں۔اچھا تم لوگ اب آرام کرو صبح پھر کوشش کی جائے گی۔''

اور یہ خبر کہ دو ایک ملنے والے بھی یہاں موجود ہیں۔''شیبہ کے لیے کس قدر طمانیت کا باعث تھی۔کوئی نہیں جانتا تھا۔اس کے انگ انگ میں خوشی کی لہری دوڑ گئی۔

اس رات ڈاکٹر رانا لڑکیوں کے پاس سوئے۔تقریباً ایک بجے کا وقت ہو گا۔جب اچانک گڑگڑ گڑ کی آواز نے نیند میں مدہوش لڑکیوں اور لڑکوں کو جگا دیا۔یوں معلوم ہو رہا تھا۔جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔نیند سے لبریز آنکھیں پوری طرح پھیل چکی تھیں۔ہر شخص اصل صورتِ حال جاننے کے لیے مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔اچانک تیز گڑگڑاہٹ کے ساتھ ڈبے چل پڑے۔

ڈاکٹر رانا بھی پریشان تھے ۔معلوم کیا بلا نازل ہوگئی ہے۔

لڑکیوں کے رنگ بدل گئے تھے۔تھوری دیر بعد حرکت بند ہوئی۔ ڈاکٹر رانا نے صورتحال کا باہر جا کر جائزہ لیا۔ادھر لڑکوں کی طرف بھی کچھ ایسی ہی بے قراری تھی ۔معلوم ہوا کہ جس لائن پر ڈبے کھڑے تھے ۔اس لائن پر کہیں سے گاڑی آ رہی تھی ۔لہٰذا لائن کو کلیر کیا گیا تھا۔

''اُف تو بہ میں تو یہ سمجھی تھی کہ بس اب آخری وقت آ گیا ہے ۔اور ہم عالم ارواح کی طرف سفر کر رہے ہیں۔'' فوزیہ نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر صاحب ہنس دیئے۔

اگلے دن کوئی آٹھ بجے کے قریب ڈاکٹر رانا ڈاکٹر صدیقی کے ساتھ جگہ کی تلاش کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ ساڑھے آٹھ کا وقت تھا۔لڑکیاں اِدھر اُدھر کے کاموں میں مصروف تھیں۔کوئی بال بنا رہی تھی تو کوئی پہننے کیلئے کپڑے درست کر رہی تھی کہ یکدم وہی رات والی گڑگڑاہٹ ہوئی۔ڈبوں کو شدید جھٹکے لگے۔کھڑی لڑکیاں بیٹھی ہوئی لڑکیوں پر گر پڑیں۔کنگھے کہیں جا گرے۔آئینے ٹوٹ پھوٹ گئے۔کسی کے سر میں چوٹ آئی، کسی کا بازو دب گیا، کسی کے کھلے بال کھنچ گئے۔عجیب افراتفری کا عالم تھا۔

''ہم کس عذاب میں پھنس گئے ہیں اپنے اپنے گھروں میں اطمینان سے چھٹیاں گزارتے تو کیا بہتر نہ ہوتا...... عارفہ چلا رہی تھی ......سبھی لڑکیاں چیخ رہی تھیں۔

لیکچرار یونس اُن کے ڈبے میں آئے اور تسلی دینے کے انداز میں بولے۔بھئی۔گھبرانا نہیں۔شنٹنگ ہو رہی تھی۔''

''جہنم میں گئی شنٹنگ اور بھاڑ میں جائے ٹرپ۔کم از کم جگہ کا انتظام ہو جانا چاہیے تھا۔ یوں احمقوں کی طرح منہ اٹھائے چلے آئے ہیں۔'' نغمہ نے کہنی مسلتے ہوئے انتہائی غصے سے کہا۔

''صبح منہ دھونے گئے تو لوگ یوں دیکھ رہے تھے جیسے ہم دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہوں۔'' عطیہ نے غصہ جھاڑا۔

''بھئی ہر چیز کا روشن پہلو دیکھا کرو۔ یہ تو سوچو ایسے مزے کہیں مل سکتے تھے؟'' یونس صاحب نے ان کی ولداری کی۔

دس بجے سب لڑکیاں لیکچرار اختر کے ساتھ گھومنے پھرنے نکل کھڑی ہوئیں جانے کیوں شیبہ کو اپنا بدن ٹوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں ہلکی ہلکی جلن محسوس ہو رہی تھی۔ ڈیڑھ بجے جب واپس آئیں تو ڈاکٹر رانا کمپارٹمنٹ میں بیٹھے چند لڑکیوں سے باتیں کر رہے تھے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ کوشش کے باوجود بھی انہیں کہیں جگہ نہیں مل سکی۔ سوچا بھی نہ تھا، کبھی یوں بھی ہو سکتا ہے۔ انہوں نے بڑے ہی افسوس ناک سے لہجے میں کہا اور پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولے۔

''ہر طرف سے مایوس ہو کر مجھے اپنے ایک گہرے واقف کار یاد آئے۔ وہ فضائیہ میں سنئیر میڈیکل آفیسر ہیں۔ خیر صاحب انہیں فون کیا گیا۔ مطلب بتایا گیا۔ بھلا ہو اُن کا۔ انہوں نے تین بجے دوبارہ فون کر کے معلوم کرنے کے لیے کہا ہے اور ساتھ ہی یہ یقین بھی دلایا ہے کہ رہائش کا بندوبست ضرور ہو جائیگا۔ اب دیکھیں کیا ہوتا ہے۔''؟

یک لخت شیبہ کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ٹوٹتا ہوا جسم کچھ اور بھی ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔

آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا۔ دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر رانا کیا کہہ رہے تھے۔ لڑکیاں کیا باتیں کر رہی تھیں؟ اُسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ چاروں طرف مذاق اڑاتی گہری آنکھیں دیکھ رہی تھی۔ وہ آنکھیں جن میں جھلکتا ہوا گہرا غرور ہمیشہ اُسے تمسخرانہ انداز میں دیکھتا۔ جس بات سے ڈرتی تھی، جس کا خدشہ تھا وہی ہو کر رہا۔ ''اُف خدایا میں کیا کروں۔ کیا کروں۔'' اس سے اس کو آنکھوں میں اتنی جلن محسوس ہوئی کہ وہ تڑپ اُٹھی۔

''اب کیا ہوگا۔''؟

اور یہ ''اب'' اُسے تڑپا گیا۔

''نہیں''

''میں اب مزید کسی ذلت کو اپنے دامن میں جگہ دینے کے لیے تیار نہیں ۔میں واپس جاؤں گی ۔ٹرین سے نہیں تو ہوائی جہاز سے ۔دنیا کی کوئی طاقت اب مجھے نہیں روک سکے گی ۔''

ڈاکٹر رانا کبھی کے جا چکے تھے ۔وہ اُٹھی ۔عطیہ نے اس کا سُرخ سُرخ چہرہ دیکھا ۔قریب آئی لیکن شیبہ نے اس کی طرف توجہ نہ کی ۔اپنا سامان سمیٹنے لگی ۔عطیہ نے اصرار کیا اور جب اسے معلوم ہوا تو کسی قدر غصے سے بولی ۔

''تو گویا فضائیہ میں سینئر میڈیکل آفیسر اس کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا ۔''

''خدا کے لیے ہوش میں آؤ ۔''اور پھر اسے بازو سے پکڑ کر نیچے گھسیٹ لائی ۔کافی دور جا کر منت آمیز لہجے میں بولی ۔

''رنگ میں بھنگ مت ڈالو شیبہ! ذرا سوچو تو کہ ریلوے کی ان بوگیوں میں لاوارثوں کی طرح پڑے ہم دوسروں کے لیے سامانِ تضحیک بنے ہوئے ہیں ۔اگر ہمیں وہ اچھا ٹھکانا دے دے تو اس کا ہم سب پر احسان ہے ۔شیبہ ہماری تعداد ساٹھ ہے ۔اگر اس احسان کو ساٹھ پر تقسیم کرو تو تمہارے حصے میں بالکل اتنا سا آئے گا ۔''

اس نے سنجیدگی سے انگشت شہادت اور انگوٹھے کی پور کے درمیان ذرا سا فاصلہ دکھاتے ہوئے کہا ۔

''تجھے اس عالم میں بھی مذاق سوجھتے ہیں کمبخت !''

اُس نے انتہائی برانگیختی سے اُسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا ۔

''میں آج ہی واپس جاؤں گی ۔آج ہی''اس نے واپس مڑتے ہوئے کہا ۔

''دماغ خراب ہو گیا ہے ۔'' عطیہ نے اس کا بازو پکڑ لیا ۔لیکن دوسرے ہی لمحے وہ چلائی ۔

''یہ کیا تمہارا بدن تو تپ رہا ہے ۔''اور پھر اس کی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی ۔

''یہ تمہاری آنکھیں بھی لال سرخ ہو رہی ہیں؟ تمہیں تیز بخار ہے۔صبح میں نے نہانے سے منع بھی کیا تھا۔''

''چھوڑو میرا بازو......ٹھیک ہوں میں بالکل''۔وہ بے حد تلخی سے بولی۔

اس نے اپنا بستر ٹھیک کیا۔کپڑے درست کیے۔لیکن یک دم اسے کپکپی سی محسوس ہوئی۔ فوراً اس نے کوٹ پہن لیا۔سردی زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔بدن بُری طرح ٹوٹ رہا تھا۔بے دم سی ہو کر اس نے سر سیٹ سے لگا دیا۔سردی سے اب وہ کانپنے لگی تھی۔عطیہ اس کی حالت دیکھ رہی تھی۔ بھاگی بھاگی پاس آئی۔دوسری لڑکیوں کو بھی آواز دی۔فوراً اُسے لٹا دیا گیا۔جتنے کمبل باہر تھے سب اس پر ڈال دیے لیکن اس کی کپکپاہٹ کم نہ ہوئی۔سبھی لوگ بڑے پریشان تھے۔

لو بھئی اب چلنے کی تیاری کرو۔ڈاکٹر رانا نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

شیبہ کے متعلق جب انہیں معلوم ہوا تو انہیں بھی فکر دامن گیر ہوئی۔پرائی لڑکیوں کا معاملہ تھا۔مگر سب لڑکیوں کی گھبراہٹ دیکھ کر بولے۔

''گھبراؤ نہیں سامان تیار کرو۔میں شیبہ کو لے کر چلتا ہوں۔''

باب نمبر: 32

ریسیور اُن کے ہاتھ میں تھا۔ سر کرسی کی پشت سے ٹکا ہوا تھا اور آنکھیں بہرا گہرا خمار لیے کھلی تھیں۔ خوابیدہ تمنائیں بیدار ہو کر ان کی حسین آنکھوں سے جھانک رہی تھیں۔ سارا وجود کیف و سرور میں ڈوبا ہوا تھا اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ انہوں نے ابھی ابھی ڈاکٹر رانا کا فون ریسور کیا تھا۔ فون جوان کے دل میں لطیف و خوش گوار دھڑکنوں کے مدوجزر پیدا کر گیا۔ کمرے کی فضا جو تھوڑی دیر قبل اداس سی تھی۔ اب انہیں ایک انوکھا حُسن اور رنگینی لیے محسوس ہو رہی تھی۔ فضا میں موسیقی جیسا سحر رچ گیا تھا۔ محبت بھرے گیتوں کی گنگناہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ ایسی گنگناہٹ جس میں کسی کی آواز کا ترنم شامل تھا۔ حُسن کا ایک ایسا سحر ایک ایسا انمول شاہکار ان کے تصور میں بسا ہوا تھا جس کے سامنے دُنیا کی رنگینیاں مات کھائے ہوئے تھیں۔

حسن کے متعدد روپ تصور کے آنچل پر پھیلتے جا رہے تھے اور وہ ہر روپ سے لطف اٹھا رہے تھے۔

''شاید وہ ٹرپ پر آئی ہی نہ ہو۔'' مبہم سے اندیشے نے سر اٹھایا۔

ریسیور ہاتھ میں لرز گیا۔ حسین تصورات پھڑ پھڑا سے گئے۔ دماغ بوجھل پن محسوس کرنے لگا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے وہ ''نہیں'' کہتے ہوئے اپنے اندیشے کی پُر زور تردید کر رہے

تھے۔

تھوڑی دیر بعد انہوں نے توصیف کو فون کیا۔صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے انہوں نے اُس کوٹھی کو چند دنوں کے لیے دینے کو کہا۔جو کرایہ کے لیے خالی تھی......گہری دوستی تھی انکار کا سوال ہی نہ تھا۔

ڈاکٹر رانا کے فون کرنے پر جب منیب نے انہیں کوٹھی کا نمبر اور جائے مقام بتائی تو تشکر کے جذبات سے لبریز ان کی آواز منیب کو فون پر سنائی دی۔

''منیب میں تمہارا شکر گذار ہوں۔''حقیقتاً میں نے تمہیں تکلیف دی ہے۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ ڈاکٹر صاحب؟''

سوا تین بجے وہ اپنی کوٹھی چلے گئے۔چائے پیتے ہوئے آج خلاف معمول وہ گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔اچانک نوکر کی آواز پر چونک اٹھے جو فون سننے کے لیے کہہ رہا تھا۔

''منیب مَیں تمہیں دوبارہ تکلیف دینے کے لیے شرمندہ ہوں۔مجبوری ہی ایسی ہے کہ تم سے مشورے کی ضرورت پیش آئی۔دراصل ایک لڑکی کو سخت بخار ہو گیا ہے۔اگر تمہیں فرصت نہ ہو تو کسی اور اچھے سے ڈاکٹر کا پتہ بتا دو۔''فون پر ڈاکٹر رانا ان سے مخاطب تھے۔

''کسی اور ڈاکٹر کی کیا ضرورت ہے مَیں ابھی آ رہا ہوں۔انہوں نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔

مسکراہٹ ان کے لبوں پر پھیل گئی تھی۔آنکھیں شوخی سے مسکرا اٹھی تھیں۔لباس تبدیل کرتے ہوئے وہ سوچ رہے تھے کہ قدرت بڑی بے نیاز ہے اور تھوڑی دیر بعد وہ دوائیوں کا بیگ اور سیتھو سکوپ ہاتھ میں پکڑے کار کی طرف بڑھ رہے تھے۔

کار پورچ کے قریب جا کر رُک گئی۔لان میں بیٹھے لڑکے باتوں میں مصروف تھے۔جب وہ کار سے باہر نکلے تو سبھی ان کی طرف دیکھنے لگے۔ان کے قریب پہنچ کر انہوں نے ایک لڑکے سے ڈاکٹر رانا کو اطلاع دینے کے لیے کہا۔

دو منٹ ہی گذرے ہوں گے کہ ڈاکٹر رانا انہیں سامنے سے آتے دکھائی دیئے۔ مسکراتے ہوئے وہ ان کی طرف بڑھے۔شفقت و پیار سے انہوں نے منیب کے کندھے تھپتھپائے اور تکلیف دینے کی معذرت کی۔مسکراتے ہوئے منیب ان کی طرف دیکھ کر بولے۔

''آپ تکلفات کے عادی ہوتے جا رہے ہیں ڈاکٹر صاحب۔''

کمرے میں داخل ہوتے وقت ایک اچٹتی سی نظر انہوں نے اندر دوڑائی۔لیکن ان کی نگاہیں اس ہستی کو نہ دیکھ سکیں۔جسے دیکھنے کے وہ متمنی تھے۔پریشان سے ہو اٹھے۔لیکن کچھ سوچتے ہوئے انہوں نے اپنے دل کو تسلی دی۔مریضہ کے پاس پہنچ کر دھیرے سے ڈاکٹر رانا نے کمبل چہرے سے ہٹایا۔

اور اس چہرے پر نظر پڑتے ہی منیب چونک اُٹھے۔پریشان ہو گئے۔اس کا چہرہ بخار کی حدت سے تمتما رہا تھا۔حسین آنکھیں،لمبی لمبی پلکوں کے سائے تلے بند تھیں۔ناک کے نتھنے پھڑک رہے تھے اور کھلے گیسوؤں کے درمیان اس کا تابناک چہرہ اپنی تمام دلفریبوں سے تکیے پر پڑا تھا۔

تیزی سے جھک کر انہوں نے اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھا۔لیکن دوسرے ہی لمحے ہاتھ اُٹھا لیا۔پیشانی جل رہی تھی۔درجہ حرارت دیکھا تو ۱۰۴ سے کچھ اوپر تھا۔سٹیتھ سکوپ سے اچھی طرح معائنہ کیا۔بازو میں انجکشن لگایا اور ڈاکٹر رانا سے کہا کہ ابھی تھوڑی دیر بعد میرا نوکر آپ کو دوائی دے جائے گا دو دو گھنٹہ بعد دیں۔دس بجے میں دوبارہ آؤں گا۔''

''ڈاکٹر رانا پریشانی سے بولے۔''منیب خطرے والی بات تو نہیں۔''

''نہیں گھبرایئے نہیں۔انشاءاللہ جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔''

دس بجے وہ پھر آئے۔بخار دیکھا تو ۱۰۵ تک پہنچا ہوا تھا۔وہ بڑے صحت مند دل و دماغ کے مالک تھے۔اسے یوں پردیس میں سخت بیماری کی حالت میں دیکھ کر انہیں قلبی تکلیف ہوئی تھی۔لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں قوی اُمید تھی کہ وہ جلد ٹھیک ہو جائے گی۔

لیکن اب تو ڈبل نمونیے کا خطرہ لاحق تھا۔گہری پریشانی ان کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔ٹھہرے ہوئے لہجے میں وہ ڈاکٹر رانا سے مخاطب ہوئے۔

''میرا خیال ہے آپ انہیں ہمارے ہسپتال میں داخل کرا دیں۔وہاں ان کا علاج اور دیکھ بھال بہتر طریقے سے ہو سکے گی۔''

ڈاکٹر رانا خطرے کی بُو سونگھ چکے تھے۔گھبرائی ہوئی آواز میں بولے۔

''کیوں نہ میں ان کے پاپا کو ٹرنک کال کر دوں۔وہ بڑے قابل ڈاکٹر ہیں۔''

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔میں نے یہ بات آپ کی سہولت کے پیش نظر کہی تھی۔آپ ان کے گھر فون کریں گے تو وہ لوگ پریشان ہو کر یہاں بھاگیں گے۔کیا فائدہ؟''

''سر ڈاکٹر صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ہسپتال میں ان کا علاج بہتر طریقے سے ہو سکے گا۔''

''میں خود اس کے پاس رہوں گی۔'' عطیہ نے قریب آ کر ڈاکٹر رانا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''ٹھیک ہے پھر......دراصل میری پریشانی بھی اپنی جگہ بجا ہے۔لڑکی کا معاملہ ہے۔ہم لوگ تو یہاں آ کر مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔''

''ڈاکٹر صاحب زندگی میں ایسے چکر تو چلتے ہی رہتے ہیں۔'' منیب نے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔''ابھی تھوڑی دیر بعد ایمبولینس آئے گی۔آپ لوگ اسے لے کر آ جائیں۔ہاں ایک بات میں آپ کے گوش گذار ضرور کرنا چاہتا ہوں۔اگر اجازت ہو تو۔''

منیب نے قدرے مسکراتے ہوئے اجازت طلب نظروں سے ڈاکٹر رانا کو دیکھا۔''کیا؟''

ان کی نگاہیں استفہامیہ انداز میں منیب کو دیکھ رہی تھیں۔

''کل صبح یوں نہ ہو کہ اس کے کلاس فیلوز لڑکے اور لڑکیاں مجمع کی صورت میں اس کی عیادت کے لیے ہسپتال پہنچے ہوئے ہوں اور ہسپتال کے لوگ حیران ہوں کہ یہ جم غفیر کہاں سے

آ چکا ہے۔"

"نہیں مطمئن رہئے منیب ایسا نہیں ہو گا۔" ڈاکٹر رانا بھی مسکرا اٹھے۔"

ڈاکٹر رانا اور عطیہ جب شیبہ کو لے کر ہسپتال پہنچے تو سسٹر نے ان کی رہنمائی کی۔ خوب صورت اور کشادہ سے ایک کمرے میں بیڈ پر شیبہ کو احتیاط سے لٹا دیا گیا۔

دیواروں پر ہلکا آسمانی رنگ تھا۔ دروازے اور کھڑکیوں پر بھاری اور قیمت پردے آویزاں تھے۔ سامنے آتش دان کے پاس ہی بڑی سی گول میز کے گرد کھانے کی کرسیاں تھیں۔ میز پر مختلف رسائل بکھرے پڑے تھے۔ کمرے میں گزرنے کے لیے لمبے لمبے ٹاٹ بچھائے گئے تھے تاکہ قدموں کی چاپ مریضوں کے سکون کو درہم برہم نہ کر سکے۔

ڈاکٹر رانا نے سسٹر سے منیب کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا کہ مردانہ وارڈ میں ایک خطرناک کیس آ جانے کی وجہ سے وہاں مصروف ہیں۔ بس ابھی آیا ہی چاہتے ہیں...... تھوڑی دیر بعد منیب بھی آ گئے۔ اس کو دوبارہ دیکھا۔ انجکشن لگایا۔ لیکن ابھی تک بخار کی تیزی کی وجہ سے بے ہوش تھی۔ بارہ بجے کے قریب انہوں نے ڈاکٹر رانا کو اپنی کوٹھی میں سونے کے لیے بھیج دیا اور عطیہ کو بھی دوسرے بستر پر آرام کے لیے کہا۔ وہ خود بھی تھکن محسوس کر رہی تھی۔ خاموشی سے اُٹھ کر بستر پر لیٹ گئی۔ ایک عجیب سا خیال اس کے دماغ میں آیا اور یہ خیال اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ بکھیر گیا۔ مسکراتے ہوئے اس نے اِس خیال کی تائید کی۔

"واقعی اس بار کارحم سا تھ تمام ہمدردیوں سے نمبر لے گیا ہے۔ پاگل لڑکی جب ہوش میں آئے گی تو جانے کیا طوفان اٹھے گا؟ اس کی صورت سے اسے نفرت ہے اور اب معلوم ہی نہیں کہ وہ معالج کی حیثیت سے رات کی اس تنہائی میں اس کے سرہانے بیٹھا ہوا ہے۔" اچانک شیبہ کی شکستہ آواز سنائی دی۔ جو شاید پانی مانگ رہی تھی۔

ٹیبل لیمپ کی روشنی میں اُس نے دیکھا کہ منیب اپنے ہاتھ سے اس کا سر قدرے اونچا کیے ہوئے ہیں اور دوسرے ہاتھ میں چمچ پکڑے اس کے منہ میں پانی ڈال رہے ہیں۔ اس کی

آنکھیں ابھی تک بخار کی حدت سے بند تھیں۔ بہت آہستگی سے اس کا سر انہوں نے تکیے پر رکھ کر بکھرے بالوں کو ٹھیک کیا۔

کتنی ملائمت اور وقار تھا ان کے چہرے پر۔ ان کی شخصیت واقعی بڑی سحر انگیز تھی۔ عطیہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

شدت سے پہلی بار شیبہ پر بے تحاشہ غصہ آیا۔ اتنا پیارا انسان جسے پا کر یقیناً اپنی خوش بختی پر ناز کیا جا سکتا ہے۔ لیکن پاگل لڑکی رحم اور ہمدردیوں کے فلسفے میں جل رہی ہے۔ غلط فہمیوں کے چکر میں الجھی ہوئی ہے۔ خودی اور آن کے مجروح ہونے کا رونا رو رہی ہے۔

رات میں جتنی بار بھی اس کی آنکھ کھلی۔ ہر بار اُس نے منیب کو کبھی اس کا ٹمپریچر لیتے کبھی انجکشن لگاتے اور کبھی دوائی دیتے پایا۔

تین دن تک وہ سخت بخار میں مبتلا رہی، اور ان دنوں میں عطیہ پر منیب کا کردار کھل کر سامنے آیا۔ ہسپتال کا سارا عملہ مریض اور دوسرے لوگ بھی ان کی شخصیت سے بے پناہ متاثر تھے۔ ان کی ڈیوٹی کے اوقات کسی پابندی کے تحت نہ تھے۔ رات کے کسی وقت جب جس کا دل چاہتا اُنہیں بُلا سکتا تھا۔ وہ بہت قابل ڈاکٹر مانے جاتے تھے۔ انتہائی ٹھہرے ہوئے اور متحمل مزاج انسان تھے۔ عطیہ کا انہوں نے اتنا خیال رکھا کہ کبھی کبھی وہ شرمندہ ہو جاتی۔ وہ ان کی بلند ظرفی، ان کی شرافت اور ان کے پُر خلوص رویے سے بے حد متاثر ہو چکی تھی۔

کبھی کبھی جب شیبہ پر ہذیانی کیفیت طاری ہو جاتی ...... دماغ میں رچے بسے خیالات ٹوٹے پھوٹے الفاظ کی صورت میں زبان سے نکلتے تو جہاں ان کا مفہوم دوسرے لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہوتا۔ وہاں عطیہ ان بے ربط لفظوں سے بہت کچھ سمجھ جاتی۔ پھر غصے سے کھول ہی تو جاتی۔

عطیہ اور منیب ایک دوسرے سے خاصے بے تکلف ہو گئے تھے۔ عطیہ جیسی شریر لڑکی سے کوئی جیت جائے۔ یہ کیسے ممکن تھا۔ اتنی گہری چوٹیں کر جاتی کہ منیب کو مسکراتے ہی بن پڑتی۔ کسی حد تک وہ ان کے جذبات سے آگاہ ہو چکی تھی۔

اچانک منیب کو کسی سرکاری کام کے سلسلے میں ایک دن کے لیے باہر جانا پڑا۔جانا تو وہ نہیں چاہتے تھے۔لیکن مجبوری تھی۔ڈاکٹروں کو شیبہ کے متعلق خصوصی تاکید کی اور چلے گئے۔اگلی صبح شیبہ ہوش میں آ چکی تھی۔بخار ٹوٹ گیا تھا۔کئی مرتبہ وہ عطیہ سے پوچھ چکی تھی کہ کیا وہ ہسپتال میں ہے۔کمرے کی شان شوکت دیکھتے ہوئے اسے شک ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ وہ یہاں ہے۔ لیکن پھر وہ بھی وہ تسلی کر لینا چاہتی تھی۔عطیہ کسی پرائیویٹ ہسپتال کا کہہ رہی تھی۔دراصل عطیہ ابھی اسے کچھ نہیں بتانا چاہتی تھی۔ابھی تو وہ خطرے سے باہر نکلی ہی تھی۔دماغی ہیجان کہیں کوئی اور گل نہ کھلائے اس بات سے وہ ڈرتی تھی۔

لیکن کب تک ڈاکٹر راؤنڈ پر آیا۔اس کی وردی کھلا اور روشن ثبوت تھی کہ وہ کہاں ہے اور بس یہی چیز اُسے برانگیختہ کر گئی......وہ کھول اٹھی۔

لیکن عطیہ بھی پھر عطیہ تھی۔اسے خوب ہی تو سنائیں۔اس کا پُرخلوص رویہ اس کی پریشانی غرض کہ اس نے ہر پہلو کو تفصیل سے اس کے سامنے پیش کیا۔لیکن یہ سب باتیں بے کار تھیں۔

شیبہ نے کسی بات کو بھی ڈھنگ سے نہ سنا۔بس ایک ہی تلخ بات بار بار یاد آئے جا رہی تھی۔

"میں نے کیا گناہ کر ڈالا ہے؟ مجھ سے کون سی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔"؟

اس کے دل ودماغ میں اٹھتے ہوئے طوفانوں سے عطیہ بے خبر نہ تھی۔کیونکہ درجہ حرارت کی یکدم زیادتی اس بات کا بین ثبوت تھی کہ وہ نفرت کے سیاہ اور خوفناک طوفانوں کی زد میں آ چکی ہے۔

اگلی صبح عطیہ گہری سوچ میں ڈوبی معلوم ہو رہی تھی۔دراصل وہ سوچ رہی تھی کہ منیب نو بجے تک آ جائیں گے اور پھر یہ آتش فشاں پہاڑ پھٹے گا۔اور اس پہاڑ کو وہ اپنے سامنے پھٹتے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔وہ چلی جانا چاہتی تھی۔

دھیرے سے شیبہ کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

”شیبہ میرے کپڑے میلے ہو رہے ہیں۔ میں ذرا کپڑے بدلنے کے لیے جانا چاہتی ہوں۔ ایک دو بجے تک لوٹ آؤں گی۔“

”جاؤ۔“ اس نے غصے سے کہا۔ اور کروٹ بدل لی۔

باب نمبر: 33

عطیہ کے کہے ہوئے الفاظ اُن نوکیلے کانٹوں کی طرح اس کے دل و دماغ پر زخم کر رہے تھے جو سرِ راہ پڑے راہروں کے پاؤں میں چبھ کر انہیں اچانک ہی ایک ایسی تڑپ اور کسک دے جاتے ہیں جس کے وہ غریب راہی متوقع بھی نہیں ہوتے۔ درد کی یہ ٹیس اتنی ناقابلِ برداشت تھی کہ وہ اپنی بے بسی پر تڑپ اٹھی۔ عطیہ کی تعریفیں اُسے یاد آ رہی تھیں۔

"وہ کیا جانتی ہے؟ آہ جلے بغیر کبھی جلن کا احساس ہوا ہے۔ چوٹ لگے بغیر بھی کبھی چوٹ کا احساس ہوا ہے۔ یہ تو گھائل ہونے والا ہی جانتا ہے کہ وار کتنا تیز تھا اور وہ جسم کے کس حصے کو چیر گیا ہے"

ڈاکٹر رانا پر اسے غصہ ہی نہیں آ رہا تھا بلکہ افسوس بھی ہو رہا تھا۔ "اتنی ذمہ دار شخصیت اگر علاج نہیں کروا سکتے تھے، اگر تیمارداری کرنے سے معذور تھے تو یوں یتیموں اور لاوارثوں کی طرح دوسروں کے سپرد کیوں کر دیا۔ ویسے ہی مرنے دیا ہوتا۔ وہ موت مجھے یقیناً زیادہ پسند ہوتی بہ نسبت اس صحت کے۔ یہ نئی ذلت یہ نئی رسوائی۔ آہ میں اسے کہاں جگہ دوں گی؟ کس دامن میں چھپاؤں گی؟ دل کے کن گوشوں میں اسے رکھوں گی؟ اس کے ہولناک اثر سے آنکھیں کیسے بند کروں گی؟ دل سے ٹپکتے خون کے آنسو کیسے روکوں گی۔"

میں کس عذاب میں پھنس گئی ہوں۔ زندگی کے پُرسکون سمندر میں تلاطم خیز لہریں

جانے کہاں کہاں سے آ گئی ہیں۔قلبی سکون طوفان کی زو میں آ گیا ہے۔

ذہن اپنی بے چارگی پر کھول رہا تھا۔جسم جل رہا تھا۔یکدم اتنی گرمی محسوس ہوئی کہ ایک جھٹکے سے اس نے کمبل اتارا پھینکا۔وہ بستر سے اٹھ بیٹھی۔سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر شکست خوردہ لہجے میں بولی۔

''اُف !مَیں تو اپنی نگاہوں میں آپ ہی سُبک ہو گئی ہوں۔کسی کو کیا دوش دوں۔قصور تو میرے مقدر کا ہے۔ذلت تو میری قسمت میں لکھی ہے۔ڈاکٹر رانا کو کیا کہوں اور اس بد دماغ انسان کو کیوں کوسوں؟مَیں کراچی آنے سے کیوں گریزاں تھی؟اس لیے نا کہ کہیں پھر کوئی ذلت دامن سے نہ آ چمٹے۔عطیہ سے بار بار کہا؟اس کا بھی کیا قصور؟میری قسمت ہی مجھے یہاں گھسیٹ لائی۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔کتنی ہی دیر تک آہ وزاری میں مبتلا رہی۔سردی سے بازو اور چہرے کا دایاں حصہ سُن ہو رہا تھا۔کمبل اٹھا کر اپنے اوپر لے لیا۔اچانک اسے کسی کے کمرے میں آنے اور باتیں کرنے کا احساس ہوا۔ایک آواز لیڈی ڈاکٹر کی تھی اور دوسری بڑی باوقار آواز کس کی تھی؟شیبہ کو سمجھنے میں ذرا دقت نہ ہوئی۔

''خدایا اب یہ میرے پاس آئے گا''...........اس نے سوچا۔لیکن آوازیں معدوم ہوتی چلی گئیں۔غالباً وہ اگلے کمرے کی طرف چلے گئے تھے۔شیبہ نے کمبل چہرے سے سرکا کر ذرا باہر دیکھا۔کمرہ خالی تھا۔وہ لیٹے لیٹے تھک گئی تھی۔کروٹ بدل کر اس نے بازو سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔دماغ خالی خالی سا محسوس ہو رہا تھا۔

تھوری دیر بعد نپے تلے مردانہ قدم اُسے اپنی طرف بڑھتے ہوئے محسوس ہوئے۔باوجود یہ کہ وہ دبیز کمبل میں لپٹی پڑی تھی۔لیکن تصور کی کھلی آنکھ سے وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔قدموں کی چاپ قریب آتی جا رہی تھی۔یقیناً یہ منیب ہیں''اس کا دل گواہی دے رہا تھا۔

چاپ اور قریب آئی۔

اس کے دل کی دھڑکن میں کچھ اور تیزی آئی۔

جانے اس کے لہجے میں کیا جادو تھا۔اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت کا سارا پیکر اسی ایک لمحے میں سمٹ آیا ہو۔وقت کی گردش رُک گئی ہواور کائنات میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا ہو۔

دھیرے سے اس نے کمبل اٹھایا اور اس سے اس کا دل شدت سے دھڑکا جیسا ابھی باہر نکل آئے گا۔صحت منداور زندگی کی حرارت سے بھر پور ہاتھ اب اس کی کلائی پر تھا۔سارے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔

ہاتھ اٹھالیا گیا تھا۔بیڈ کے سرہانے لٹکتا چارٹ پڑھا جا رہا تھا۔

''یہ کیسے لمحے ہیں۔کتنی گھٹن ہے ان میں؟میں بے بسی سے یہ تماشہ کیوں دیکھ رہی ہوں؟''

ہائے تھوڑی دیر بعد وہ میرے بازو میں انجکشن لگائے گا۔

سُرخ رنگ کا رقیق سیال مادہ میرے اندر ہوگا میری بے بسی پر وہ خوش ہوگا۔

''خوش ہوگا کہ ایک مجبور لڑکی اس کے رحم وکرم پر نئی زندگی حاصل کر رہی ہے۔''

ہونٹ تھرا تھرا رہے تھے۔پلکیں لرز رہی تھیں......بس نہ چلتا تھا کہ کیا کر ڈالے؟

''شیبہ''

اُف یہ لحہ قدم قدم فاصلے طے کرتا چلا آ رہا تھا۔

وہ لمحے جسے نفرت کی سنگلاخ چٹانیں بھی نہ روک سکیں۔

غزالی آنکھوں سے بہتے ہوئے اشکوں کے دریا بھی اس کی راہ میں حائل نہ ہو سکے۔وہ ظالم لہہ جس کی اس کے معصوم دل نے کبھی تمنا نہ کی تھی۔

لیکن اس کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔پہلے اس نے جو کچھ چاہا وہ نہ ہوا۔اب کیسے ہو سکتا ہے؟اتنی مدھم اور نرم آواز وہ تڑپ اٹھی۔بڑے دکھ سے اس نے سوچا۔

''اے کاش تمہارا دل بھی اتنا نرم ہوتا۔جتنی تمہاری آواز ہے۔جتنی باوقار تمہاری شخصیت نظر آتی ہے۔کاش تمہارا باطن بھی ہو بہو ویسا ہی ہوتا۔

لیکن تم انسانوں پر رحم کھاتے ہو......ان کی بے بسی سے محظوظ ہوتے ہو۔

ذہن میں تلاطم بپا تھا......''رحم کھاتے ہو......رحم کھاتے ہو'' خوددار انسانوں پر ترس کھاتے ہو۔'' آندھیوں کے جھکڑ ذہن میں چلنے شروع ہو گئے ۔ایسے جھکڑ جو طوفانوں کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں۔

آہستگی سے منیب نے اس کا بازو اس کے چہرے سے اٹھا کر نیچے کر دیا۔اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں ۔بند کرنا چاہا تو بند نہ کر سکی ۔فضائیہ کی نیلے رنگ کی سرمائی یونیفارم میں وہ اتنے زیادہ وجیہہ اور باوقار لگ رہے تھے کہ ضبط کے باوجود شیبہ کے منہ سے سسکی نکل گئی۔

اس کی سرخ سرخ سوجی آنکھوں نے منیب کو تفکر میں ڈال دیا۔اس کے بالکل سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بڑی ہی مضطربانہ آواز میں کہا۔

''آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟''

ضبط کے بند ٹوٹ گئے اس آواز پر اس کا دل قابو سے باہر ہو گیا۔ایک جھٹکے سے وہ اٹھ بیٹھی ۔آنکھوں سے آنسوؤں کے سوتے ابلنے لگے ۔دونوں ہاتھ اس کی طرف جوڑتے ہوئے وہ انتہائی بے بسی اور لاچاری سے بولی۔

''میں جانتی ہوں کہ آپ خوددار ہیں ۔لیکن آپ کو دوسروں کی خودی مجروح کرنے کا کوئی حق نہیں ۔مَیں آپ کو خدائے عظیم کا واسطہ دیتی ہوں کہ آپ مجھے قابل رحم تصور نہ کریں۔ مجھے زہر دے کر مار ڈالیں لیکن میرا علاج کر کے مجھے نئی زندگی نہ بخشیں۔ مجھے ایسی صحت نہیں چاہیے......نہیں چاہیے۔''

وہ چلا رہی تھی ۔چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

اور منیب نگاہوں میں حیرانی کی اتھاہ گہرائیاں لیے اُسے دیکھ رہے تھے ۔سمجھ نہیں رہے تھے کہ سب کیا چکر ہے؟ درجہ حرارت بھی نارمل تھا ۔سوچ رہے تھے کہ کن چکروں میں گرفتار ہے۔ کِس نے اس کی خودی کو مجروح کیا ہے ۔ یہ کیا کہہ رہی ہے؟ مجھے صحت نہیں چاہیے'' وہ تیزی سے

پلکیں جھپک رہے تھے۔

اور شیبہ ابھی تک دونوں ہاتھ ان کی طرف جوڑے وہی الفاظ دہرا رہی تھی۔

بڑی ہی شفقت سے انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے اور بولے۔

''یہ معمہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔میں نے کبھی کسی کی خودی کو مجروح کرنے کی کوشش نہیں کی اور یہ بھی تو سوچنے والی بات ہے کہ آخر میں بھلا ایسا کیوں چاہوں گا؟''

ان کی نگاہوں میں ابھرتی حد درجہ حیرانی اور معصومانہ انداز نے شیبہ کے تن بدن میں آگ لگا دی۔دونوں ہاتھ ان کے ہاتھوں سے چھڑاتے ہوئے وہ چلائی۔

''آپ غلط کہتے ہیں آپ کے قول و فعل میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔آپ حقیقتاً وہ نہیں جو نظر آتے ہیں۔آپ دوسروں پر رحم کھا کر تماشہ دیکھتے ہیں اور پھر اس سے محظوظ ہوتے ہیں۔''آنکھوں سے آنسو بند ہو گئے تھے اب وہاں غصے سے شعلوں کی لپیٹیں نکل رہی تھیں۔جانے کہاں سے اتنا پہاڑ جیسا حوصلہ اس میں آ گیا تھا۔

''مس شیبہ آپ یقیناً کسی شدید غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی ہیں۔یقین کیجئے میرے کردار و شخصیت پر کوئی پردہ نہیں۔میرا ظاہر و باطن آئینے کی طرح شفاف ہے۔دوسروں پر رحم کھا کر تماشہ دیکھنا یہ سب باتیں آپ کے دماغ کی اختراع معلوم ہوتی ہیں۔آپ کسی بات پر روشنی ڈالیے۔کوئی مثال دیجئے جس سے حقیقت آشکار ہو۔''

''ایک مثال،ایک واقعہ ہو تو انسان کہے بھی۔میرا تو ذہنی سکون آپ نے برباد کر دیا ہے۔''اور پھر جو وہ شروع ہوئی تو رکنے کا نام تک نہ تھا۔غصے نے اسے پاگل بنا دیا تھا۔اتنی مدت کا دبا ہوا لاوا پھنکاریں مارتا گرم گرم ذرے اڑاتا ہوا باہر نکل رہا تھا۔وہ چیخ رہی تھی۔''مجھے آپ سے نفرت ہے،نفرت ہے،آپ انسان نہیں''۔

اور منیب کو تو کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے جلتی جلتی سلاخیں اُس کے بدن سے لگائی جا

رہی ہوں۔وہ ایک پیاری سی لڑکی کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کب تھے؟ ہتھوڑے تھے جو شدید ضربیں لگا کر اس کے دماغ کو پاش پاش کر رہے تھے۔

لیکن ضبط کمال کو پہنچا ہوا تھا۔نہایت متانت سے کھڑے ہوتے ہوئے بڑی گھمبیر آواز میں بولے۔

''مجھ سے نفرت کرنے کا آپ پورا حق رکھتی ہیں۔لیکن جن غلط فہمیوں نے آپ کے دماغ میں گھر کر لیا ہے۔وہ قطعی بے بنیاد ہیں۔میرا ارادہ اگلے روز آپ کے گھر آنے کا تھا۔لیکن یکدم مجھے اپنے گہرے دوست کی علالت کے سلسلے میں ڈھاکہ جانا پڑا۔پندرہ دن بعد جب میں واپس لوٹا تو مجھے آپ کو فون کرنا عجیب سا محسوس ہوا کتنے ہی دن میں تذبذب میں ڈوبا رہا۔

اور پھر اس دن سلطان احمد کے ہاں شادی میں جاتے ہوئے جب آپ سے دوبارہ ملاقات ہوئی تو میں نے معذرت کرتے ہوئے ساری بات آپ کے گوش گذار کی۔اب اگر آپ کے کانوں نے نہ سنا ہو تو اس میں میری کیا خطا ہے؟

مَیں اور آپ کی بے بسی کا تماشا دیکھوں یہ سب فضول باتیں ہیں۔شیبہ! آپ میرے دل کی دنیا میں بہت اونچا مقام حاصل کر چکی ہیں۔میں نے آپ کو قلب کی گہرائیوں سے پسند کیا ہے۔لیکن آپ مطمئن رہیے۔اس پسندیدگی کا گلہ گھونٹ دیا جائے گا۔اسے اس کی بن آئی موت سلا دیا جائیگا۔اس لیے کہ محبت کی بھیک آپ سے کبھی نہیں مانگوں گا۔مجھے اس سے شدید نفرت ہے۔''

ان کے لہجے میں درد تھا۔تڑپ تھی۔دل کو جلا دینے والا ''سوز'' تھا۔

وہ واپس جا رہے تھے۔اسی وقار اور خود اعتمادی سے جو ان کی شخصیت کا خاص حصہ تھا اور وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں جاتا دیکھ رہی تھی۔''یہ سب کیا ہے؟'' وہ چلائی۔ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ہاتھ پاؤں میں شدید سنسناہٹ محسوس ہو رہی تھی۔یوں جیسے جان کنی کا عالم ہو۔

سارا جسم لرزے کی زد میں تھا۔

''میں نے آپ کو قلب کی گہرائیوں سے پسند کیا ہے۔لیکن محبت کی بھیک مانگنا مجھے گوارانہیں۔''

''میرے خدا میں پاگل ہو جاؤں گی، پاگل ہو جاؤں گی۔''اس نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

چہرہ کاغذ کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ہونٹ خشک ہو گئے تھے۔لمبے لمبے سانس بھر رہی تھی۔شاید وہ یونہی پاگلوں کی طرح بیٹھی رہتی۔اچانک سسٹر کمرے میں آئی۔اسے یوں دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔فوراًاس کے قریب آئی۔پوچھا لیکن وہ اپنے حواسوں میں ہوتی تو بتاتی ٹکر ٹکر اسے دیکھتی رہی۔

سسٹر نے فوراًلیڈی ڈاکٹر کو اطلاع دی۔ڈاکٹر نے بھی آکر پوچھا۔دونوں کو حیرانی تھی کہ یکدم کیا ہوگیا؟ کمرے کا ہیٹر آن کیا گیا۔لیڈی ڈاکٹر نے اسے لٹایا کمبل اس کے چاروں طرف ٹھیک کیا گیا۔

یکدم وہ چلانے لگی۔

مجھے چھوڑ دو، چھوڑ دو۔میرا دماغ پھٹ رہا ہے،میری آنکھیں جل رہی ہیں۔''ڈاکٹر نے کچھ سوچ کر اسے انجکشن لگا دیا۔تھوڑی دیر بعد وہ سو گئی۔

وہ دروازے کا پٹ دھیرے سے چھوڑتے ہوئے باہر آگئے۔سورج کی چمکیلی دھوپ اب بھی ویسے ہی چمک رہی تھی۔ہسپتال کے لان میں مخملی گھاس آنکھوں کو طراوت اور تازگی کا خوش گوار احساس بخش رہی تھی۔گہرا سرخ لباس پہنے گلاب کے پھول ادائے ناز سے ٹہنیوں پر جھول رہے تھے۔جیپیں اور کاریں کھڑی تھیں۔لوگوں کی آمدورفت کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری تھا۔

لیکن منیب کی نگاہوں میں تو دنیا بدل گئی تھی۔اس کے لیے ہر چیز اپنا حُسن اور رعنائی کھو بیٹھی تھی۔یوں جیسے کسی باغ میں بہارا ٹھکیلیاں کرتی پھر رہی ہو کہ اچانک بادِسموم چلنے لگ پڑے۔

دماغ میں کہرام مچا ہوا تھا۔دل زخمی ہو کر تڑپ رہا تھا۔باوقار چہرے کھنڈروں جیسی

ویرانی کی زد میں تھا۔

وہ اپنے کمرے کی طرف تھکی تھکی چال چلتے ہوئے بڑھ رہے تھے۔مریض ان کے انتظار میں تھے۔کرسی پر بیٹھ کر سر کو ہتھیلی پر ٹکاتے ہوئے انہوں نے بڑے ہی دکھ سے سوچا۔

''اب مجھ سے مریضوں کو کبھی نہیں دیکھا جائے گا۔ایسا نہ ہو کہ ذہنی پریشانی میں انہیں غلط سلط دوائیں لکھ دوں۔''

ڈاکٹر حامد کو مریض دیکھنے کی ہدایت دیتے ہوئے وہ گھر کی طرف چل دیئے۔اپنے کمرے میں پہنچ کر یوں محسوس ہوا جیسے کمرے کی ہر چیز ان کے دل کی طرح نوحہ خوانی میں مصروف ہو۔

''مجھے آپ سے نفرت ہے،نفرت ہے۔آپ انسان نہیں۔''ذہن چیخ اٹھا۔انسانوں کے دیئے گئے زخم کبھی اتنے گہرے بھی ہو سکتے ہیں۔اس کا تو انہیں اندازہ ہی نہ تھا۔

یہ ضرب دل کی دُنیا پر کتنی شدید تھی؟اس کا اندازہ صرف منیب ہی کر سکتے تھے...... نچلے ہونٹ کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے انہوں نے بے پناہ کرب سے سوچا۔

''تو کیا میں اب تک ریت کے گھروندوں پر سپنوں کے محل تعمیر کرتا رہا ہوں۔وہ محل جو کسی کی ایک ہی ضرب سے یوں ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں کہ مجھے اپنی تمناؤں اور خواہشات کا نام ونشان تک بھی نہیں ملتا۔آہ میں سراب کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔''

چہرے پر زمانے بھر کا درد پھیلا ہوا تھا۔آنکھیں بند تھیں۔

''زندگی آج کل مجھے کتنی حسین معلوم ہو رہی تھی۔یوں محسوس ہوتا تھا جیسے خوشیوں نے میرے چاروں طرف ایک جال سا بن دیا ہو۔جس میں سے اب کوئی غم گذر کر مجھ تک نہیں پہنچ سکتا۔جیون کی راہ کتنی طویل اور کٹھن ہے خوشگوار محسوسات کے بغیر لمحات کتنے بوجھل ہو جاتے ہیں۔وقت کاٹنا دوبھر ہو جاتا ہے۔میرے شب و روز کتنے حسین ہو گئے تھے۔جب ان خاردار راہوں پر میں شیبہ سے ملا۔اس کی قربت کے لطیف احساس سے میرے دل میں جلترنگ سا بج اٹھتا

تھا۔اس کا خیال مجھے اس روشنی کی طرح محسوس ہوتا جو تاریک رات کے راہی کے لیے منزل کی پیامبر ہو۔

آہ منزل بھی اندھیروں میں گم ہو گئی اور روشنی بھی۔''اب غم و آلام کے گھٹا ٹوپ اندھیرے سرعت سے میری طرف بڑھ رہے ہیں۔

اُسے مجھ سے نفرت ہے۔میرے قول و فعل میں اُسے زمین و آسمان کا بعد نظر آتا ہے۔

وہ اب قدرے ٹھیک ہے۔دو تین دن بعد ہسپتال سے ڈسچارج ہو جائے گی اور پھر میری شکل نہ دیکھے گی۔

باب نمبر: 34

دو بجے کے قریب شیبہ کی آنکھ کھلی۔ تو اس نے عطیہ کو کسی رسالے کے مطالعہ میں غرق پایا۔ اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر یکدم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ذہن میں ایک بار پھر وہی خیالات رینگ گئے۔ انکھیں پوری طرح پھیل گئی تھیں۔ عطیہ فوراً اس کی طرف لپکی۔ خاموشی سے سیب کے جوس کا گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔ بغیر سانس لیے وہ سارا جوس پی گئی۔ کتنی ہی دیر تک ویسے ہی بیٹھی رہی۔ دماغ میں خیالات کا اتار چڑھاؤ جاری رہا۔ عطیہ اس سے کچھ پوچھ رہی تھی۔ لیکن وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

کافی دیر بعد شیبہ نے اس کی طرف دیکھا۔

''شکر ہے مراقبے سے نکل آئی ہو'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

عطیہ یہ جاننے کے لیے بڑی ہی بے چین تھی کہ آیا اس کا سامنا منیب سے ہو گیا ہے یا نہیں۔ براہِ راست وہ پوچھنا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ اس کے بپھرنے کا اندیشہ تھا۔ شیبہ کی وحشت قدرے کم ہوئی تو آہستہ آہستہ اس نے اپنے اور منیب کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ عطیہ کو سُنا دیا۔

''چلو اچھا ہوا اس بم نے ایک دن تو پھٹنا ہی تھا'' عطیہ نے بڑے دُکھ سے کہا۔

''مجھے تو منیب کا خیال تڑپا رہا ہے۔ شیبہ تم خدا کی ناشکری ہو۔ اتنے اچھے انسان کو کھو کر

تم پچھتاؤ گی ۔لیکن تب وقت تمہارے ہاتھوں سے نکل چکا ہوگا''۔

''تو اب بتاؤ نا میں کیا کروں؟''اس نے ہتھیار ڈالتے ہوئے عطیہ سے کہا''۔

''تمہیں اپنی زیادتیوں کی اس سے معافی مانگنی چاہیے۔''

''معافی مانگوں؟''اس کے لہجے میں تذبذب تھا۔''

''تمہیں ذرا احساس نہیں کہ تم نے کس بری طرح اس کے جذبات مجروح کیے ہیں۔ اب بھی تم تذبذب میں ہو۔کاش تمہاری آنکھیں کھلی ہوتیں۔تو تمہیں پتہ چلتا کہ اس نے کسی جانفشانی سے تمہاری تیمارداری کی ہے۔خدا کے لیے شیبہ ابھی بھی ہوش میں آ جاؤ۔''

عطیہ کچھ دیر خاموش رہی اور پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''سب لوگ آج منوڑا جا رہے ہیں۔میرا ارادہ بھی جانے کا تھا اگر تم کہو تو میں چلی جاؤں''۔

''ضرور جاؤ عطی! اچھ تم نے میرے لیے اپنی ساری تفریح غارت کر دی ہے۔اس سے تو یہی بہتر تھا کہ میں آتی ہی نہ۔'' ....وہ آزردگی سے بولی۔

''ہوں یہاں نہ آتی 'شیبہ سویٹ! تو وردی والے سے جنگ کون کرتا؟''عطیہ نے ہنس کر کہا۔

ڈھائی بجے وہ سوچوں میں ڈوبی تو چھ بجے خیالات کے سمندر سے باہر نکلی۔ایک ایک پہلو تفصیلی انداز میں اس کے سامنے آیا۔غلط فہمیوں کے پیرہن تار تار ہو گئے تھے۔ذہن آئینے کی طرح شفاف تھا۔لبوں پر بڑی ہی شیریں مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

''میں ان سے ضرور معافی مانگوں گی۔ہوش میں آجانے کے بعد مزید بے ہوشی میرے لیے مضر ثابت ہوگی۔''

رات ہو گئی تھی۔خیال تھا کہ وہ راؤنڈ پر آئیں گے۔لیکن دس بج گئے۔انتظار دم توڑتا نظر آ رہا تھا۔سسٹر کمرے میں آئی تو اس نے منیب کے متعلق پوچھا۔

''وہ تو راؤنڈ ختم کر کے کبھی کے گھر بھی جا چکے ہیں۔'' مسٹر کا جواب تھا۔

''ٹھیک تو ہے۔معمولی شبہات نے میرا دماغ کس قدر خراب کر دیا تھا؟ اب تو خیر اتنی بڑی بات ہو گئی''۔

''یہاں کوئی سادہ لفافہ نہ مل سکے گا؟'' اس نے سسٹر سے پوچھا۔

''میں ابھی بھجواتی ہوں''۔سسٹر نے اسے دوائی دیتے ہوئے کہا۔

''لفافہ کاغذ اور قلم سبھی چیزیں اس کے سامنے تھیں۔لیکن وہ سوچ رہی تھی کیا لکھے؟

'' کافی دیر بعد اس کا قلم کاغذ پر پھسلنے لگا۔کاغذ کو لفافے میں بند کرتے ہوئے اس نے ہسپتال کی آیا سے خط منیب کو پہنچا آنے کو کہا۔آیا چلی گئی۔

وہ تصور کی آنکھ سے انہیں لفافہ پکڑتے،پھاڑتے اور پڑھتے دیکھ رہی تھی۔لیکن چہرے کا ردِعمل اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔کیا وہ خوش ہوں گے یا؟ ......

لیکن ذہن نے ''نہیں'' کی حالت کا تصور کھینچنے سے انکار کر دیا۔

منیب عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر چائے پینے ہی لگے تھے کہ ان کا نوکر لفافہ لیے اندر آیا کھولا تو شستہ انگریزی میں لکھا تھا۔''

''میں اپنی غلط فہمیوں پر شرمندہ اور اپنی زیادتیوں کے لیے معافی کی خواستگار ہوں۔''

''شیبہ''

افسردہ سی ہنسی ان کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔سر کو جھٹکا دیتے ہوئے خود سے بولے۔

''میں بھی کوئی مٹی کا کھلونا ہوں جسے جب چاہا توڑ دیا اور جب چاہا دوبارہ بنا لیا۔دل کے آبگینے بڑے حساس ہوتے ہیں۔بڑے ہی نازک ہوتے ہیں۔ایک بار ٹوٹ جائیں تو مشکل ہی سے جڑتے ہیں۔''

اگلا سارا دن وہ ان کا انتظار کرتی رہی۔ذرا پردہ ہلتا تو اُسے گمان ہوتا جیسے منیب ہوں لیکن ہر بار اس کی آس ٹوٹ جاتی۔اب تو تین بج رہے تھے۔لیڈی ڈاکٹر سے اسے معلوم ہو چکا

تھا کہ کل شام اُسے ڈسچارج کر دیا جائے گا۔ یہ خبر اس کے لیے بڑی پریشان کن تھی۔

وہ بڑی بے چین تھی۔ گھبرا اضطراب چہرے سے جھلک رہا تھا۔ ایک تو بیماری کی حد درجہ نقاہت دوسرے یہ سوچ حاوی تھی کہ کل اسے ہسپتال سے چلے جانا ہے۔

''میرے ذہن سے تو غلط فہمیوں کے غبار دُھل گئے ہیں۔ لیکن وہ ذہن جو میرے ستم سے مجروح ہو گیا ہے۔ میرے ظلم کا نشانہ بن گیا ہے۔ اس کا کیا بنے گا؟''

غلط فہمیاں بڑھنے کی رفتار جتنی تیز تھی۔ ندامت کی شدت اس سے کئی گنا بڑھ گئی تھی۔

اب سوال یہ تھا۔ کہ وہ اپنے طرزِ سلوک کی معافی کیسے مانگے؟ کیونکہ یہ حقیقت اس پر عیاں ہو چکی تھی کہ وہ اب کبھی نہیں آئیں گے اور اب اُسے ہی جھکنا ہو گا اور وہ جھکنے کے لیے تیار تھی۔

بڑے ہی عزم کے ساتھ اس نے قدم بڑھائے اور باہر نکل گئی۔ کسی سے منیب کی کوٹھی کا پتہ پوچھا اور بلا خوف و خطر بتائی ہوئی سمت چل دی۔ کوٹھی ہسپتال کے قریب ہی تھی۔ نقاہت کے باوجود بھی جانے کون ساجذبہ تھا؟ جس کے تحت وہ کشاں کشاں منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ کوٹھی میں اسے کوئی بھی تو دکھائی نہ دیا۔ قدرے پریشان سی ہو کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ داہنے کمروں کی طرف بڑھی جہاں روشنی شیشوں سے چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ قریب جا کر اس نے شیشے میں سے جھانک کر دیکھا۔

''منیب آرام کرسی پر نیم دراز کسی کتاب پر جُھکے ہوئے تھے۔ گھنے بال پیشانی پر پڑے تھے۔ ان پر نظر پڑتے ہی اس کے سارے جسم میں زبردست ارتعاش پیدا ہوا۔''

''اُف مَیں کیسے ان کا سامنا کر سکوں گی۔'' پی بے با کی پر حیران سی ہونے لگی۔

''واپس جاتی ہوں'' اس نے سوچا۔

''کون؟'' کرخت سی آواز پر چونک کر اس نے پیچھے دیکھا۔ اُدھیڑ عمر کے ایک شخص کی سُرخ سُرخ آنکھیں دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ جہاں تھی وہی جم گئی۔

''کیا کام؟ تم لوگ ادھر کیا کرتا ہے۔''اس کی تیز آواز نے اسے ہولا دیا تھا۔
چوکیدار کی آواز پر منیب پڑھتے پڑھتے چونک اٹھے۔ملازم بڑی اکھڑ طبیعت کا مالک تھا۔
''جانے کون ہے جسے ڈانٹ پلا رہا ہے؟''سوچتے ہوئے وہ تیزی سے باہر نکلے۔ہلکی ہلکی روشنی میں انہوں نے شیبہ کو مجرموں کی طرح بدحواس کھڑے دیکھا۔چند لمحوں تک وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔
اور پھر اپنی بے بسی اور ندامت، پشیمانی، یوں چوروں کیطرح جھانکنا اور نوکر کی ڈانٹ ڈپٹ ان سب تلخ باتوں کا خیال آتے ہی اس کی سسکیاں نکل گئیں۔
''تم جاؤ''منیب نوکر کو دیکھتے ہوئے بولے۔
''پاگل لڑکی''۔سوچتے ہوئے وہ آگے بڑھے اور انتہائی نرم اور مدھم لہجے میں اس سے پوچھا۔
''آپ اتنی ٹھنڈ میں یہاں کیسے آئی ہیں؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''
لیکن اس کی سسکیاں اور بھی تیز ہوگئیں۔باہر خاصی ٹھنڈ تھی۔گو وہ بیماری کی زد سے باہر تھی۔لیکن ابھی تک کمزوری کے اثرات رفع نہ ہو سکے تھے۔
دھیرے سے اپنے بازو اس کے شانوں پر رکھتے ہوئے منیب اسے کمرے میں لے آئے۔
اور اسے صوفے پر بٹھاتے ہوئے وہ خود بھی اس کے قریب بیٹھ گئے۔ابھی تک وہ ہاتھوں سے چہرہ چھپائے ہلکی ہلکی سسکیاں بھر رہی تھی۔اس کے ہاتھوں کو پکڑ کر نیچے کرتے ہوئے منیب دھیمی آواز میں بولے۔
''آپ مجھے کچھ بتائیں گی نہیں؟''
چند لمحوں تک وہ خاموش رہی اور پھر کسی کربناک خیال کے تحت سسکیاں لیتے ہوئے وہ

بولی۔ ''کل شام مَیں نے یہاں سے چلے جانا ہے۔غلط فہمی کی بناء پر جو تلخ اور ناگوار باتیں میری زبان سے آپ کے لیے نکل گئی ہیں۔میں ان پر سخت شرمندہ ہوں اور معافی کی خواستگار ہوں۔

''میں آپ کی ممنوں ہوں کہ میرے لیے آپ نے اتنا کچھ کیا''۔

اس کا لہجہ اتنا دردناک تھا اور سسکیاں اتنی المناک کہ منیب کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔کیسی آن کیسی خودداری سب کچھ اس کے آنسوؤں میں بہہ گئی۔محبت کے گہرے احساس سے انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے شانوں پر رکھتے ہوئے بڑی گھمبیر آواز میں کہا۔

''مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔میں نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ آپ یا کسی اور پر احسان کے نقطہ نظر سے ہرگز نہیں کیا۔وہ میرا فرض تھا۔''

اس کے آنسو بند ہوگئے۔لیکن وہ ابھی تک ویسے ہی سر جھکائے بیٹھی تھی۔منیب صوفے سے اُٹھ کر سامنے کرسی پر بیٹھ گئے۔کتنی ہی دیر تک خاموشی طاری رہی۔اچانک منیب کی آنکھیں کسی احساس کے تحت چمکیں۔مسکراتے ہوئے انہوں نے شیبہ سے پوچھا۔

''آپ مجھے ایک بات بتائیں گی۔''

''کیا؟''اس نے نگاہیں اٹھائیں لیکن دوسرے ہی لمحے آنکھیں جُھک گئی تھیں۔

''منیب کی آنکھوں میں محبت کی چمک تھی۔''

''وہ اولین احساس کیا تھا۔جس نے آپ کے دماغ میں غلط فہمیاں پیدا کیں؟''

اس بات پر شیبہ بے اختیار مُسکرا اٹھی۔آنسوؤں سے نم آنکھیں اب شوخی سے چمک رہی تھیں۔گھنی پلکیں ابھی تک نم تھیں۔اس کا دلفریب وخوب صورت چہرہ معصومیت لیے بجلی کی روشنی میں چمک رہا تھا۔دوپٹہ شانوں پر پھیلا ہوا تھا۔بال کسی حد تک بکھرے ہوئے تھے اور کپڑے ملگجے سے تھے۔

''سچ سچ بتاؤں اس نے شوخی سے منیب کی طرف دیکھا۔

''بالکل''انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کتنی ہی دیر تک وہ اپنے ہاتھوں سے کھیلتی رہی۔ گردن جھکائے مسکراہٹ لبوں پر بکھیرے کچھ کہنے اور کچھ نہ کہنے کی حالت میں ڈوبی رہی اور منیب اس کے چہرے پر پھیلی کیفیات سے لطف اٹھاتے رہے۔

''آپ تو تذبذب کا شکار ہو رہی ہیں۔ جو بات ہے بلا تکلف کہہ ڈالیں۔'' لہجے میں پیار بھرا اصرار تھا۔

''آپ کی آنکھوں سے چھلکتا ہوا گہرے غرور کا احساس۔'' شیبہ نے دوپٹے کے پلو کو مسلتے ہوئے زیر لب مسکراہٹ سے کہا۔

''خوب؟'' ہلکا سا قہقہہ فضا میں پیدا ہوا۔

''تو گویا قصوروار میری آنکھیں ہیں۔ چلیے ہم مانے لیتے ہیں۔ اچھا اب مجھے یہ بتائیں کہ آپ نے کھانا کھالیا؟''

منیب نے گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں'' آپ کا تجویز کردہ پرہیزی کھانا تو میں کھا آئی ہوں۔ شیبہ نے تیزی سے کہا۔

منیب ہنس دیے۔

چائے تو پئیں گی نا؟'' انہوں نے نوکر کو آواز دی۔ نوکر آیا اکیلا نہیں چائے کی کشتی پکڑے ہوئے۔

''تیز ہوتے جارہے ہیں۔''

''ہلکی چائے بنا کر منیب نے شیبہ کو دی۔ چائے سے فارغ ہوتے ہی وہ اٹھ بیٹھی۔

منیب بھی کھڑے ہوگئے۔

''آپ نے مجھے معاف کردیا ہے نا؟'' شیبہ نے بھیگی بھیگی شبنمی انکھوں سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں'' انہوں نے سرنفی میں ہلا دیا۔ گہری نظریں ابھی تک اس کے چہرے پر تھیں۔ ہونٹ متبسم تھے۔دھیرے سے بولے۔

''جرم کی سنگینی قابلِ معافی نہیں''۔

گھبرا کر شیبہ نے ان کے چہرے پر نگاہ ڈالی اور جانے اسے وہاں کیا محسوس ہوا؟ فرحت وانبساط کے گہرے احساس سے اُس نے نگاہیں نیچی کرلیں۔

چلیے میں آپ کو چھوڑ آؤں۔ آپ دو منٹ ٹھہریں میں ابھی آیا۔''

وہ قریبی کمرے میں گئے اور ہاتھوں میں مردانہ کوٹ لیے قریب آ کر اس کے کندھوں پر ڈالتے ہوئے شفقت سے بولے۔

''ابھی چند دنوں تک اپنا خیال رکھیں۔ آپ کوئی بھاری کپڑا ابھی نہیں پہنے ہوئے ہیں۔ باہر خاصی ٹھنڈ ہے۔''

ہسپتال کے کمرے کے اندر جاتے ہوئے شیبہ نے ایک نظر پلٹ کر انہیں دیکھا اور اندر چلی گئی۔

باب نمبر: 35

توصیف کی کوٹھی کے ایک وسیع و کشادہ کمرے میں شیبا اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔آج سات دن بعد وہ ہسپتال سے لوٹی تھی۔کتنی دیر تک لڑکیوں سے باتیں کرتی رہی۔لیکن اب عطیہ نے اسے زبردستی لٹا دیا تھا۔نقاہت کے باوجود اس کی آنکھوں میں نیند کا نشان تک نہ تھا۔آنکھیں بند کر کے اس نے ندیا کو آواز دی۔لیکن نیند کہاں؟'' طائر خیال ہسپتال کے اس کمرے میں منڈلانے لگا جہاں غلط فہمیاں عروج پر پہنچ گئی تھیں۔زخموں کی تڑپ اور درد پر وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔جہاں زلزلے آئے تھے اور آتش فشاں پہاڑ پھٹے تھے۔لیکن یہ سب چیزیں اس کے لیے باعثِ رحمت ثابت ہوئیں۔غلط فہمیاں رفع ہوئیں۔اور زندگی نے ایک حسین و خوش گوار کروٹ بدلی۔

دوپہر کا واقعہ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی تمام تر دلفریبیوں کے ساتھ اُبھرا۔

نرسسٹر کوئی دس بجے کے قریب اسے انجکشن لگانے آئی تو اس نے بتایا کہ آج دو تین عجیب قسم کے کیس آ جانے کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب صبح سے مصروف ہیں۔

وہ مطمئن ہو گئی۔ورنہ وہ صبح سے حسین آنکھوں میں انتظار کی جوت جگائے نیلی وردی والے کی راہ تک رہی تھی۔خیر اب تو انتظار کا سوال ہی نہ تھا۔پتہ نہیں وہ کب فارغ ہوں یہی سوچتی ہوئی سو گئی۔ایک بجے کے قریب جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ عامر اور عمر کی فرمائش کردہ چیزوں کی

فہرست بنانے لگی۔ہلکی سی آہٹ پر نگاہیں بے اختیار اٹھ گئیں۔منیب چہرے پر دلفریب مسکراہٹ لیے متانت ووقار سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

دل زور سے دھڑک اٹھا۔رخساروں پر سُرخی کی دوڑ گئی۔کانوں کی لویں سرخ ہو گئیں۔ پلکوں نے آگے بڑھ کر حسین آنکھوں پر پردے گرا دیئے۔

کرسی کو آگے گھسیٹتے ہوئے منیب بیٹھ گئے۔وہ اس کے چہرے کی بدلتی ہوئی کیفیت دیکھ رہے تھے۔آہستہ سے بولے۔

آپ کی طبیعت کیسی ہے؟

''ٹھیک ہوں۔''اس نے بمشکل نگاہیں اٹھائیں۔منیب کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے سامنے کی دیوار پر قائداعظم کی تصویر کو بغور دیکھ رہے تھے۔دوسری طرف متوجہ پا کر شیبہ نے انہیں دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔نیلی وردی میں ان کی شخصیت بڑی نکھری ہوئی لگ رہی تھی۔چہرے پر گہرا وقار اور چمک تھی۔ایسی چمک جو شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آئی تھی۔ٹھہری ہوئی ہلکی ہلکی اداسی لیے ان کی آواز شیبہ کے کانوں میں پڑی۔

''ابھی ابھی مجھے ڈاکٹر رانا کا فون آیا تھا۔وہ پوچھ رہے تھے کہ شیبہ کو لینے کے لیے کب آئیں؟ میں نے انہیں چار بجے کا وقت دیا ہے۔''ٹھیک ہے نا''۔انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔''

وہ جانتی تھی کہ آج اُسے ہسپتال سے چلے جانا ہے۔لیکن پھر بھی نجانے کیوں ان کے منہ سے جانے کا سُن کر اس کا دل ڈوبنے لگا۔

''آپ نے کچھ بتایا نہیں۔مَیں نے ٹھیک وقت دیا ہے نا؟''انہوں نے دوبارہ پوچھا۔

اس نے نگاہیں اٹھائیں۔''اور''آپ بہتر سمجھ سکتے ہیں۔'' کہتے ہوئے سر جھکا لیا۔

ان نگاہوں میں کیا کچھ نہیں تھا۔شوخی کا احساس ختم ہو گیا تھا۔سنجیدگی اُداسی اور بے چینی کا جھلکتا ہوا امتزاج منیب سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔وہ خود بھی اداس سے تھے۔یہ دن تو پلک جھپکتے ہی بیت گئے تھے۔

اس کی بیماری کے دوران انہوں نے کتنی ہی بار سوچا اور شدت سے چاہا کہ اے کاش وہ یونہی بیمار رہے اور وہ ایسے ہی اس کی تیمارداری کرتے رہیں۔ یہ پیاری اور حسین لڑکی جس کا تصور ان کی خشک زندگی میں کسی دلآویز خوشبو سے کم نہ تھا۔ پرسوں چلی جائے گی۔ کتنی ہی دیر تک خاموشی طاری رہی۔ وہ انگلیوں کو یونہی مسلتی رہی تھی اُسے منیب کی آواز سنائی دی وہ کہہ رہے تھے۔

''میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

اس کے دل دھڑکن یکدم بے انتہا تیز ہو گئی۔ کون سی بات ہو گی؟ وہ پلکیں لرز اٹھیں۔ لیکن بڑی ہمت سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''کہیے''۔

''کل شام کا کھانا آپ میرے ساتھ کھائیں۔''

نگاہیں اٹھیں۔ ملیں اور جُھک گئیں۔ شیبہ کو اُن کی آنکھوں میں شوق و آرزو کا ایک جہاں نظر آ رہا تھا۔ سوچ میں پڑ گئی۔ فکر و اضطراب چہرے سے عیاں تھا۔

''لیکن میں ڈاکٹر رانا سے کیا کہوں گی؟'' اس نے پریشان ہو کر ان کی طرف دیکھا۔

''وہی جو میں نے آپ سے کہا ہے۔'' منیب شوخی سے مسکرا دیئے۔

وہ بھی مسکرا دی اور کسی قدر طنزیہ انداز میں بولی۔

''جی ہاں یہ تو مجھ سے ضرور کہا جائے گا۔''

''جو آپ کا دل چاہے، کہیں۔ لیکن میں آپ کا انتظار کروں گا۔ ہاں مجھے یاد آیا ڈاکٹر صاحب آئیں تو شاید میں ان سے مل نہ سکوں۔ میری طرف سے معذرت کر دیں۔ اچھا خدا حافظ''۔ وہ کیپ اٹھاتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

پلکوں کو تیزی سے جنبش ہوئی۔ بے چینی سے اس نے انہیں کھڑے ہوتے دیکھا۔ نگاہیں ٹکرائیں اور پیار کا گہرا احساس اُسے دے گئیں۔ منیب جا چکے تھے۔ وہ سرشاری ہو کر بستر پر دراز ہو گئی۔

''اللہ میں اب ڈاکٹر رانا سے اجازت کیسے لوں گی؟ خیر عطیہ سے بات کروں گی ۔وہ کوئی نہ کوئی ترکیب نکال ہی لے گی۔'' سوچتے سوچتے تھوڑی بعد دیر بعد ہی وہ گہری نیند کی آغوش میں تھی ۔

اگلے دن کوئی بارہ بجے کے قریب اس نے عطیہ کو ساری بات بتائی ۔عطیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی وراس کی نقل اتارتے ہوئے بولی ۔

''مجھے اس سے نفرت ہے، میں اس کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتی ۔نفرت ہے نفرت ہے۔''

اور پھر اسکی تھوڑی پکڑ کراس کا چہرہ اوپر کرتے ہوئے آنکھیں نچا کر بولی ۔

''اب کہو کبھی تو شکل اور ذکر تک سننے سے بیزار تھیں اور اب یہ حال کہ ملنے کو تڑپ رہی ہو۔''

''چل دفعان ہو۔میں نہیں جاتی ۔خود ہی تو معافی مانگنے کا مشورہ دیا تھا۔'' شیبہ کا انداز بڑا ہی تیکھا تھا۔

میں نے معافی مانگنے کو ضرور کہا تھا کورٹ شپ کیلئے نہیں۔'' عطیہ نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''شرم تو نہیں آتی ۔ذرا سوچو تو کیا کہہ رہی ہو؟ میں کورٹ شپ کر رہی ہوں۔'' شیبہ غصے سے بولی ۔

''بس بس اب موڈ خراب نہیں ہونا چاہیے۔'' عطیہ نے اسکے گلے میں بانہیں ڈال دیں ۔کچھ دیر وہ ناراضگی کا اظہار کرتی رہی ۔بالآخر عطیہ نے اسے منا لیا۔

''سنو ایک ترکیب میری سمجھ میں آتی ہے۔ڈاکٹر رانا سے کہو کہ ہسپتال کی لیڈی ڈاکٹر نے مجھے اور عطیہ کو کھانے پر مدعو کیا ہے۔لیکن نغمہ کو اس سازش میں شریک کرنا پڑے گا۔تمہیں وہاں اتار کر ہم دونوں پکچر کے لیے چلے جائیں گے ۔ٹھیک دس بجے موڑ پر ہم تمہارا انتظار کریں گے ۔بولو

تجویز تو ٹھیک ہے نا؟"

"بات تو معقول ہے لیکن دیر سویر انسان کے ساتھ ہے۔اگر ڈاکٹر رانا یا کسی اور نے تمہیں کھڑے دیکھ لیا تو پھر کیا ہوگا؟''......اس نے پریشان ہو کر کہا۔

بڑی ہی بز دل ہو سنو اب تم پیار کی خاردار وادی میں قدم رکھ چکی ہو۔ذرا بہادر بنو ڈاکٹر کٹھن مراحل آئیں گے۔یوں ہی ڈرتی رہیں تو سمجھ لو چکیں عشق۔عطیہ سنجیدگی سے منہ بناتے ہوئے بولی۔

"مجھے تمہاری ان اُول جلُول باتوں سے بڑی وحشت ہوتی ہے۔بکواس کرنے لگتی ہو۔ ایک دم شیبہ غصے سے بولی۔

شام کے پانچ بجے جب شیبہ باتھ روم سے لباس تبدیل کر کے نکلی تو عطیہ نے اسے دیکھ کر ہونٹوں میں انگلی داب لی۔لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اس کی آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں۔سیاہ رنگ کے چمکدار سائن کے چست پاجامے گہرے عنابی رنگ کی قمیض ہم رنگ جرسی اور سیاہ شفعون کے کھلے دوپٹے میں اس کا ملیح حسن چمک رہا تھا۔چہرے پر بیماری کی ہلکی ہلکی زردی تھی۔

"کیوں غضب ڈھارہی ہو۔اس غریب پر کچھ تو خدا کا خوف کرو۔کیوں قتل کے سامان کر لیے ہیں۔"

"سارے جہاں کا درد کیا تمہارے جگر میں ہے؟ اپنی خیر مناؤ۔اسے میں سنبھال لوں گی۔"شیبہ نے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے کہا۔

"ہائے صدقے دو دن میں ہی پر نکل آئے۔شیبہ دل تو میرا بھی چاہتا ہے۔تمہارے ساتھ چلوں اور ذرا تماشا دیکھوں۔"

"ضرور چلو لیکن خیال رہے کہ تماشا دیکھنے میں نہیں آئے گا۔"

باب نمبر: 36

جب وہ منیب کی کوٹھی کے سامنے اتری شام گہری ہو رہی تھی ۔ اندھیرے بچے کھچے اجالوں کو نگلنے میں تیزی سے مصروف تھے ۔ گیٹ کے ساتھ اسے نیم پلیٹ نظر آئی ۔ قریب پہنچ کر پڑھا..... لکھا تھا ۔

''سکوڈرن لیڈر ڈاکٹر منیب فرخ ۔''

کوٹھی کے اندر نگاہ دوڑائی ۔ اس کا دل شدت سے دھڑک اٹھا ۔ چند لمحوں تک وہیں کھڑی کشمکش میں ڈوبی رہی اور پھر دھڑکتے دل اور لرزتے قدموں سے آگے بڑھتی ہوئی برآمدے میں پہنچ گئی ۔ لیکن کل کی طرح آج بھی اسے کوئی دکھائی نہ دیا ۔ داہنے کمروں کی طرف مڑی ۔ کل والے کمرے کے نزدیک پہنچ کر ذرا سا پردہ ہٹا کر اندر جھانکا ۔ منیب نماز پڑھ رہے تھے ۔ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے وہ کمرے میں داخل ہو گئی ۔ اندر داخل ہوتے ہی اُسے یوں لگا جیسے اپنے ہی گھر میں ہو ۔ ساری جھجک ڈر اور خوف یکسر دور ہو گیا تھا ...... سکون سے صوفے پر بیٹھ کر وہ کمرے کا جائزہ لینے لگی ۔ یہ کمرہ منیب کی خوابگاہ تھا ۔

منیب کو نماز پڑھتے دیکھ کر وہ سوچنے لگی ۔ عطیہ وقعی ٹھیک کہتی تھی ۔ مجھے اس انسان سے کتنی نفرت تھی ۔ شکل تک دیکھنا گوارا نہ تھی ۔ لیکن آج ......'' اس نے صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں ایک سرور آگیں احساس سے بند کر لیں ۔ مسکراہٹ لبوں پر ناچ رہی تھی ۔ نماز سے فارغ

ہو کر منیب نے پلٹ کر دیکھا ۔وہ اُسے تو مبہوت سے ہو کر رہ گئے ۔یوں لگ رہا تھا ۔جیسے چاند دیس کی شہزادی اچانک راستہ بھول کر ان کے کمرے میں آ گئی ہو ۔کتنی دلفریب مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر تھی وہ اُسے محجوب نہیں دیکھنا چاہتے تھے ۔رخ پلٹتے ہوئے ایسی آواز پیدا کی جیسے ابھی فارغ ہو کر اٹھے ہوں ۔شیبہ چونک گئی ۔نشست درست کی ۔رُخ پلٹ کر وہ مسکرائے اور قریب آتے ہوئے بولے ۔

''میں برآمدے میں کتنی دیر تک آپ کا انتظار کرتا رہا ۔نماز کا وقت تنگ ہوتے دیکھ کر اندر چلا آیا ۔آپ کو آئے کتنی دیر ہوئی ۔''؟

''بس یہی کوئی دس منٹ' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ۔

''آپ یہاں تک کیسے آئیں؟'' انہوں نے بیٹھتے ہوئے پوچھا ۔

''شیبہ ان کا مطلب سمجھ گئی تھی ۔اپنے اوپر معصومیت طاری کرتے ہوئے بولی ۔

''آپ نے ہی تو کھانے پر مدعو کیا تھا ۔'' آنکھوں میں شوخی تھی ۔

''منیب بے اختیار ہنس پڑے .....فوراً جوابی حملہ کرتے ہوئے بولے ۔

''کب؟ مجھے تو بالکل یاد نہیں ۔''

دونوں کا ملا جلا قہقہہ فضا میں بکھر گیا ۔

''مجھے یہاں عطیہ چھوڑ کر گئی ہے ۔''

''لیکن آپ انہیں ساتھ کیوں نہیں لائیں؟'' منیب نے حیرانی سے پوچھا ۔

وہ لوگ پکچر دیکھنے چلی گئی ہیں ۔اس نے تفصیل بتائی ۔

''اچھا اب یہ بتایئے کہ ڈاکٹر صاحب سے کیا بہانہ کیا؟ وہ گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے ۔

''اپنی بہانہ سازی کا خیال آتے ہی شیبہ مسکرا دی ۔شوخ آنکھوں میں خوشی کے دیپ سے جل اٹھے ۔بڑھتی ہوئی ہنسی کو روکنے کے لیے اپنے دائیں ہاتھ کی پشت ہونٹوں پر رکھ لی ۔

منیب کی طرف دیکھا۔ وہ نگاہوں میں محبت لیےاس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ نگاہیں دوسرے ہی لمحے جھک گئیں۔ایک لفظ بھی تو نہ بولا جا سکا۔

''آپ مجھ سے کچھ چھپانا چاہتی ہیں؟''انہوں نے پیار بھرے لہجے میں دوبارہ پوچھا۔

''نہیں تو۔''اس نے انتہائی معصومیت سے سرنفی میں ہلا دیا۔

''ہم نے کہا تھا کہ ہسپتال کی لیڈی ڈاکٹر نے ہمیں کھانے کی دعوت دی ہے۔''اس نے شرمیلی مسکراہٹ سے حقیقت بتائی۔

چلئے کچھ زیادہ جھوٹ نہیں بولا۔بس ذرا لیڈی کا لفظ فالتو ہے۔''

کچھ دیر خاموشی رہی۔شیبہ نے منیب کو دیکھا وہ نظریں جھکائے کچھ سوچ رہے تھے۔یہ خاموشی اسے ناگوار سی محسوس ہونے لگی۔گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے بولی۔

''اتنی بڑی کوٹھی میں آپ تنہا رہتے ہیں بور نہیں ہوتے۔روشن خالہ کو اپنے پاس کیوں نہیں بلا لیتے؟''

انہوں نے نگاہیں اٹھا کر شیبہ کو دیکھا اور پھر آہستگی سے بولے۔دراصل اُنہیں اُس جگہ سے بڑی محبت ہوگئی ہے۔میرے پاس آ کر تو اداس ہو جاتی ہیں۔ویسے میں عام طور پر میس میں ہی رہتا ہوں۔

یہاں آ کر کوٹھی میں رہائش شروع کی ہے۔وقت کا زیادہ حصہ مریضوں کے درمیان گذرتا ہے۔لیکن پھر بھی تنہائی کبھی کبھی محسوس ہوتی ہی ہے۔وہ انتہائی گھمبیر سی سنجیدگی میں شیبہ کو بتا رہے تھے۔

''آپ کا یہ ایم۔ایس۔سی کا آخری سال ہے نا۔''انہوں نے پوچھا۔

''جی ہاں''اس نے جواب دیا۔

''اس کے بعد آپ کا کیا ارادہ ہے؟''

ابھی تک تو سوچا نہیں۔شاید پی ایچ ڈی کے لیے چلی جاؤں۔ویسے شاید پاپا مانیں بھی

نہ کیوں کہ پچھلے دنوں چیکوسلواکیہ "چارلس یونیورسٹی" کی ایک سالہ ٹریننگ کے لیے پوچھا گیا تھا۔ ڈاکٹر صدیقی مجھے بڑا مجبور کر رہے تھے۔ میں نے پاپا سے بات کی تو انہوں نے بس ٹال مٹول ہی سے کام لیا۔" وہ بڑی معصومیت سے لمبی لمبی پلکیں جھپکاتی انہیں تفصیل بتا رہی تھی۔

مجھے جب پہلی بار آپ کے متعلق پتہ چلا کہ آپ کیمسٹری میں ایم ایس سی کر رہی ہیں تو یقین کیجئے مجھے اتنی زیادہ حیرانی ہوئی تھی کہ شاید آپ اندازہ نہ لگا سکیں۔ میری دانست میں یا تو ماما کو سمجھنے میں غلطی ہوئی تھی یا پھر ان کی سماعت نے ٹھیک کام نہ کیا تھا۔ کیونکہ جس لڑکی کے متعلق وہ مجھے بتا رہی تھیں اسے میں تو محض سینئر کیمرج کی سٹوڈنٹ تصور کر رہا تھا۔"

مسکراتے ہوئے منیب نے اسے بتایا۔

اس کا چہرہ تازگی لیے چمک اٹھا۔ آنکھوں میں شوق و تجسس کی دنیا لیے وہ ان کی باتیں سن رہی تھی۔ ان کے خاموش ہونے پر بولی۔ "میرا خیال ہے اب تو آپ کو یقین آ چکا ہوگا؟"

"یقیناً اب شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں ہے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔

"آپ کا ایک بھائی شاید رسالپور فلائنگ ٹریننگ کالج میں زیر تربیت کیڈٹ ہے۔" انہوں نے پوچھا۔"

"جی ہاں! وہ مجھ سے چھوٹا ہے۔ دراصل پاپا تو اسے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے لیکن اسے میڈیکل سے کوئی دلچسپی نہ تھی بچپن ہی سے ہوا بازی کا شوق تھا۔ بس ایف ایس سی کرنے کے بعد چلا گیا۔

"نہیں، یہ لائن بھی اچھی ہے۔"

"آپ کو بھوک تو نہیں محسوس ہو رہی؟" انہوں نے پوچھا۔

"کچھ اتنی زیادہ نہیں" شیبہ نے سادگی سے کہا۔

"یعنی تھوڑی تھوڑی محسوس ہو رہی ہے۔"

''ہاں حقیقت سے انکار کیوں کروں' وہ شوخی سے مسکرادی۔

نوکر نے کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی۔دونوں اٹھ کر کھانے کے کمرے میں آ گئے۔

کھانے کی میز پر نظر پڑتے ہی شیبہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ ہنستے ہوئے بولی۔

''میں تو بڑے مرغن کھانوں کی آس لگائے بیٹھی تھی۔لیکن یہ حقیقت تو میں بھول چکی تھی کہ میرے میزبان ایک ڈاکٹر ہیں جو میرے معالج بھی رہ چکے ہیں۔' اُس نے میز پر پھیلے پرہیزی کھانوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

حقیقتاً اُسے دلی خوشی ہوئی تھی۔ان کی زندگی ظاہرداری ،نمائش اور بناوٹ سے یکسر پاک تھی اور یہی چیز ان کے کردار کو عظمت بخشے ہوئے تھی۔اپنے تلخ الفاظ یاد آئے۔''آپ وہ نہیں ہیں جو نظر آتے ہیں''۔

''آپ کے قول وفعل میں زمین آسمان کا فرق ہے۔''ہائے دل کٹ سا گیا۔''میں نے کیسا تنے تلخ الفاظ اتنے اچھے انسان کو کہہ ڈالے تھے۔''پشیمانی سی چہرے پر جھلکنے لگی تھی۔کنکھیوں سے منیب کو دیکھا تو وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''آپ کی شاندار عورت اُدھار رہی۔''

''نہیں نہیں میں نے یہ بات ازراہِ مذاق کہی ہے۔''شیبہ جلدی سے بول اٹھی۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ دوبارہ اسی کمرے میں آ گئے۔نوکر کافی لے آیا تھا۔شیبہ نے کافی بنا کر منیب کو بھی دی اور خود بھی پینے لگی۔اب وہ جانے کا سوچ رہی تھی۔کچھ دیر اور ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔پھر ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''مجھے اب چلنا چاہیے۔''

''میں کپڑے بدل لوں پھر آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔''

کوئی دس منٹ ہی گذرے ہوں گے، منیب اوورکوٹ میں ملبوس کمرے میں داخل ہوئے۔چابیوں کا ایک گچھا ہاتھ میں جھول رہا تھا۔''آیئے۔کہتے ہوئے وہ گیراج کی طرف

بڑھے۔کار باہر نکالی۔شیبہ نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھنا چاہا تو سنجیدگی سے مسکرا دیئے۔

''کیا آپ آگے بیٹھنا پسند نہ کریں گی۔''الفاظ اتنی شائستگی اور چاہت سے کہے گئے تھے کہ شیبہ کو انکار مشکل لگا۔

منیب نے دروازہ کھول دیا اور وہ ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔اتنے قریب کہ اس کا تنفس اُلجھنے لگا۔رخسار سرخ ہو گئے۔منیب قدرے اس کی طرف جھکتے ہوئے بولے۔''آپ نے کچھ محسوس تو نہیں کیا؟''

نگاہیں ملیں۔ان کی نگاہوں میں محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔شیبہ کی نظریں شرما کر اپنے ہی دامن سے الجھنے لگیں۔

''مس شیبہ آپ نے مجھے کچھ بتایا نہیں۔''منیب نے قصداً لفظ مس پر زور دیتے ہوئے کہا۔

دراصل وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ غیریت کے ان پردوں کو ہٹانے کے لیے کوئی احتجاج کرتی ہے یا نہیں۔

اور واقعی یہ لفظ سن کر اُسے یوں لگا جیسے ابھی تک ان کے درمیان تکلفات کی دیوار حائل ہے۔اس کا دم گھٹنے لگا۔ضبط نہ کر سکی تو دھیرے سے بولی۔

''آپ مجھے مس شیبہ کیوں کہتے ہیں؟''

سٹیرنگ پر مضبوطی سے ہاتھ رکھتے ہوئے منیب مسکرا اٹھے۔''کیا کہہ کر پکاروں، بتایئے؟''

محبت کی گہری تپش اُسے اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھی۔دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ضبط کرتے ہوئے ہلکے سے مسکرائی اور ایک ادائے ناز سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے شرمیلے انداز میں بولی۔

''صرف شیبہ''۔

منیب بھی مسکرا کر رہ گئے ۔اور پھر بڑی ہی جذباتی آواز میں بولے ۔

''ٹھیک ہے، میں تمہیں شیبہ کہہ کر پکاروں گا ۔ یہ نام مجھے بہت پسند ہے ۔اس لفظ کی سماعت شہنائی کی آواز کی طرح میرے قلب کی گہرائیوں میں اترتی چلی جاتی ہے۔'' ان کا لہجہ خوابناک سا ہو گیا تھا۔

اور شیبہ! وہ تو کسی اور ہی دُنیا میں کھو گئی تھی ۔کل اس وقت وہ گاڑی میں ہو گی ۔اس احساس سے ہی اس کا دل بھر آیا ۔قسمت کس نے دیکھی ہے؟ اور مقدر کے متعلق کون جانتا ہے ۔ اٹوٹ رشتے اسی تقدیر کے چکر میں آ کر ٹوٹ جاتے ہیں ۔کیا پتہ کل کیسے حالات ہوں؟ ممی میری شادی ہاشم سے کرنا چاہتی ہیں ۔اس کے چہرے پر پریشانی کی لہریں رقص کرنے لگیں۔

یکدم گاڑی رُکی پتہ ہی نہ چلا کہ منزل مقصود پر کب پہنچ گئی؟ منیب نے دروازہ کھولا اور وہ باہر نکل آئی ۔اردگرد کا جائزہ لیا کھمبا تھوڑی دور ہی تھا۔

چودویں تاریخ کا چاند آسمان کی پیشانی پر جھلملا رہا تھا ۔ نیلے آکاش پر نابانیوں کے لباس پہنے ستارے چاند کے ساتھ مل کر زمین پر پھیلی تاریکیوں پر نور پاشی کر رہے تھے اور وہ ایک دوسرے کے سامنے خاموش کھڑے تھے ۔فضا پر ایک لطیف سی خاموشی طاری تھی جس کے سحر سے وہ دونوں گنگ تھے ۔جذبات کا طوفان امڈا چلا آ رہا تھا ۔وہ دُور فضا میں جانے کیا سوچ رہی تھی کہ منیب کی آواز پر چونک اٹھی ۔جو پیار بھرے لہجے میں اس سے پوچھ رہے تھے ۔

''شیبہ! اب تو غلط فہمیوں میں کے چکر میں نہیں پڑو گی نا ۔''

اس نے نگاہیں اٹھا کر انہیں یوں دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو ۔'' کیا آپ کو اب بھی شک ہے ۔''

منیب نے ہلکے پیازی رنگ کا لفافہ اس کی طرف بڑھایا ۔اس کی نگاہوں میں حیرانی ابھر آئی تھی اور وہ اسے پکڑتے ہوئے ہچکچا سی رہی تھی ۔

''اس میں ٹائم بم نہیں ہے گھر جا کر سوچ سمجھ کر مجھے اس کا جواب لکھنا سمجھیں ۔اور اپنی صحت کا خاص طور پر خیال رکھنا ۔''

رکشے کی آواز پر وہ چونک اٹھی ۔ دوسرے ہی لمحے عطیہ اسے آواز دے رہی تھی ۔

خدا حافظ‘‘ اس نے ان پر الوداعی نظر ڈالتے ہوئے کہا اور ان کی طرف بھاگی ۔

’’خدا حافظ ۔‘‘ انہوں نے بھی ہاتھ ہلایا اور کار میں داخل ہو گئے ۔

باب نمبر: 37

شام کا وقت تھا۔ڈاکٹر اشرف کے تینوں بیٹے خالد،عمر اور عامر لان میں بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔ خالد پچھلے دنوں ایکس کرشن ٹرپ پر چترال گیا تھا۔ وہ اس وقت چھوٹے بھائیوں کو ٹرپ کی تفصیلات بتا رہا تھا کہ اچانک ایک ٹیکسی گیٹ کے اندر آ کر رکی ۔ دوسرے ہی لمحے وہ تینوں تیزی سے ٹیکسی کی طرف لپکے۔شیبہ باہر نکلی ۔ بھائیوں پر نظر پڑتے ہی شگفتہ گلاب کی طرح کھل اٹھی ۔طویل راستے اور تھکن کا احساس گویا یکدم ختم ہو گیا تھا۔

عامر اس سے بری طرح لپٹا ہوا تھا۔لیکن عمر کچھ فکر مند سا ہو کر بہن کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔عامر کو پیار کرتے ہوئے وہ خالد کی طرف پلٹی جو چہرے پر پریشانی لیے اس کی توجہ کا طالب نظر آ رہا تھا۔اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے پیار بھری آواز میں بولی۔

''تم کب آئے خالد؟''

''مجھے تین روز ہو گئے ہیں ......لیکن آپ کمزور دکھائی دے رہی ہیں شیبہ آپی''۔

''اور یہی بات میں بھی محسوس کر رہا ہوں ۔''عمر مضطرب لہجے میں بولا۔''

''شیبہ آپی آپ خاموش کیوں ہیں؟ بتاتی کیوں نہیں ۔''

''فکر کی کوئی بات نہیں ...... پہلے ٹیکسی والے کو فارغ کر دو عمر!''

عمر نے سامان اتروایا اور پھر چاروں بہن بھائی ایک دوسرے کے کندھے پر ہاتھ رکھے

کمرے کی طرف بڑھنے لگے۔

شیبہ آپی آج میں بہت پریشان تھا۔کل مجھے واپس جانا تھا اور آپ سے ملے بغیر چلے جانے کا تصور مجھے بری طرح تڑپا رہا تھا۔"

فرطِ محبت سے شیبہ کی آنکھیں بھیگ سی گئیں۔اس کے سر کو اپنے کندھے سے لگاتے ہوئے بولی۔

"مجھے معلوم نہ تھا کہ میرا پائلٹ آفیسر خالد اشرف میرے انتظار میں ہے۔ورنہ میں کبھی ملتان ......نہ ٹھہرتی ......سیدھی یہاں آتی۔"

شیبہ آپی کیا ہوا ہے آپ کو؟"عمر نے دوبارہ پوچھا۔

"ہونا کیا تھا؟بیمار ہو گئی تھی۔ہسپتال میں داخل رہی۔"

تبھی کمرے میں بیگم اشرف آئیں۔شیبہ ان سے ملی۔ننکو چائے لے آئی تھی۔ابھی چائے پینے ہی لگے تھے کہ ڈاکٹر اشرف بھی اسکے آنے کا سن کر کمرے میں آ گئے۔باپ کو دیکھتے ہی شیبہ ان کی طرف لپکی۔بیٹی کو گلے سے لگاتے ہوئے وہ حیرانی سے بولے۔

"کیا ہوا ہے تمہیں بیٹے؟تم تو بڑی کمزور ہو رہی ہو۔"

"پاپا شیبہ آپی بیماری ہو گئی تھیں۔ہسپتال میں داخل رہیں۔" عامر نے باپ کو تفصیل بتائی۔

"بیٹی کے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے وہ کسی قدر پریشانی سے بولے" کیا ہوا تھا؟"

کچھ نہیں پاپا آپ تو یونہی گھبرا گئے ہیں نمونیہ ہو گیا تھا۔"اس نے مسکراتے ہوئے باپ کی طرف دیکھا"۔

"کس ہسپتال میں داخل رہیں آپ؟"عمر نے پوچھا۔

"پی اے ایف ہوسپٹل میں......شیبہ نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"لیکن وہاں آپ کو کیسے داخل کر لیا گیا؟"خالد نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

''وہاں کے ایس۔ایم۔او ڈاکٹر رانا کے واقف تھے۔'' شیبہ نے جلدی سے کہہ کر یہ بات ختم کردی۔وہ دراصل اس قصے کو طول دینے سے کترا رہی تھی۔

''کیا نام ہے ان کا؟'' ڈاکٹر اشرف نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

شیبہ کا دل دھڑکنے لگا۔جتنا وہ معاملہ کو دبانا چاہتی تھی اتنا ہی ابھر رہا تھا۔دل چاہ رہا تھا اٹھ کر بھاگ جائے لیکن باپ کی بات کا جواب دینا بھی ضروری تھا۔سر کو ذرا جھکاتے ہوئے اسنے بظاہر بڑی بے توجہی سے جواب دیا۔

''منیب فرخ''

''میرا خیال تھا شاید منصور ہیں۔'' ڈاکٹر اشرف نے کہا۔

لیکن یہ نام عمر کو چونکا دینے کے لیے کافی تھا۔یکدم وہ بہن کی طرف دیکھتے ہوئے تیزی سے بولا۔

وہ تو اسما پھوپھو کی دوست کے بھانجے ہیں۔'' اپنی دانست میں وہ بہت بڑا انکشاف کر رہا تھا۔'' پچھلے دنوں جب میں گھر گیا تو ان کے گھر اسما پھوپھو کے ساتھ گیا تھا۔وہاں میں نے ان کی تصویر دیکھی تھی پھر ڈاکٹر اشرف کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''پاپا میں نے انہیں پی اے ایف سٹیڈیم میں میچ کھیلتے دیکھا تھا۔انہوں نے اتنے شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا تھا کہ اس کی تعریف نہیں کی جاسکتی۔بڑی باوقار شخصیت ہے ان کی۔وہاں موجود بھی لوگ ان کی بڑی تعریف کر رہے تھے۔''

''چائے پیو،ٹھنڈی ہو رہی ہے۔قصہ خوانی پھر کر لینا۔'' اسما کی دوست کے بھانجے کی تعریف بھلا بیگم اشرف کہاں سن سکتی تھیں؟

لیکن شیبہ کو اب بیٹھنا دوبھر ہو رہا تھا۔آرام کے بہانے اُٹھ کھڑی ہوئی۔عمر کی تعریف پر اُسے گویا ایک گونا خوشی محسوس ہو رہی تھی۔اس کے شب و روز آج کل کتنے حسین ہو گئے تھے۔غلط فہمیوں کے تاریک بادل چُھٹ چکے تھے۔نکھری ہوئی روشن صبح طلوع ہو گئی تھی۔جس کی سنہری

چمکیلی کرنوں میں شیبہ اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھ رہی تھی۔ شاہراہِ حیات پر شوخ رنگ کے پھول بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے خیالوں کو ایک مرکز مل گیا تھا جس کے گرد اس کے آج کل گھوما کرتے۔''

منزل سامنے نظر آ رہی تھی اور راہی اُسے دیکھ کر تسکین پا رہا تھا۔

کیمسٹری کی موٹی موٹی کتابیں پڑھتے اور کیلکولیشنز لکھتے سے جب ایک باوقار سا مسکراتا ہوا چہرہ کتاب کے صفحوں پر ابھرتا تو وہ سب کچھ بھول جاتی۔ متانت و پیار سے بھرپور آوازیں اس کے دل کی دنیا میں نغمہ بن کر اتر جاتیں۔ تب وہ گرد و پیش سے بے نیاز ہو جاتی اور ایک ہی جست میں وہاں پہنچ جاتی جہاں وہ زندگی کے چند بہترین دن گذار آئی تھی۔ ایک ایک چیز یاد آتی۔ ان کے پُرخلوص برتاؤ، بُردباری، وقار، خود اعتمادی اور سب سے بڑھ کر ان کا مضبوط کردار، واقعی عطیہ کا کہنا ٹھیک ہے کہ وہ منفرد شخصیت کے مالک ہیں۔'' ان کی نگاہوں میں اس نے اپنے لیے بے پناہ پیار محسوس کیا۔ ایسا پیار جو پاکیزگی کا حامل تھا۔ جو ایک لڑکی کے لیے باعث افتخار ہے۔ جس پر ایک لڑکی ناز کر سکتی ہے۔ لوگ کتنے اوچھے ہوتے ہیں۔ ضبط کا دامن کتنی جلدی چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن ان کی زبان نے تہذیب و شائستگی کا دامن ایک بار بھی نہیں چھوڑا۔ تصورات پھیلتے جاتے اور وہ اپنے آپ کو اس دنیا میں پاتی۔ جہاں وہ منیب کے بازوؤں کے سہارے جیون کی اونچی نیچی ٹیڑھی میڑھی راہوں کو طے کرتی جا رہی ہو۔

دھیرے سے نرم گداز ہاتھ آگے بڑھتا اور وہ ڈائری سے اس خط کو نکال لیتا۔ جو منیب نے چلتے وقت اُسے دیا تھا۔ کتنا گھبرائی تھی۔ اُسے لیتے وقت اور جب بھی اسے منیب کے الفاظ ''اس میں ٹائم بم نہیں۔'' یاد آتے تو وہ ہنس دیتی۔'' نگاہیں خط پر پھیل جاتیں اور چہرہ گلابی ہو جاتا۔

اس خط میں کیا تھا شستہ الفاظ میں اسے ایک پیغام دیا گیا تھا۔

وہ پیغام جو روزِ اول سے کائنات کا ہر مرد اپنی پسندیدہ و محبوب ہستی کو دیتا چلا آیا ہے۔

جس پیغام کو اپنا کر دو محبت کرنے والے دل ہمیشہ کے لیے ایک ہو جاتے ہیں۔''

آنکھیں بند ہوتیں اور وہ تصور کی دلفریب وادی میں کھوئی ہوتی ۔کہ ایک وحشت ناک خیال فضاؤں میں اڑتے ہوئے اس کے پیروں کو کاٹ دینے کی کوشش کرتا۔وہ چونک اٹھتی خوابوں کی دنیا سے لوٹ کر حقیقی دنیا میں آجاتی ۔چہرے پر اداسیوں کے رنگ گھل جاتے اور تب وہ بڑے دلسوز لہجے میں خود سے کہتی میں تو پاگل ہوتی جارہی ہوں ۔بغیر پروں کے اڑنا شروع کر دیا ہے۔ جس دن گری ہڈی پسلی ایک ہو جائے گی ۔طرح طرح کے اندیشے دل ودماغ میں اٹھتے اور اسے بے چین کردیتے ۔سیٹھ ہاشم کا خیال تو اسے مار ہی ڈالتا۔وحشت حد سے بڑھ جاتی اور وہ بڑی مضطرب نظر آتی ۔تب ایک اطمینان افروز خیال تیز جگمگاتی کرن کی طرح اس کی بے چینوں اور وسوسوں پر سکون وشانتی کے پھاہے رکھ دیتا۔وہ خود سے کہتی ۔

واقعی ہم لوگ بڑے ناشکر گذار ہیں ۔ہمیں خدائے لم یزل پر اعتماد ہی نہیں رہا۔یہ وسوسے یہ پریشانیاں یہ اضطراب گھٹن اور بے چینیاں کیسی ہیں اور کیوں ہیں؟ وہ عالم الغیب ہے وہ جو پوشیدہ جذبات کو جانتے اور سمجھنے والا ہے ۔کیا کبھی اپنے تخلیق کیے انسانوں کو بے سہارا چھوڑتا ہے ۔کبھی نہیں ۔اس کے ہر کام میں ایک مصلحت اور اپنے بندوں کے لیے بہتری پوشیدہ ہے۔ہم بادی النظر میں ان مصلحتوں کو سمجھ نہیں پاتے ۔ذرا سا کام طبیعت کے خلاف ہو جائے تو بگڑ بیٹھتے ہیں اور یہ سب اسی لیے ہے۔'' کہ ہمیں اس کی ذات پر کامل اعتماد نہیں ۔کراچی جانے سے قبل میرے کیا احساسات تھے؟ میں نے نہ جانے کے لیے کتنی ضد کی اور وہاں بھی میری کیا حالت رہی؟ لیکن مجھے کیا معلوم تھا؟ میری زندگی نئی کروٹ لینے والی ہے۔وہی انسان مجھے اتنا عزیز ہو جائے گا ۔جس سے مجھے نفرت تھی ۔میری آنکھوں پر چھائے نفرت کے پردے ہٹ جائیں گے۔ میں ان سب باتوں سے کب آگاہ تھی؟ معبودِ حقیقی ہمیں تیری رحمت سے کبھی نا اُمید نہیں ہونا چاہیے ۔کیونکہ نا اُمیدی کفر ہے ۔تیری رحمت کا سمندر بے کنار ہے اور تو اپنے بندوں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا۔''

اور واقعی اس کا دل اتنی تسکین پا جاتا کہ محسوس ہوتا جیسے اس کے دل میں ایمان کی شمع

پوری طرح روشن ہوگئی ہو۔تب وہ ہر احساس سے بے نیاز پڑھائی میں لگ جاتی ۔

اس دن یونیورسٹی سے وہ جلدی آ گئی۔شام ہو رہی تھی ۔یاد آیا کہ نغمہ کے بھتیجے کی پرسوں سالگرہ ہے ۔چنانچہ اسی وقت وہ بازار کے لیے چل دی۔شہر کی سب سے بڑی دکان کے سامنے کار رُکی ۔اس نے بچے کے لیے تحفہ خریدا اور واپسی کے لیے قدم اٹھائے ۔اچانک نظر اُون کے سٹور کی طرف اٹھ گئی۔بے انتہا پیارا رنگ نظر آیا۔سٹور کی طرف بڑھی اور دکاندار کو اُون دکھانے کیلئے کہا۔

صرف رنگ ہی شاندار نہ تھا بلکہ اُون بھی بہت بڑھیا تھی ۔اس کا دل اُون خرید لینے کو بے اختیار چاہا۔لیکن کس کے لیے خریدے۔خالد کو اس نے اسی سال تین جرسیاں اور دو سویٹر پارسل کیے تھے۔عامر،عمر اور پاپا کے لیے بھی کتنے ہی بناڈالے تھے۔تبھی باوقار سی ایک ہستی تصور میں ابھری وہ ہستی جو تنہا تھی ۔

چند لمحوں تک وہ اُون پر نظر جمائے کچھ سوچتی رہی اور پھر اُون خرید کر گھر چلی آئی ۔

باب نمبر: 38

شام ہو رہی تھی۔شیبہ پائیں باغ میں آرام کرسی پر نیم دراز گھٹنوں پر رکھی جرسی کا جائزہ لے رہی تھی۔فی الواقع جرسی بے انتہا شاندار تیار ہوئی تھی۔اس نے کتنے ارمانوں اور امنگوں سے اسے تیار کیا تھا۔ایک ایک خانے کو کتنی عقیدت اور محبت سے بنا تھا۔اسے اس کا دل ہی جانتا تھا۔ دلفریب رنگ پر خوبصورت نمونہ اس کی شان کو بڑھا رہا تھا۔

''کل تک اسے پارسل کر دینا چاہیے اور جب یہ انہیں ملے گا تو ان کے احساسات کیا ہوں گے؟''

''ٹھیک ہے۔یہ اس سوال کا جواب ہو گا جو انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا۔یہ میری رضا مندی کا ایک واضح اور کھلا ثبوت ہو گا کہ میں ان کے مضبوط ہاتھ کو تھامنے کی متمنی ہوں۔اس کے خوبصورت رنگ میں انہیں میری حسین تمناؤں کے پرتو نظر آئیں گے۔گہرے جذبات انہیں اپنی دھڑکنوں کے نزدیک محسوس ہوں گے۔''

اس نے مسکراتی آنکھوں سے افق کی طرف دیکھتے ہوئے ان کے محسوسات کا جواب خود ہی دیا۔لیکن سورج کو مغرب کی وادیوں میں تیزی سے اترتے دیکھ کر حیران سی رہ گئی۔سردیوں کی شامیں بھی کتنی مختصر ہوتی ہیں۔یوں پلک جھپکتے میں بیت جاتی ہیں۔فضا میں خنکی کا احساس اب اُسے اٹھنے پر مجبور کر رہا تھا۔سویٹر اٹھا کر کندھے پر ڈالتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔سارے گھر پر

گھمبیر اداسی چھائی ہوئی تھی۔عمر اور عامر کے بغیر گھر کتنا سونا لگ رہا تھا۔اس نے اداسی سے سوچا۔

دونوں بھائی ڈاکٹر اشرف کے دوست میجر ڈاکٹر محسن کے بڑے بیٹے کی شادی میں شرکت کے لیے ماں کے ساتھ راولپنڈی گئے ہوئے تھے۔ڈاکٹر اشرف پلاسٹک سرجری کے علاج کو ہسپتال میں رائج کرنا چاہتے تھے۔اس لیے وہ پچھلے ہفتے پلاسٹک سرجری پر ریسرچ کے لیے مغربی جرمنی جا چکے تھے۔اتنے بڑے گھر میں آج وہ تنہا تھی۔اچانک ننکو کی آواز نے اسے چونکا دیا۔وہ فون سننے کو کہہ رہی تھی۔

وہ تیزی سے ڈرائنگ روم کی طرف بھاگی۔

''ہیلو کون؟''

اس نے ریسیور کریڈل سے اٹھا کر تیزی سے کہا۔بھاگنے کی وجہ سے تنفس تیز ہو رہا تھا۔

''مس شیبہ گھر پر ہیں''دوسری طرف سے کسی نے بھاری آواز میں پوچھا۔

جی ہاں کہیے۔میں شیبہ بول رہی ہوں۔آپ کی تعریف؟''

''منیب''

''آپ''

اس نے مسرت سے لرزتی آواز میں کہا۔آپ کب آئے۔''اس کی چمکدار آنکھوں میں یکدم خوشیوں کے دیئے جل اٹھے تھے۔انگ انگ مسکرا اٹھا۔

''میں آج ہی آیا ہوں۔''اس کی مسرت سے بھرپور آواز میں منیب مسکرا اٹھے۔

''آپ کہاں ٹھہرے ہیں؟''اس نے شوق و تجسس سے پوچھا۔آفیسرز میس میں۔کیا شیبہ تم یہاں نہیں آؤ گی۔''اس کے لہجے میں محبت بھرا اصرار تھا۔

''نہیں آپ ہمارے گھر آئیں۔ابھی اسی وقت''۔اس نے اتنے یقین سے کہتے ہوئے سلسلہ کلام منقطع کر دیا۔جیسے مزید کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی نہ ہو۔''

چند لمحوں تک وہ چہرے پر مسکراہٹ لیے سامنے دیکھتی رہی اور پھر باہر آ گئی۔ایک

بھرپور نظر گردوپیش پر ڈالی ۔یوں لگا جیسے فضائیں محبت بھرے نغمے الاپ رہی ہوں ۔راہوں پر بکھرے شوخ و چمکیلے رنگوں میں اور بھی خوبصورتی آ گئی ہو۔درختوں کی جھومتی ڈالیاں کسی کو خوش آمدید کہہ رہی ہوں ۔گلاب کے سدا بہار پھولوں کی نکہت پہلے سے بھی بڑھ گئی ہو۔نگاہیں افق کی طرف اٹھ گئیں ۔آسمان کی مغربی وسعتوں میں آوارہ بدلیوں کے ٹکڑے شفق کی سرخی میں ڈوبے کسی نئی نویلی دلہن کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ستون کے ساتھ ٹیک لگائے وہ فضائے بسیط کی لامحدود پنہائیوں میں گم تھی کہ دماغ نے ٹہوکا دیا۔

''وقت کم ہے سوچوں سے آزاد ہوجاؤ'' اور اس احساس سے وہ واقعی چونک اٹھی ۔تیزی سے باورچی خانے کی طرف آئی اور خانساماں کو مزید چیزیں تیار کرنے کا کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔سویٹر کو پریس کیا اور اسے لفافہ میں رکھ کر خود باہر نکل آئی ۔

باہر اندھیرے اجالوں سے گلے مل رہے تھے۔برآمدے میں ستون کے سہارے کھڑے ہوکر وہ گیٹ کی طرف دیکھنے لگی۔کتنی ہی دیر ہوگئی۔لیکن منتظر نگاہیں ابھی تک بے چینی سے راہ دیکھ رہی تھیں ۔''میں نے غلطی کی ۔فون یکدم بند کردیا کم از کم ......''

سوچ تکمیل کے مراحل ہی طے کررہی تھی کہ یکدم اس کی نگاہ گیٹ میں داخل ہونے والی سیاہ کار پر پڑی ۔فرطِ انبساط سے اس کے رخسار تمتما اٹھے ۔فوراً ستون کی آڑ میں ہوگئی۔جگمگاتی آنکھوں اور مسکراتے ہونٹوں سے اس نے سوچا کہ تھوڑی دیر کے لیے پریشان کیا جائے ۔لطف رہے گا۔

کار پورچ کے قریب رُک گئی اور منیب باہر نکل آئے ۔ دروازہ بند کرتے ہوئے انہوں نے متجسس نگاہیں اِدھر اُدھر دوڑائیں ۔گہرے گرے سوٹ میں ملبوس وہ اتنے وجیہہ لگ رہے تھے کہ شیبہ نے ایک لمحے کو اپنی آنکھیں بند کرلیں ۔تھوڑی دیر تک وہ اِدھر اُدھر دیکھتے رہے اور وہ ستون کی آڑ میں چھپی ان کی حرکات کا جائزہ لیتی رہی ۔اب وہ مخالف سمت کی طرف بڑھے ۔

''اچھا ہے ۔تھوڑی سی سزا ملنی چاہیے ۔اتنی دیر سے آئے ہیں ۔'' وہ خود سے بولی ۔

کچھ دُور جا کر رُک گئے ......اِدھر اُدھر دیکھا وہ بے حد محظوظ ہو رہی تھی۔

نگاہیں جو دوبارہ اٹھیں تو منیب اس کی طرف تیزی سے آ رہے تھے۔سیاہ شال کا کونا انہیں نظر آ گیا تھا۔

''اب کیا سامنے آ جاؤں۔سوچیں گے کہ اتنی دیر سے میری بدحواسی سے لطف اندوز ہو رہی ہے۔''اس نے تیزی سے سامنے آ جانا چاہا۔لیکن یوں محسوس ہوا جیسے زمین نے مضبوطی سے قدم پکڑ لیے ہیں۔خود اعتمادی سے اٹھتے ہوئے نپے تلے قدم دھیرے دھیرے قریب آ رہے تھے۔ایک بار پھر ہمت کی لیکن ٹانگیں ساتھ چھوڑتی معلوم ہو رہی تھیں۔ٹھنڈ کے باوجود اس کی پیشانی پر پسینہ آ گیا تھا۔بس نہ چلا تو ستون کی طرف منہ کر کے چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔

قدموں کی آواز اس کے بالکل قریب آ کر رُک گئی۔اپنی زبان اس نے ہونٹوں تلے سختی سے دبا لی۔شال میں لپٹی دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے ستون میں منہ دیئے منیب اس پیاری لڑکی کو محبت کی گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔دھیرے سے اس کے اور قریب آتے ہوئے بولے۔

''مہمانوں کے استقبال کا یہ نیا طریقہ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔''

اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے کاٹ ہی تو لیا۔دل چاہ رہا تھا کہ ستون پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔کافی دیر گذر گئی منیب مسکرا رہے تھے۔

آخر بولے۔

''شیمہ بٹھانے کا ارادہ ہے یا نہیں۔''

واقعی اس نے پاگلوں والی حرکت کی تھی۔بھلا کوئی تک تھی۔یہی سوچتے ہوئے اس نے یکدم رُخ موڑا اور آگے بڑھنے لگی۔ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا ہی تھا۔اس کے پیچھے پیچھے منیب بھی آ گئے۔تیز دودھیا روشنی میں انہوں نے دیکھا۔پیشانی پر شبنم کے موتی جمے ہوئے تھے۔نگاہیں جھکی

ہوئی تھیں ۔دلفریب چہرے پر مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ ہلکی ہلکی شرمندگی کے تاثرات تھے ۔زردی اور کمزوری جو کراچی کے قیام کے دوران انہوں نے اس کے چہرے پر دیکھی تھی ۔یکسر رفع ہو چکی تھی ۔چہرہ شگفتہ گلاب کی طرح تھا ۔خاموشی سے صوفے پر بیٹھی سیاہ چپل کی نوک سے قالین کرید رہی تھی ۔

''میرا خیال ہے مجھے واپس چلے جانا چاہیے ۔''

''کیوں؟'' یکدم اس نے نگاہیں بے چینی سے اٹھائیں ۔

''میں نے شاید تمہیں آ کر پریشان کیا ہے ۔'' دراصل وہ کسی حد تک صورتحال سمجھ گئے تھے اور اب اس کی شرمندگی کے احساس کو زائل کرنا چاہتے تھے ۔

''نہیں نہیں'' وہ یکدم اٹھتے ہوئے بولی ۔''اتنی جلدی میں آپ کو نہیں جانے دوں گی ۔''

''میں صرف ایک شرط پر ٹھہروں گا ۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا ۔

''کیا؟'' وہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ۔

''یہی کہ میرے ساتھ خوب بے تکلفی سے باتیں کرو گی ۔ان کی معنی خیز مسکراہٹ دیکھ کر وہ ہنس دی ۔

''باتیں کرو گی نا ؟'' انہوں نے پیار بھرے لہجے میں مسکراتے ہوئے پوچھا ۔

''ہاں !'' اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے سر ہلا دیا ۔

''یہاں آ کر بیمار تو نہیں ہوئیں ؟''

بیمار ہی ہوئے جاتا تھا ۔وہ مسکراتے ہوئے آہستہ سے بولی ۔

''شیبہ مجھے اُمید ہے ،آج تمہارے پاپا مجھے شرف ملاقات بخشیں گے ۔''

''مجھے افسوس ہے کہ آپ آج بھی ان سے نہ مل سکیں گے کیونکہ وہ مغربی جرمنی پلاسٹک سرجری پر ریسرچ کے سلسلے میں گئے ہوئے ہیں ۔''

''کب گئے ہیں؟'' انہوں نے پوچھا ۔

پچھلی اتوار۔آج تو گھر پر کوئی بھی نہیں۔ممی اور دونوں چھوٹے بھائی شادی پر پنڈی گئے ہوئے ہیں۔میرے بھائی کو آپ سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔لیکن آج وہ بھی یہاں نہیں"۔

"وہ مجھے کیسے جانتے ہیں؟"انہوں نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

"اس نے آپ کو شاید سٹیڈیم میں کرکٹ کا میچ کھیلتے دیکھا تھا۔بڑی تعریفیں کر رہا تھا"

نکو چائے لے آئی تھی۔چائے بناتے ہوئے اسے پہلی ملاقات یاد آئی جب اس نے منیب سے دودھ کے متعلق پوچھا تھا۔ان کے جواب پر اپنا احساس یاد آیا۔دزدیدہ نگاہوں سے منیب کی طرف دیکھا اور دھیمی سی ہنسی ہنس دی۔

"شیبہ مجھے ایک بات بتاؤ گی نا؟"انہوں نے بے پناہ اشتیاق سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا"

"کہیے"

"جب پہلی بار میں یہاں آیا تو چائے بناتے ہوئے تم نے مجھ سے دودھ کے متعلق شاید پوچھا تھا اور میرے جواب دینے پر شریری مسکراہٹ تمہارے ہونٹوں پر پیدا ہوئی تھی۔اس وقت نہ تو میں مسکراہٹ کی وجہ جان سکا تھا اور نہ ہی پوچھنے کی جسارت کر سکا۔لیکن آج چائے بناتے ہوئے تمہارے ہونٹوں پر میں پھر ویسی ہی مسکراہٹ دیکھ رہا ہوں۔مجھے اسکی وجہ بتاؤ گی؟

بے اختیار شیبہ ہنس دی۔آنکھیں چمک رہی تھیں۔محبت سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے اور لہجے میں شرینی گھولتے ہوئے وہ بڑی ادا سے بولی۔

"آپ دل میں بھی جھانک لیتے ہیں؟"بس وہ بات ہی ایسی مزیدار تھی کہ اسکے خیال سے ہنسی آجاتی ہے۔"

"اتنی دلچسپ بات میرے علم میں بھی آنی چاہیے تاکہ میں بھی لطف اٹھا سکوں"۔

"ابھی میں آپ کو نہیں بتا سکتی۔پھر کبھی سہی"۔

"پھر کبھی کیوں۔ابھی بتاؤ نا"ان کے لہجے میں اصرار تھا۔

''چھوڑیے اس بات کو چائے پئیں۔ میں پھر کبھی آپ کو بتاؤں گی۔'' شیبہ نے کپ انہیں تھماتے ہوئے کہا۔

''ہسپتال کوٹھی کے ساتھ ہے نا؟'' منیب نے چائے پیتے ہوئے کہا۔''جی ہاں آپ دیکھنا چاہتے ہیں؟''

''ضرور اگر تمہیں دکھانے پر کوئی اعتراض نہ ہو۔'' منیب نے قصداً تکلفانہ انداز اختیار کیا۔

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ آپ نے تکلفانہ انداز اپنا لیا ہے۔''اس نے کسی قدر شاکی لہجے میں کہا۔

''نہیں! شیبہ تم سے کیسا تکلف؟ میں مذاق میں ایسا کہہ رہا تھا۔ چلیے اب چلیں۔''

ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ کوٹھی سے نکل کر باہر سڑک پر آ گئے۔

''یہ اسما خالہ کے نام پر ہے نا۔''

''جی ہاں'' شیبہ نے جواب دیا۔

ہسپتال کی وسیع و شاندار عمارت اب ان کے سامنے تھی۔ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہسپتال کا سنگِ بنیاد نظر پڑا۔''اس کا افتتاح اسما پھوپھو نے کیا تھا۔'' شیبہ نے بتایا۔ منیب نے سنگِ مرمر کے ٹکڑے پر لکھے ہوئے الفاظ پڑھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ گھبرائی تو نہیں تھیں؟''

''بالکل نہیں، انہوں نے رسم اتنے وقار سے ادا کی تھی کہ کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ خاتون دیہات کی فضاؤں میں پلنے والی ہے۔ اسما پھوپھو بہت عظیم ہیں۔''اس کے لہجے سے ٹپکتا احترام اور محبت بھرے خیالات اسما کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے کافی تھے۔

نچلے حصے کا جائزہ لینے کے بعد وہ اوپر کی منزل میں جا رہے تھے۔ ڈاکٹرز نرسیں اور دوسرے لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھی۔ منیب نے آپریشن تھیٹر بھی دیکھا طب سے متعلق

جدید ترین اوزار اور مشینوں کا بھی بغور جائزہ لیا۔ مریضوں کے لیے انتظامات واقعی نہایت اعلیٰ تھے۔

واپسی پر جب شیبہ نے ان سے پوچھا۔

''آپ کو ہسپتال پسند آیا؟'' تو منیب اس کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکے۔

''یہ ایک عظیم شخص کا عظیم کارنامہ ہے۔''

کوٹھی میں داخل ہوتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

''لائبریری تو یقیناً ہسپتال میں ہی ہو گی؟''

''اوہو لائبریری دکھانی تو مجھے یاد ہی نہیں رہی۔ چلئے میں آپ کو پاپا کی ذاتی لائبریری دکھاتی ہوں۔'' اور جونہی منیب نے لائبریری کے...... وسیع وعریض اور شاندار کمرے میں قدم رکھا تو وہ یوں چونک اٹھے جیسے کسی انوکھی اور عجیب وغریب چیز پر نظر پڑ گئی ہو۔ شیبہ آگے تھی ورنہ ان کی آنکھوں سے جھلکتی حیرانی اس سے پوشیدہ نہ رہتی۔ منیب تو گم سم کھڑے لائبریری کے وسط میں دیوار پر آویزاں تصویر کو دیکھ رہے تھے۔ فروانیٔ شوق سے ان کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ تصویر کے قدموں میں دوزانو بیٹھ کر نذرانہ عقیدت پیش کریں۔ اس محبوب ہستی کو زمانے کے آلام وتفکرات پر مشتمل ایک طویل حکایت سنائیں۔ آخر ایسی خواہشات سینے میں کیوں نہ جنم لیتیں۔ کہ دیوار پر آویزاں تصویر ان کے ابو ڈاکٹر فرخ کی تھی۔ تحت الشعور میں ایک نام گونجا اور ایک تصویر ماضی کے عکس نے ان کے حافظہ میں یاد کروائی۔ وہ تصویر جسے وہ ہمیشہ ڈرائنگ روم میں اپنے پاپا کی تصویر کے ساتھ دیکھتے رہے تھے جس کے متعلق ان کے دادا بتایا کرتے تھے کہ یہ تمہارے ابو کے گہرے دوست ڈاکٹر اشرف ہیں۔

آہ نیرنگئی زمانہ پر ان کا دل کٹ گیا۔ بڑی تلخ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔

شیبہ انہیں دیکھ رہی تھی۔ ان کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے بولی۔

''آپ چپ کیوں ہو گئے۔''؟

''نہیں تو''وہ بھر پور محبت سے مسکرا دیئے۔

وہ آگے بڑھ کر کتابیں دیکھنے لگے۔لیکن نظریں رہ رہ کر اس طرف لوٹتیں۔دل چاہ رہا تھا،تصویر کو اتار کر اپنے ساتھ لے جائیں۔ویسے قدرت کے اس عجیب وغریب اتفاق پر حیران ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بے انتہا مسرور بھی تھے۔یقیناً ڈاکٹر اشرف ان کے خاندانی پس منظر سے واقف ہوں گے۔

شیبر ان کی زندگی کا ماحصل تھی اور اس کا حصول انہیں اب اتنا مشکل نظر نہ آرہا تھا۔جتنا اس سے قبل تھا۔

''یہ پاپا کی خواب گاہ ہے۔''

''شیبہ نے ساتھ والے کمرے کو کھولتے ہوئے کہا۔ساتھ ہی منیب بھی کمرے میں آ گئے۔''

یہاں بھی آتش دان کے مرکز میں اپنے باپ اور ڈاکٹر اشرف کے زمانہ طالب علمی کی تصویریں دیکھیں۔

''یہ میرے پاپا کے عزیز ترین دوست ڈاکٹر فرخ ہیں۔''شیبہ نے تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی۔

''میرے پاپا کو ان سے اتنا پیار ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔انہیں وفات پائے ستائیں اٹھائیس سال کا عرصہ بیت چکا ہے لیکن میرے پاپا کو آج بھی ان سے اتنی ہی محبت ہے جتنی کہ ان کی زندگی میں تھی۔ایسی بے مثال دوستی کہیں نظر نہیں آتی۔''

''ان کے بچے اور خاندان کے دیگر افراد تو آپ سے ملتے ہوں گے۔''منیب نے اسے مزید کریدا۔

''بس یہی تو افسوس ہے۔باوجود کوشش کے ان کا کوئی سراغ حاصل کرنے میں پاپا

کامیاب نہ ہو سکے۔''تب شیبہ نے انہیں ڈاکٹر فرخ کے متعلق بہت سی باتیں بتائیں۔

''چلیئے آیئے۔کھانا بھی تیار ہو گیا ہو گا۔''

ان کے خاندانی پس منظر سے ڈاکٹر اشرف ہی نہیں بلکہ ان کے بچے بھی آگاہ تھے۔ یہ امر منیب کے لیے حد درجہ طمانیت اور مسرت کا باعث تھا۔ان کی روح خوشی کے ساتویں آسمان پر تھی اور دل و دماغ سرشار تھا۔ایک نیا ولولہ ایک نئی امنگ اور ایک نیا حوصلہ انہیں محسوس ہو رہا تھا۔

خوشگوار باتوں کے درمیان کھانا ختم ہوا۔چائے کا دور چلا اور اب منیب واپسی کا سوچ رہے تھے۔تھوڑی دیر اور بیٹھنے کے بعد جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔انہیں کھڑا دیکھ کر شیبہ اٹھ گئی۔نگاہیں ملیں تو منیب کو شیبہ کی آنکھوں میں افسردگی سی جھلکتی ہوئی دکھائی دی۔وہ اداس ہو گئی تھی۔منیب کچھ سوچ رہے تھے۔ایک گہری سوچ۔ایک بار پھر نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی انہیں دیکھ رہی تھی۔بجلی سی کوند گئی۔سارے جسم میں لطیف سا ارتعاش محسوس ہوا۔

اس کے قریب پہنچ کر انہوں نے بھاری لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

''شیبہ تم نے کیا سوچا ہے؟''

اس کا دل دھڑک اٹھا۔نگاہیں زمین پر گر گئیں۔سوچ رہی تھی کہ کیا جواب دے۔کتنی ہی دیر خاموشی طاری رہی۔تب ایک بار پھر ان کی خوابناک سی آواز سنائی دی۔

''میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا شیبہ؟''

دھیرے سے اس نے نگاہیں اٹھائیں۔ان کی نگاہوں میں خمار تھا۔گہرا پیار ٹپک رہا تھا اور وہ اس کے بالکل قریب کھڑے تھے۔یہی چیز اس کے چہرے کو گلابی کیے جا رہی تھی۔

''کچھ تو کہو''آواز جذبات کی شدت سے بوجھل تھی۔

''آپکو چند دن بعد جواب مل جائے گا۔''اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''چند دنوں بعد کیوں؟ابھی اور اسی وقت کیوں نہیں۔''؟

دھیرے سے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھے وہ اتنے پیار بھرے لہجے میں کہہ رہے تھے کہ شیبہ خود کو ڈوبتا ہوا محسوس کرنے لگی۔حرارت سے بھرپور ہاتھوں کا لمس اس کے جسم میں سنسنی پیدا کر رہا تھا۔لطیف سا سرور رگ و پے میں دوڑ رہا تھا۔کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔دل کے ساتھ ساتھ سارا جسم لرز رہا تھا۔

''جواب دو نا!''

انہوں نے ہلکا سا دباؤ اس کے شانوں پر ڈالتے ہوئے پیار بھرا اصرار کیا۔

دھیرے سے بوجھل پلکیں اُٹھیں۔منیب کی نگاہوں سے ملیں۔ان نگاہوں میں کیا تھا؟ دل کی ساری محبت سمٹ کر منیب کی آنکھوں میں جمع ہو گئی تھی۔جس کا اظہار آنکھیں بڑے ہی پیارے انداز میں کر رہی تھیں وہ ایک لمحے سے زائد نہ دیکھ سکی۔سر محبت کا احترام کرتے ہوئے نگوں ہو چکا تھا۔جذبات مچل رہے تھے۔منیب کا دل چاہ رہا تھا کہ اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر اسے بازوؤں میں سمیٹ لیں۔

''ہوش میں''ضمیر نے پکارا'' یکدم انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں سے اٹھا لیے اور تیز سانس لیتے ہوئے دوسری طرف دیکھنے لگے۔شیبہ نے اپنے اڑے اڑے حواس جمع کیے اور تیزی سے باہر نکل گئی۔چند ہی منٹ بعد واپس آ گئی۔وہ اس کے ہاتھوں میں پکڑے پیکٹ کو دیکھ کر حیران سے ہو گئے.....قریب آ کر اس نے نگاہیں نیچی کرتے ہوئے پیکٹ ان کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ کیا ہے؟''ان کی نگاہوں میں حیرت و استعجاب نمایاں تھا۔

مسکراتی آنکھوں سے اس نے منیب کی طرف دیکھا۔انہوں نے پیکٹ کھول لیا۔

''اتنا خوبصورت اور بے پناہ پیارا سویٹر۔''مسرت سے ان کا دل جھوم اٹھا۔

چھوٹی سی ایک چٹ نیچے گر گئی۔اٹھائی پڑھی۔مسکرائے اور اسے دوبارہ پیکٹ میں ڈالتے ہوئے باہر نکل آئے۔کار کے قریب پہنچ کر انہوں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔دھیرے سے

بغیر کسی حیل وحجت کے شیبہ نے اپنا چھوٹا سا خوبصورت ہاتھ ان کے صحت مند وتوانا ہاتھ میں دے دیا۔

''میں ان ہاتھوں کا شکر گذار ہوں ۔جنہوں نے میرے لیے اتنی محنت کی اور ان جذبات کا ممنون ہوں جنہوں نے میرا اتنا خیال رکھا۔''

ہلکا سا دباؤ ہاتھ پر ڈالتے ہوئے انہوں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''میں روشن خالہ کو کب بھیجوں؟''وہ نیم باز آنکھوں سے شیبہ کو دیکھ رہے تھے۔

شرم سے اس کے رخسار تمتما اُٹھے۔

''بہتر وہ اگلے ماہ یہاں آئیں گی۔''

نہیں نہیں ۔وہ یکدم بول اٹھی جب تک میں امتحان سے فارغ نہیں۔''......جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ برآمدے کی طرف بھاگی۔

پیار بھری نظروں سے وہ اسے بھاگتا دیکھ رہے تھے ۔کار اسٹارٹ کی اور اس کا رُخ موڑ لیا۔

باب نمبر: 39

وقت ہواؤں کے دوش پر اُڑ رہا تھا۔موسم سرمائی لبادہ اُتار کر بہار کی دیدہ زیب وخوش رنگ پوشاک زیب تن کر چکا تھا۔ہر شے ارغوانی محسوس ہوتی تھی۔ہواؤں میں نغمگیت جنم لے چکے تھے۔صبحیں دلفریب اور شامیں سحر انگیز تھیں۔

ایک روشن صبح شیبہ نے جب کھڑکی کا پردہ اٹھا کر باہر جھانکا تو اتنا دلفریب سماں نظر آیا کہ وہیں مبہوت ہو کر کھڑی رہ گئی۔آسمان کا سجیلا شہزادہ.....پوری تابانیوں سے اپنے نیلے محلے کے دریچے سے جھانک رہا تھا۔چھوٹی چھوٹی بدلیوں کے ٹکڑے ہواؤں کے دوش پر لہرا رہے تھے۔درخت حسین پوشاکیں زیب تن کیے بڑی سج دھج اور آن بان سے کھڑے تھے۔"فطرت کتنی حسین ہے۔اے کاش یہ دنیاوی بکھیڑے انسان کے پاؤں کی زنجیر نہ بنے ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔"اس نے اداسی سے کھڑکی کے پٹ سے سر ٹکاتے ہوئے سوچا۔

انسان فطرت کی اُن پرسکون وادیوں میں نکل جاتا۔جو اپنے اندر فطرت کی تمام رعنائیاں سمیٹے ہوئے ہیں جہاں جیون پہاڑیوں کے دامنوں سر سبز درختوں کے گہرے سایوں اودی اودی گھٹاؤں اور رم جھم برستے پانی میں بیت جاتا۔کتنا حسن ہوتا۔لمبی سانس بھرتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔کتنی ہی دیر وہ یونہی کھڑی اس تصوراتی دنیا کی سیر کرتی رہی کہ اچانک شیاما کی پیاری پیاری کومل آواز سے خوابوں سے کھینچ لائی۔فوراً اسے شادی میں جانے کا خیال آیا۔

وقت دیکھتے ہوئے وہ کھڑکی سے ہٹ آئی اور وارڈ روب میں کپڑوں کا جائزہ لینے لگی کہ یک دم سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ نے اسے چونکا دیا۔

ایک دو منٹ تک وہ چاپ سنتی رہی اور پھر مسکرا دی۔ وارڈ روب کا پٹ پکڑے منتظر نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ عطیہ کمرے میں داخل ہوئی اور اسے یوں کھڑے دیکھ کر تیزی سے بولی۔

''ان کی دنیا میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ سر کا روقت دیکھا ہے؟'' اس کے لبوں پر شریر تبسم مچل رہا تھا۔

''پہلے تمہاری چمک دمک کا دیدار کرلوں؟ وقت کا کیا ہے۔ وہ تو بعد میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔''

''فکر نہ کرو۔ جب تم سج دھج کر نکلو گی تو تو میری چمک دمک خود بخود ماند پڑ جائے گی۔ بالکل ایسے ہی جیسے چاند نکلنے سے ستارے ماند پڑ جاتے ہیں۔''

''اتنا بنانے کی کوشش مت کرو۔ میں تو یہ سوچ رہی ہوں۔ اگر آج تمہیں بینگن دیکھ لے تو عاشقی میں جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی ہے وہ بھی پوری ہو جائے''۔ شیبہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اے ہے صبح صبح کس منحوس کا نام لیا ہے۔ یہ بینگن شلجم کے چکر چھوڑو۔ چلنے کی تیاری کرو۔ وہاں کیا عین کھانے کے وقت پہنچنا ہے۔''

''بینگن غریب کے ذکر پر تمہارا منہ یوں بن گیا ہے۔ جیسے کسی نے تمہیں کڑوی دوا پینے کو کہہ دیا ہو۔ کسی کے بے پایاں خلوص و چاہت کی تمہارے نزدیک یہ قدر ہے۔ بے حال ہو رہا ہے بیچارہ۔ بس مجنوں بننے کی کسر رہ گئی ہے۔ سو وہ بھی پوری ہو جائے گی۔''

شیبہ تمسخرانہ انداز میں اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ آج وہ اسے ستانے پر تلی بیٹھی تھی۔

''ایسے تھرڈ کلاس عاشقوں کے لیے خانہ دل میں کوئی گنجائش نہیں''۔ عطیہ آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولی۔

شیبہ ڈریسنگ روم میں چلی گئی اور عطیہ نیچے بیگم اشرف کے پاس آ گئی۔ بیگم اشرف اور بچے تقریباً تیار تھے۔ تھوڑی دیر بعد جب شیبہ تیار ہو کر نیچے آئی تو عطیہ نے مسکراتے ہوئے اسے گھورا۔ نیلی ساڑھی میں وہ وینس کی کوئی حسین شہزادی لگ رہی تھی۔ کار کی طرف بڑھتے ہوئے عطیہ نے سرگوشی کی۔

''اے کاش آج تمہیں وردی والا دیکھ لے۔'' تیکھی نگاہوں سے اس نے عطیہ کو گھورا اور قدرے مسکراتی ہوئی بولی۔ کمبخت بڑی جلدی بہکنے لگتی ہو۔''

شادی والے گھر پہنچ کر شیبہ اور عطیہ دلہن کے کمرے میں چلی گئیں۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھیں۔ کمرے میں ایک طوفان امنڈا ہوا تھا۔

شیبہ عطیہ کا بازو پکڑ کر باہر نکل آئی۔

لان میں شامیانے کے نیچے صوفے اور کرسیاں بچھی تھیں۔ بیگم اشرف دوسری بیگمات کے ساتھ وہیں بیٹھی تھیں۔ وہ لوگ بھی قریبی صوفے پر بیٹھ گئیں شیبہ کسی خیال میں گم تھی کہ اچانک عطیہ کے چٹکی کاٹنے پر چونک اٹھی۔

غصیلی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کچھ کہنے لگی تھی کہ اس کی معنی خیز نگاہوں کو سامنے کی طرف اشارہ کرتے دیکھ کر اس نے ادھر دیکھا۔ آنکھوں کے کنول جگمگا اٹھے۔ ہونٹوں پر بڑی پیاری اور مدھری مسکان پیدا ہوئی دل کی دنیا میں جلترنگ سا بجنے لگا۔

سامنے کچھ فاصلے پر منیب کسی سے دلنشیں انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ سرمئی سوٹ میں بلند و بالا قد اور صحت مند جسم بڑا وجیہہ دکھائی دے رہا تھا۔

چند لمحوں بعد وہ اسی مرد کے ساتھ شامیانے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بیگم اشرف نے سامنے سے آنے والے اس نوجوان کو دیکھا۔ جس کی پروقار شخصیت اسے عام لوگوں سے ممیز کر رہی تھی۔ آنکھوں میں گہری ذہانت اور ایک تفاخر کا احساس دلکش نقوش چہرے پر پھیلا ہوا غایت درجے کا وقار اور خود اعتمادی سے لبریز چال دوسروں کی توجہ کھینچ رہے تھے۔ وہ دل ہی دل میں

نوجوان کی تعریف کر رہی تھیں اور سوچ رہی تھیں کہ جانے کون ہے؟

بیگم زیدی نے انہیں پکارا اور بیگم اشرف ان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ وہ پوچھ رہی تھیں۔ ان کی بات کا جواب دے کر جب انہوں نے رخ پھیرا تو ان کی آنکھیں پھیل سی گئیں۔ حیرانی آنکھوں سے چھلک چھلک پڑ رہی تھی۔

ان کی بیٹی کے چہرے پر مسرت وحیا کی لہریں رقص کر رہی تھیں۔ حسین آنکھیں شوخی سے جگمگا رہی تھیں۔ نوجوان کی طرف شرمیلے انداز میں اس کا دیکھنا اور پھر نگاہیں جھکا لینا بے معنی نہ ہو سکتا تھا۔ اجنبی نوجوان کے چہرے پر مسرت و کیف آور احساس بھی ان کی باریک بین نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔

''یہ نوجوان کون ہے؟'' تجسس انہیں بے چین کر رہا تھا۔ آخر انہیں تجسس کیوں نہ ہوتا۔ ان کی بیٹی مخلوط پارٹیوں میں شرکت سے کتراتی تھی۔

ماں کے ملاقاتی لوگوں سے کبھی ڈھنگ سے بات نہ کرتی۔ لیکن آج یہ سب کیا ہے؟ عمر اور عامر بھی اٹھ کر بہن کے پاس چلے گئے تھے۔ جانے شیبہ نوجوان سے اتنے پیارے انداز میں کیا کہہ رہی تھی جسے وہ غایت دلچسپی سے سُن رہا تھا۔ شاید بھائی کا تعارف کروا رہی تھی۔

اب نوجوان عمر سے ہاتھ ملا رہا تھا۔ دلآویز سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ اطوار شاہانہ انداز کے حامل تھے۔

''اس کا کلاس فیلو تو نہیں ہے۔'' انہوں نے سوچا اور پھر جب نہ رہ سکیں تو اٹھ کر ان کے پاس گئیں۔ عطیہ نے تعارف کرانا ضروری سمجھا۔

''آنٹی یہ ڈاکٹر منیب فرخ ہیں۔ جنہوں نے کراچی میں شیبہ کا علاج کیا تھا۔''

ڈاکٹر منیب فرخ ان کے دماغ میں یہ نام پوری شدت سے گونجا۔ منیب اسما کی دوست کا بھانجا۔ اسما۔ اسما۔ یہ نام ان کے ذہن میں کھلبلی مچا گیا۔

عطیہ منیب کو بیگم اشرف کے متعلق بتا رہی تھی۔

"اور یہ ہیں آپ کے مریض کی مم بیگم فریدہ اشرف"۔

منیب نے قدرے جھکتے ہوئے انہیں آداب کیا۔چند لمحے ہی کھڑی ہوئیں مزید وہاں ٹھہرنے کی تاب نہ تھی ۔واپس اپنی جگہ آ گئیں۔

"بیگم اشرف یہ نوجوان کون ہے؟" بیگم زیدی متاثر ہوتے ہوئے بولیں۔

"میری نند کی دوست کا بھانجا۔"انہوں نے زہر یلے لہجے میں کہا۔

وہ لوگ کرسیاں گھسیٹ کر وہیں بیٹھ گئے۔بیٹی کا چہرہ خوشی سے دمکتا دیکھ کر بیگم اشرف کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی تھی۔'تو کیا مجھے یہاں بھی شکست ہوگی۔کیا اس کی شادی میری خواہشات کے مطابق نہ ہو سکے گی۔کیا میں جو چاہوں گی وہ نہ ہو سکے گا۔میں اسے سیم وزر کے محلوں کی رانی بنانا چاہتی ہوں۔اس تخت پر بٹھانا چاہتی ہوں جو سینکڑوں مربع اراضی میں پھیلا ہوا ہے۔ایک ایسے انسان کی رفیقہ حیات بنانا چاہتی ہوں جو خوبرو ہونے کے ساتھ ساتھ وسیع جائیداد کا تنہا وارث بھی ہے۔

"لیکن یہ سب کیا ہونے والا ہے؟'ان کے ذہن میں طوفانی لہریں اٹھنی شروع ہو گئی تھیں۔کیا میرے خواب بکھر جائیں گے۔میری تمنائیں پھر نیلام ہوں گی۔میری خواہشات پھر ملیا میٹ ہو جائیں گی۔"

"میری نظروں میں دولت کی کوئی اہمیت نہیں۔" بیٹی کے الفاظ بھرپور تلخی لیے آج ایک بار پھر ان کے کانوں میں گونجے۔دوسرے ہی لمحے ان کے چہرے پر خفگی اور رعونت عود کر آئی۔

"بکواس کرتی ہے وہ۔عمر کا یہ جذباتی دور جب ختم ہو جائے گا تب پیسے کی حقیقت معلوم ہوگی۔"خود سے بڑبڑائیں۔

"یہ سب ان کی گہری چالیں ہیں۔"

"ممی انسانی کردار ہر چیز پر مقدم ہے۔"انہیں بیٹی کے الفاظ یاد آئے۔"

"آج اس فلسفے کی حقیقت مجھ پر کھلی ہے۔" آج یہ امر مجھ پر منکشف ہوا ہے یہ شیبہ کی

نہیں اسما کی زبان ہے۔''

اسما انہوں نے ایک کرب سے سوچا۔

''اسما جس نے میری زندگی تلخ بنا ڈالی ہے۔اس میں زہر گھول دیا ہے۔''

جوش غضب سے رخسار دہک رہے تھے۔دل چاہ رہا تھا کہ وہ بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر اسے وہاں سے گھسیٹ لائیں۔

''نہیں'' انہوں نے خود پر فوراً قابو پا لیا۔کوئی بھی جذباتی فعل مجھے پشیماں کرے گا۔ میرے عزائم میں رخنے ڈالے گا۔ان کی بھی ساری چالیں میں نے اگر نہ توڑیں تو میرا نام بھی فریدہ نہیں۔''

ان کے دل میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔وہ حالات کا عمیق جائزہ لینا چاہتی تھیں۔شک و شبہات کو پرکھنا چاہتی تھی اور یہ تبھی ہو سکتا تھا جب وہ اپنی کسی حرکت سے شک کا اظہار نہ کریں۔

خاصا وقت گذر گیا۔جانے وہ لوگ کدھر تھے۔اچانک انہوں نے اپنے دائیں ہاتھ دیکھا۔وہ سب لوگ دائرے کی صورت میں کھڑے تھے۔نوجوان عمر سے جانے کیا کہہ رہا تھا؟ جس کے جواب میں عمر مسکرا کر اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔اور عامر بری طرح ان سے لپٹا ہوا تھا۔

''میرے بچے! انہوں نے تلخی سے سوچا۔

''اتنے بدھو۔اتنے پاگل کمبخت سب باپ پر گئے ہیں۔جہاں کسی نے ذرا پیار دکھایا۔ بس اسی پر ریجھ گئے۔اسی کے ساتھ اٹھ کر چلتے بنے۔''

گھر آ کر بھی وہ سوچوں کے عمیق سمندر میں غوطے لگاتی رہیں۔پریشان ہوتیں رہیں۔ کھولتیں رہیں۔

اگلے دن شام کو وہ برآمدے میں بیٹھی پڑھ رہی تھیں۔دردناک کہانی میں ڈوبی ہوئی تھیں کہ عمر کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

''ہم میچ دیکھنے جا رہے ہیں ممی۔رات کو آئیں گے۔''

وہ چونک اٹھیں ۔ برق کی طرح دماغ میں ایک خیال پیدا ہوا ۔ ان کی طرف اس وقت تک دیکھتی رہیں جب تک کہ شیبا اور عمر کار میں بیٹھ کر چلے نہ گئے ۔

فوراً انھیں لباس تبدیل کیا اور باہر نکل آئیں ۔ وہ ان کا تعاقب کرنا چاہتی تھیں ۔ شک ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ وہ لوگ اسی ڈاکٹر کے ساتھ گئے ہوں گے ۔ ابھی برآمدے میں ہی تھیں کہ بیگم وسیم کی کار گیٹ میں داخل ہوئی ۔ وہ ان کی گہری دوست تھیں ۔ لیکن آج پہلی مرتبہ انہیں شدت سے ان کی آمد پر ناگواری کا احساس ہوا ۔ مگر چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ لاتے ہوئے انہیں خوش آمدید کہنا پڑا ۔ دو گھنٹوں بعد جب وہ رخصت ہوئیں تو وہ کار میں تیزی سے سٹیڈیم بھاگیں ۔

سٹیڈیم ویران پڑا تھا ۔ ''وہ لوگ کہاں گئے ہوں گے ۔ شاید پکچر چلے گئے ہوں'' ۔ انہوں نے بے چینی سے سوچا ۔

یونہی گاڑی کا رُخ موڑ دیا ۔ کار اب مال روڈ پر خراماں خراماں چلی جا رہی تھی ۔ نگاہیں اِدھر اُدھر کبھی کبھی بھٹک جاتیں ۔

یکدم چونک اٹھیں ۔ بائیں طرف ان کی مورس کھڑی تھی جس کے قریب ہی شیبا اور نوجوان کھڑے باتوں میں مصروف تھے ۔ عمر جانے کہاں تھا ۔ شاید کچھ خریدنے کے لیے دکان کے اندر گیا ہوا تھا ۔

''شک وشبہ کی کیا گنجائش تھی ۔ یہ تو میرا پاگل پن تھا ۔ جو کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی اس پر یقین کرنے میں متذبذب تھا ۔''

وہ گھر کی طرف لوٹتے ہوئے سوچ رہی تھیں ۔

رگ رگ میں انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے ۔

''کیا کیا جائے؟ وہ تکیے پر سر رکھتے ہوئے خود سے بولیں ۔ کتنے ہی منظر نگاہوں کے سامنے آئے اور چلے گئے یکدم وہ تڑپ کر اٹھیں ۔

''نہیں نہیں یہ خنجر اب میرے سینے کی بجائے اسما کے سینے میں گھونپا جائے گا ۔''

آنکھیں جل رہی تھیں ۔مٹھیاں بھینچ گئیں تھیں ۔اعصاب پر شدید دباؤ تھا چہرہ سرخ تھا ۔دیوانہ وار وہ کمرے میں ٹہل رہی تھیں ۔خوفناک عزائم بیدار ہو گئے تھے ۔ڈاکٹر اشرف جرمنی میں ہیں ۔خالد رسالپور میں عمر یہاں میرے پاس ہے ۔ہاشم یورپ سے واپس آچکا ہے ۔

میں ابھی ہاشم سے ملتی ہوں ۔" کہتی ہوئی وہ کمرے سے باہر نکل گئیں ۔"

باب نمبر: 40

سفید شیورلیٹ تارکول کی لمبی سیاہ سڑک پر تیزی سے بھاگی جا رہی تھی۔اطراف میں دودھیا ٹیوبوں اور بلبوں کی زرد روشنی سڑک کی سیاہی کو کچھ اور بھی نمایاں کر رہی تھی۔کار چلاتے ہوئے بیگم اشرف سوچ رہی تھیں۔کہ آیا وہ ہاشم ولا کی طرف مڑ جائیں یا سیدھی کلب پہنچیں۔لیکن یہ سوچتے ہوئے کہ وہ آج کل کلب میں زیادہ نہیں جا رہا ہے۔انہوں نے اپنا رخ بدل لیا۔تھوڑی دیر بعد وہ ہاشم کی محل نما کوٹھی میں داخل ہو رہی تھیں۔کار رکی اور باہر نکلتے ہوئے انہوں نے ایک بھرپور نظر کو محل کے درودیوار پر ڈالتے ہوئے خود سے کہا۔

''شیبہ تمہیں کیا احساس کہ میری ممتا تمہارے لیے کیا چاہتی ہے؟ میں تمہیں ان بلند ایوانوں کی شہزادی بنانا چاہتی ہوں۔''

کال بیل کی تیز آواز پر نوکر باہر آیا اور یہ جان کر کہ ہاشم گھر پر ہی ہے انہیں بے پایاں طمانیت کا احساس ہوا۔سکون سے ایک لمبی سانس بھرتے ہوئے انہوں نے نوکر سے ہاشم کو اطلاع دینے کے لیے کہا۔خادم انہیں گول کمرے میں بٹھا کر اندر چلا گیا۔چند لمحے گذرے ہوں گے، ہاشم دبیز پردے ہٹاتا کمرے میں داخل ہوا اور بیگم اشرف پر نظر پڑتے ہی خوشی سے چلا اٹھا۔

''رہنے دو یہ دکھاوے کی باتیں۔تمہیں یورپ سے آئے ہوئے ہفتہ بھر ہو رہا ہے اتنا نہ ہوسکا آکر مل ہی جاتے۔'' بیگم اشرف نے کسی قدر شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

''بخدا یقین کریں آنٹی ڈیئر! میں تو آج کل مصیبت میں پھنسا ہوا ہوں ۔کہیں ٹی ہے تو کہیں ڈنر اور کہیں لنچ ان چکروں میں ایک لمحے کے لیے بھی فرصت نہیں ہے ۔کلب بھی باقاعدگی سے نہیں جا رہا ہوں ۔میرا ارادہ کل آپ کے گھر آنے کا تھا ۔میں شیبہ اور بچوں کے لیے کچھ تحائف لایا تھا ۔''

وہ بچھا جا رہا تھا ۔خوشی سے اس کے نتھنے پھول رہے تھے ۔

''باتیں بنانے میں تو تمہارا جواب نہیں ہاشم! اب یوں بہانے بازیاں کر کے مجھے بہلانے کی کوشش کر رہے ہو ۔جیسے میں کوئی بچہ ہوں ۔''

''نہیں نہیں آنٹی آپ مجھ سے ایسی گستاخی کی توقع رکھتی ہیں دراصل آپ غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی ہیں ورنہ آپ تو مجھے بے حد عزیز ہیں ۔اتنی آنٹی کہ الفاظ اسے ظاہر کرنے کے لیے کافی نہیں ۔دراصل فرصت میں آپ کے ہاں آنا چاہتا تھا ۔''ہاشم نے بیگم اشرف کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا ۔

اور پھر وہ کتنی ہی دیر تک انہیں یورپ کے قصے سناتا رہا ۔پیرس کے ناچ گھروں کی تفصیلات بتاتا رہا ۔تبھی چائے آ گئی ۔چائے کا ہلکا سا گھونٹ لیتے ہوئے بیگم اشرف بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں ہاشم سے مخاطب ہوئیں ۔

''ہاشم ہمارے درمیان تکلفات کے پردے حائل نہیں بلکہ خوشگوار احساسات موجود ہیں ۔تم مجھے اپنے بچے سے کم عزیز نہیں ۔آج میں سخت ذہنی کشمکش اور تذبذب کا شکار ہوں ۔کچھ سمجھ نہیں آ رہا ۔کیا کروں؟''اتنا کہہ کر وہ قصداً ایک ثانیہ کے لیے رکیں ۔

''ہاشم نگاہوں میں حیرانی لیے فوراً بول اٹھا ۔آپ کیسی پریشانی اور مشکل سے دوچار ہیں آنٹی؟ مجھے بتایئے یقیناً آپ مجھے کسی سے پیچھے نہ پائیں گی ۔''

''تمہارے خلوص سے مجھے یہی توقع تھی ۔لیکن جن خطوط پر تم سوچ رہے ہو ۔خدا کا شکر ہے ایسی کوئی بات نہیں ۔میرے تفکر کی وجہ کچھ اور ہے اور اسے میں تم سے پوشیدہ نہ رکھوں گی ۔بات

دراصل یہ ہے ۔" انہوں نے لہجہ دھیما کر دیا اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولیں۔

"شیبہ کے لیے اتنے لوگ آج کل تقاضہ کر رہے ہیں کہ میں پاگل ہوئی جا رہی ہوں۔ اس وقت تقریباً تیس چالیس کے قریب بڑے بڑے رشتے آئے ہوئے ہیں اور ستم یہ کہ وہ اس سلسلے میں جلدی بھی چاہتے ہیں۔ان کی آئے دن کی آمدورفت نے میرے تو حواس اڑا دیئے ہیں۔" اتنا کہہ کر وہ رکیں اور یہ وقفہ کافی تھا۔ہاشم فوراً بول اٹھا۔

"آنٹی شیبہ پر سب سے زیادہ حق میرا ہے۔پچھلے تین سال سے میں آپ سے تقاضہ کر رہا ہوں۔شیبہ میری زندگی ہے۔میری روح ہے۔اگر آپ نے مجھے نظر انداز کر دیا تو میں مر جاؤں گا۔ختم ہو جاؤں گا۔"

وہ روہانسا ہو رہا تھا۔گہرے اضطراب سے بار بار ہاتھوں کو مسل رہا تھا۔

عیارانہ مسکراہٹ بیگم اشرف کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ بڑی مکاری سے بولیں۔

"پاگل لڑکے اگر میں تمہارے جذبات سے آگاہ نہ ہوتی اگر مجھے تمہارے احساسات کی قدر نہ ہوتی تو میرا یہاں آنے اور اس ساری حقیقت سے تمہیں مطلع کرنے کا مطلب کیا تھا؟ میں نے کسی فریب اور دھوکے سے کام نہیں لیا۔بلکہ ساری بات تمہارے سامنے رکھ دی ہے۔تاکہ تم کل یہ نہ کہہ سکو کہ آنٹی نے میرے احساسات کو پس پشت ڈال کر شیبہ کا ہاتھ کسی اور کے ہاتھ میں تھما دیا ہے۔"

"اس عنایت کے لیے آپ کا ممنون ہوں آنٹی! لیکن آپ کا ارادہ کیا ہے اب؟ یہ بات میرے علم میں آنی چاہیے۔"

ہاشم کے لہجے میں اتنی بے چینی تھی کہ بیگم اشرف دل ہی دل میں مسکرا اٹھیں۔

"مجھے تو ایک ہی صورت قابلِ عمل نظر آ رہی ہے کہ نکاح فوری طور پر ہو جائے تاکہ یہ جو اتنے لوگ میری تکا بوٹی کر رہے ہیں۔ان سے خلاصی ہو۔رخصتی شیبہ کے امتحان سے فارغ ہونے

کے بعد۔'' سنجیدگی سے بیگم اشرف نے کہا۔

''ونڈرفل آنٹی!'' ہاشم نے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ آپ بہت عظیم ہیں آپ نے موتیوں سے میرا دامن بھر دیا ہے۔'' وہ خوشی سے نہال ہو رہا تھا۔

''لیکن ایک بات میں تم سے ضرور کہوں گی، اب یہ شراب نوشی اور لڑکیوں کے چکر چھوڑ دو۔ خالدا ور عمر کی رائے تمہارے متعلق اتنی اچھی نہیں۔'' بیگم اشرف نے کہا۔

''شیبہ کے لیے ہر چیز قربان کی جا سکتی ہے آنٹی۔''

''آج بائیس ہے، نکاح کے لیے انتیس تاریخ ٹھیک رہے گی۔'' انہوں نے ہاشم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا؟

''بالکل ٹھیک!'' اس نے جواباً کہا۔

لیکن یہ بات مدِنظر ہے کہ یہ سب مراحل رازداری سے ہی طے ہوں۔ کیونکہ رشتہ طلب کرنے والوں میں ڈاکٹر صاحب کے بھی عزیز ہیں۔ بات پھیل گئی تو وہ لوگ کوئی نہ کوئی طوفان ضرور اٹھائیں گے...... ٹھیک ہے نا؟''

''جیسے آپ مناسب سمجھتی ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' ہاشم نے حد درجہ سعادت مندی سے کہا۔

''اچھا باقی باتیں پھر۔ میں اب چلتی ہوں۔''

ہاشم جب بیگم اشرف کو رخصت کر کے اپنے کمرے میں آیا تو خوشی سے جھوم رہا تھا۔ آج تو اس پر بن پیے مستی چھا رہی تھی۔ آج تو مے کی کوئی ضرورت نہیں۔ شیبہ کا خیال ہی کسی تیز شراب سے کم نہیں۔ آہ ملکوتی حسن والی ساحرہ! آسمانی حور، وینس کی شہزادی اتنا پاکیزہ حسن کبھی دیکھنے میں نہیں آئے گا۔ وہ اس پھول کی مانند ہے جو اپنی تمام تر پاکیزگیوں سے باغ زیست میں نیا نیا کھلا ہو، جو گلچیں کے لمس سے ناآشنا ہو۔ جسے کسی نے سونگھا تک نہ ہو۔ جس کی بھینی بھینی مدہوش کن خوشبو زندگی کے لیے طروات کا احساس لیے ہوئے ہو۔'' شیبہ تم یقیناً ایک ایسا ہی خوشنما پھول

ہو۔' اس کا حسین غصے سے تلملایا ہوا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے آ گیا ۔کنول جیسی خوبصورت آنکھیں ۔تصور میں ابھر رہی تھی تھیں ۔

''آہ ان حسین آنکھوں کی پنہائیوں میں ڈوب کر میں کبھی ابھرنے کی تمنا نہ کروں لیکن غصیلی بہت ہے ۔'' اوہ! کوئی بات نہیں ۔حسین لوگوں کے ناز اٹھانے ہی پڑتے ہیں ۔ نزاکت کا بار سہنا ہی پڑتا ہے ۔یہ عشق و عاشقی کی ریت ہے ۔اس کے بغیر حسن مکمل نہیں اور عاشقی خام ہے ۔''

نگاہوں کے زاویے بدل رہے تھے ۔ان لاتعداد لڑکیوں کے چہرے تصور میں اُبھر رہے تھے ۔جو آج بھی اس کے خوشگوار وعدوں پر ایمان رکھتے ہوئے خود کو لٹا رہی تھیں ۔ان دنوں کے انتظار میں تھیں جب وہ اس کے کاشانے میں دلہن بن کر آ سکیں ۔لیکن اسے ان کے خوابوں اور تمناؤں سے کوئی سروکار نہ تھا ۔وہ اپنا مطلب حل کر چکا تھا ۔راہیں کھلی تھیں اور ہاتھ نئے شکار کی تلاش میں بڑھ رہے تھے ۔بیگم اشرف کہہ رہی تھیں ۔

لڑکیوں اور شراب نوشی کے چکر کو ختم کرو ۔خالد اور عمر کی رائے اچھی نہیں'' ۔

ایک بلند و بانگ قہقہہ فضا میں اُچھلا ۔شیطانی مسکراہٹ چہرے پر نمودار ہوئی ۔''شراب چھوڑ دوں جو میری روح ہے ۔جس کا جام ہونٹوں سے لگتے ہی میں سرور کے ایک ایسے انوکھے جہاں میں پہنچ جاتا ہوں ۔ جہاں کوئی غم مجھے پریشان نہیں کرتا ۔آہ بیگم اشرف تم نے مجھے شراب چھوڑنے کو کہا ہے کیا کہوں ۔یہی کہہ سکتا ہوں ظالم تو نے کبھی پی ہی نہیں ۔لڑکیوں سے ملنا چھوڑ دوں جو میری زندگی ہیں ۔بھونرا بھی کبھی ایک پھول پر قناعت کر سکتا ہے ۔شراب اور حسن لطیف بھلا کون پاگل ان چیزوں سے کنارہ کشی کر سکتا ہے؟

باب نمبر: 41

ادھر بیگم اشرف بے انتہا خوش تھیں کہ ایک مرحلہ تو بخیر و خوبی طے ہوا۔ اب ان کے سامنے دو بڑے پتھر تھے۔ ایک عمر اور دوسرا شیبہ جن میں سے ایک کو ہٹانا اور دوسرے کو موم کرنا تھا۔ شیبہ کو اپنی راہ پر لانا وہ اتنا مشکل نہ سمجھتی تھیں۔ اسے وہ اپنی ممتا کا واسطہ دے کر مجبور کر سکتی تھیں۔ گریہ وزاری کرتے ہوئے اشک بہاتے ہوئے۔ ''وہ ایک لڑکی ہے جو زیادہ دیر اپنی ہٹ دھرمی پر قائم نہیں رہ سکتی۔ نکاح ہونے کی دیر ہے۔ میں اسے آہستہ آہستہ اپنے شیشے میں اتار لوں گی۔ اس طرح کہ کسی کو بھی کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہ رہے گی۔ لیکن اس نے عین وقت پر انکار کر دیا تو؟''

خوفناک اندیشہ سانپ بن کر لہرا اٹھا۔

''نہیں نہیں وہ ایسا کبھی نہیں کر سکے گی۔ اسے میرے ارادوں کے سامنے جھکنا ہی پڑے گا۔ اسی میں عافیت ہے۔ میں اس کو جھکا لوں گی۔''

''یہ ظلم ہے اگر اس نے تمہارے ظلم کے ہاتھوں تنگ آ کر خودکشی کر لی تو اس کا خون تمہاری گردن پر ہوگا۔ تم اس کی قاتل ہوگی۔ بیٹی کی قاتل، قاتل، قاتل، وہ ہاشم سے شادی کرنے پر کبھی تیار نہ ہوگی۔ یہ اس پر ظلم ہوگا۔ ظلم قاتل، قاتل ضمیر شدت سے چلایا۔ انہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ نہیں نہیں انہوں نے ضمیر کی آواز کو تھپک تھپک کر سلانا چاہا۔ وہ لرز رہی تھیں، کانپ رہی تھیں، تنفس بے حد تیز ہو رہا تھا۔

''اسما'' ان کا ذہن چلایا۔کانپنا ختم ہو گیا۔آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔

''مجھے یہ سودا منظور ہو گا۔مجھے اس کی قاتل بننا قبول ہے۔''انہوں نے چیخ چیخ کر ضمیر کی آواز کا جواب دیا۔

''وہ مر جائے گی تو مر جائے۔میں صبر کر لوں گی اس نئے غم سے سمجھوتہ کر لوں گی۔لیکن ان لوگوں کے عزائم پورے ہوں، وہ لوگ اپنی من مانی کریں یہ مجھے ہرگز گوارا نہیں۔اب میں مزید کوئی خلش کوئی چبھن اپنانے کے لیے تیار نہیں۔میرے سینے کے زخم جواب ناسور بن گئے ہیں......ان پر، مزید چرکے نہیں لگیں گے۔مزید نمک نہیں چھڑکا جائے گا۔اس کا نکاح ہاشم ہی سے ہو گا۔یہ میری زندگی کا اٹل فیصلہ ہے۔خودکشی اتنی آسان نہیں جتنا ہم سمجھتے ہیں۔زندگی تلخ ہونے کے باوجود بھی بہت پیاری ہے اگر پیاری نہ ہوتی تو میں کبھی کا یہ طوق گلے سے اتار پھینکتی۔مرنے کی خواہش کی لیکن مر نہ سکی۔ہر بار دنیا کی رنگینیوں نے کھینچ لیا۔زہر پینا چاہا پیا نہ گیا۔گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالنا چاہا لیکن ڈالا نہ گیا۔مرنا جینے سے بھی مشکل ہے۔کون کہتا ہے کہ موت آسان ہے۔

کتنی ہی دیر تک ان پیچیدگیوں میں کھوئی رہیں۔آخر حقیقی مسئلہ انہیں پھر میدان عمل میں گھسیٹ لایا۔

''عمر کو کیسے راہ راست پر لایا جا سکتا ہے۔''انہوں نے خود سے کہا۔

اگر اُسے ساری صورت بتا دی جائے تو کیا وہ تعاون کرے گا۔''ان کے ذہن نے سوال اٹھایا۔لیکن فوراً ہی ان کے دونوں ہاتھ کانوں پر پہنچ گئے۔

تو یہ اُسے بتا کر راستے میں کانٹے بونے والا حساب ہو گا۔'' اس کے یہ الفاظ کانوں میں گونجنے لگے۔

''ہاشم جیسے ذلیل لوگ انسانیت کی پیشانی پر ایک بدنما دھبہ ہیں۔ایک داغ ہیں۔''

بیٹے کے یہ الفاظ اس کی قلبی نفرت کو ظاہر کرنے کے لیے کافی تھے۔وہ اسے آوارہ

بدمعاش اور جانے کیا کیا سمجھتا ہے؟ وہ کیسے رضامند ہو گا؟ کبھی نہیں ۔ میں سوچوں گی کیا ہونا چاہیے؟ وقت دیکھا رات کا ایک بج رہا تھا۔ وہ سو گئیں ۔صبح اٹھیں تو سوچوں نے پھر گھیر لیا۔ اور دن کے دو بج رہے تھے۔ سوچتے سوچتے یہ وقت آ گیا تھا۔ لیکن دماغ بے بس ہو رہا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ نوکر ڈاک لے کر آیا۔ سب سے اوپر خالد کا خط تھا۔ پڑھا تو تفکر میں ڈوبا چہرہ چمک اٹھا۔ چٹکی بجاتے ہوئے خود سے بولیں ۔

''خدا کو یہ سنجوگ منظور ہے تبھی راہیں ہموار ہو رہی ہیں ۔'' خالد نے کچھ چیزیں فوری طور پر لے جانے کے لیے لکھا تھا۔ اسی وقت وہ بازار گئیں ۔ ڈھیروں چیزیں خرید لائیں ۔ خالد کے لیے مطلوبہ چیزیں اور پشاور میں مقیم اپنی بڑی بہن کے بچوں کے لیے .... وہ عمر کو وہاں بھی بھیجنا چاہتی تھیں ۔ تا کہ وہ بعد میں اس کٹھن کام کو اطمینان سے سر انجام دے سکیں ۔

باب نمبر: 42

وہ پچھلے ایک دو دن سے بڑی پریشان سی تھی ۔ یوں جیسے کوئی انہونی بات ہونے والی ہو اور آج تو صبح سے ہی اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔

''یہ سب کیا ہے؟ یہ اتنی بے چینی مجھے کیوں محسوس ہو رہی ہے؟ یہ کیا ہونے والا ہے؟''

کھڑکی کے پٹ سے سر ٹکا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں ۔ طائرِ خیال قلانچیں بھرنے لگا۔سینکڑوں میل کے فاصلے آنِ واحد میں سمٹ گئے اور اس نے خود کو منیب کے پاس بیٹھا ہوا محسوس کیا۔

ادھر ہاشم صبح سے تین چار مرتبہ بیگم اشرف کو فون کر چکا تھا۔لیکن وہ جانے کہاں تھیں؟ پچیس تاریخ کی شام آن پہنچی تھی اور ابھی تک اُس نے دلہن کے لیے کوئی کپڑا زیور تک نہیں خریدا تھا۔ہوسکتا ہے کوئی چیز آرڈر پر تیار کروانے کی ضرورت پیش آ جائے ۔اس خیال کے تحت ہاشم نے سوچا مجھے اشرف لاج جانا چاہیے ۔شیبہ کو ساتھ لے کر میں بازار چلا جاؤں گا اور اس کی پسند کے ملبوسات اور زیور خرید لیے جائیں گے۔

اشرف لاج آ کر جب اس نے بیگم اشرف کے متعلق دریافت کیا تو وہ موجود نہ تھیں ۔ شیبہ کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ اپنے کمرے میں ہے ۔دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔سوچ رہا تھا۔بیگم صاحبہ کا غصہ ہمیشہ ناک پر رہتا ہے۔لیکن آج تو میرا استقبال شرمیلے انداز میں کریں

گی۔ دروازے کا پردہ ہٹا کر کمرے میں داخل ہوا۔ سامنے شیبہ کھڑکی کے پٹ سے سر ٹکائے آنکھیں بند کیے کچھ سوچ رہی تھی؟

اُسے اس حالت میں دیکھ کر ہاشم بے اختیار مسکرا اٹھا۔

''تصورات کی دُنیا میں کھوئی ہوئی ہیں۔'' ذرا آگے بڑھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

''بیگم صاحبہ خوابوں کی دنیا سے جاگ جایئے۔''

غیر مانوس سی اس مردانہ آواز پر شیبہ نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور ہاشم کو اپنے سامنے شیطانی مسکراہٹ لیے دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرانی اور وحشت سے پوری طرح پھیل گئیں۔ متحرک آنکھوں کی پتلیاں ایک جگہ ساکت ہوگئیں، دل دھڑکنا بھول گیا۔

''یہ میرے کمرے میں کیسے آگیا ہے؟'' کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔ ابھی تک وہ ویسے ہی پلک جھپکائے بغیر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''شیبہ تم اتنی حیران کیوں ہو؟'' ہاشم اس کی حد درجہ حیرانی پر بوکھلا گیا۔

اور یہ آواز اسے حیرانی کی دنیا سے کھینچ کر عمل کی دنیا میں لے آئی۔ اسے احساس ہوگیا تھا کہ وہ خواب نہیں دیکھ رہی بلکہ عین حقیقت ہے۔ ایک ایسی ٹھوس حقیقت جس سے انحراف ممکن نہ تھا۔ یک لخت وہ تڑپ اٹھی۔ آنکھوں سے چنگاریاں اٹھنے لگیں۔ ایک شدید جھٹکا اس نے اپنے جسم کو دیا اور فرطِ غضب سے چلائی۔

ذلیل انسان؟ تم میں اتنی جرات کیسے پیدا ہوئی؟''

''شیبہ اتنا طیش میں آنے کی ضرورت نہیں۔ ایسے نازیبا الفاظ اپنی زبان سے مت نکالو جن پر تمہیں بعد میں نادم ہونا پڑے۔''

''یہ دھمکیاں! آنکھوں پر جو پٹی بندھی ہوئی ہے۔ اسے اتار کر دیکھو تمہارا مخاطب کون ہے اور تم کس سے ہمکلام ہو؟'' اس کی آواز میں گرج تھی پہاڑوں جیسی سختی تھی۔

''ملکہ حسن کی بارگاہ میں حاضر ہونے سے قبل ہی پٹی اتاری جاچکی ہے۔''

''بکواس بند کرو۔ میں یہ پوچھتی ہوں یہاں تم کس کی اجازت سے آئے ہو؟'' وہ ایک بار پھر چیخی۔

''میں یہاں تمہاری والدہ محترمہ کی اجازت سے آیا ہوں۔ وہ انتیس تاریخ کو تمہیں اس ذلیل انسان کی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتی ہیں۔''

اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

بم پھٹا۔ ریزے اڑے اور سیدھے اس کے دل میں تیر کی طرح جا لگے۔ ننھا منا معصوم دل پھٹ ہی تو گیا۔ وہی چہرہ جو تھوڑی دیر قبل غیظ و غضب سے سرخ ہو رہا تھا یک لخت پیلا پڑ گیا۔ دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں۔ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ یکدم وہ وحشی چیتے کی طرح غرائی۔

''تم بکواس کرتے ہو'' کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ پیپر ویٹ اٹھا کر اس نے اس قدر زور سے ہاشم کی طرف پھینکا کہ اسے مدافعت کا موقع بھی نہ مل سکا۔ پیپر ویٹ اس کے بازو پر لگا اور وہ بھنا اٹھا۔

''تمہارا دماغ میں ایسا درست کروں گا کہ تم مدتوں یاد کروں گی کہ کس سے واسطہ پڑا تھا'' اس کی آنکھیں اُبلی پڑ رہی تھیں۔

''دور ہو جاؤ اپنی منحوس شکل لے کر یہاں سے، ورنہ میرے نوکر ابھی تمہارا قیمہ بنا ڈالیں گے۔'' وہ غضب سے چلائی۔ قہر کی نگاہوں سے اُسے گھورتا ہوا ہاشم کمرے سے باہر نکل گیا۔

''یہ سب چکر ہے۔ فراڈ ہے مجھے دھوکہ کیوں دیا گیا ہے؟ نکاح انتیس تاریخ کو ہو رہا ہے اور اس بد دماغ لڑکی کے علم میں یہ بات تک نہیں لائی گئی۔ ایسی سرکش لڑکی! میرے تو ایک ادنیٰ اشارے پر حسن قدموں پر سرنگوں ہو جاتا ہے۔ باز آیا میں ایسی لڑکی سے ......'' کار تیزی سے سڑک پر بھاگی جا رہی تھی اور وہ خود سے باتیں کرتا چلا جا رہا تھا۔

شیبا ابھی تک ویسے ہی کھڑی تھی۔ دل اس بدنصیب زخمی کی طرح سسک رہا تھا جسے کسی زہریلے ناگ نے اچانک ڈس لیا ہو۔ پیر کو پلنگ کی پٹی پر زور سے مارتے ہوئے اس نے

اپنے گرد وپیش پر نگاہ ڈالی ۔بالکل یوں لگ رہا تھا۔جیسے آسمان پھٹ گیا ہو۔زمین ......زلزلوں سے ٹوٹ پھوٹ گئی ہو۔

''یہ کیا ہو گیا ہے؟ کیا ہو گیا ہے؟''اس نے دیوانوں کی طرح آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔

''میں جل رہی ہوں ۔میری آرزوئیں اور تمنائیں جل رہی ہیں ۔میرا خرمن امید شعلوں کی زد میں ہے ۔کوئی مجھے بچائے ۔مجھے بچائے ۔اس اذیت سے بچائے ۔ مجھے یہاں سے ایسی جگہ لے جائے ۔جہاں میں ان خودغرض انسانوں کی شکلیں تک نہ دیکھوں ۔جو اپنے ہی جگر کے ٹکڑوں کو نیلام کرتے ہیں ۔ان کی امیدوں کا خون کر دیتے ہیں ۔آہ یہ خوفناک آگ مجھے بھسم کر ڈالے گی۔''

دھڑام سے فرش پر گر گئی۔سر پھٹ گیا۔خون نکلتا رہا۔تقریباً دو گھنٹوں تک وہ فرش پر بے ہوش پڑی رہی ۔بنکو چائے لے کر اوپر آئی تو اسے یوں بے ہوش پڑا دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں ۔چائے کی ٹرے ہاتھ سے چُھٹ کر فرش پر آ رہی ۔قدموں کے نیچے سے زمین سرکتی محسوس ہوئی ۔بدحواسی سے اس کے قریب آئی ۔خون دیکھ کر تو دھاڑیں مار اٹھی ۔فوراً بیگم اشرف کو اطلاع دینے کے لیے بھاگی بھاگی آئی ۔ڈاکٹر کو بلوایا گیا ۔فوری طور پر طبی امداد دی گئی۔تین گھنٹے بعد جب وہ ہوش میں آئی تو بیگم اشرف کو اپنے پاس کھڑے دیکھا۔ ذہن تڑپ اٹھا۔بیگم اشرف نے دھیرے سے جھک کر اس کی پیشانی پر پیار کیا اور یہ پیار اسے مزید مضطرب بنا گیا۔گہرے کرب سے اس نے پیشانی پر ہاتھ پھیرا یوں جیسے کسی نے دہکتے ہوئے کوئلے رکھ دیئے ہوں ۔

ممتا کے جذبے میں جب خودغرضی کا عنصر شامل ہو جائے ۔یہ لازوال احساس جب دھوکہ دہی کی بھینٹ چڑھ جائے تو پیار بھرا لمس شبنم جیسی لطافت پیدا کرنے کی بجائے خون دل کے ایندھن میں جلتے ہوئے شعلے پیدا کرتا ہے۔

بیگم اشرف اس کی طبیعت کا پوچھ رہی تھیں ۔دل کا درد خون بن کر آنکھوں کی پتلیوں

میں جم گیا تھا۔ رونا چاہا لیکن رو نہ سکی ۔لرزتی ہوئی آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بے پناہ دکھ سے سوچا۔''آہ ابھی تو میری آرزوؤں کی رنگینیاں حسین سپنوں کی آنکھ میں انگڑائی لے کرلہرائی ہی تھیں ۔تمناؤں کے کنول پوری طرح کھل بھی نہ سکے تھے کہ انہیں مسل دیا گیا۔تیری دنیا کے باسی کتنے کٹھور ہیں ۔معبود! کتنے ظالم اور سنگدل ہیں ۔''وہ پھوٹ پھوٹ کررورہی تھی ۔

بیگم اشرف نے اسے یوں بلکتے دیکھا تو پیار سے اس کا سر تھام لیا۔ڈاکٹر جا چکی تھی ۔لوہا گرم تھا اور یہی وقت پھر چوٹ لگانے کا تھا۔وہ چاہتی تھی کہ وہ تڑپے روئے اور مچلے اور پھر بے بس ہو کرخود کو تقدیر کے حوالے کردے ۔

''میں مجبور تھی شیبہ بیٹے !میرے وعدے کا خیال کرو۔میں نے اسے تین سال سے زبان دے رکھی تھی ۔''

اُف آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اُس نے اوپر اٹھائیں ۔حسرت ویاس سے ان کی طرف دیکھا اور دردناک لہجے میں بولی ۔

''آپ کی زبان آپ کا وعدہ؟''

کس دُکھ سے وہ سوچ رہی تھی ۔لوگ تو کہتے ہیں کہ ماں اپنے بچوں کے لیے اپنی ہستی تک مٹا ڈالتی ہے ۔بچے کی آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو کا قطرہ ماں کے دل کو بےقرار بنا دیتا ہے۔وہ اولاد کے چہرے کو پھول کی طرح مسکراتا دیکھنا چاہتی ہے اور یہ مسکراہٹ ان کے چہروں پر پیدا کرنے کے لیے وہ کتنے جتن کرتی ہے ۔اپنی خواہشات کچل کر اولاد کے لیے خوشیاں خریدتی ہے دل سے اٹھتے ہوئے غموں کے دھویں کو مسکراہٹ کے پھریروں میں اُڑا دیتی ہے۔زندگی کے سمندر میں اٹھنے والے طوفانی لہریں اس کے پائے ثبات کو اکھیڑنا چاہتی ہیں لیکن ممتا کی لازوال تلوار سے وہ ہر مصیبت کو کاٹ ڈالتی ہے ۔مصائب کے بار کوخندہ پیشانی سے سہہ لیتی ہے ۔لیکن اولاد کے لیے یہ گوارا نہیں کرتی کہ وہ غم کی شاہراہ کے راہی بن جائیں ۔

''آپ کیسی ماں ہیں ممی؟ وہ چیخ اٹھی ۔جو مجھے قربانی کا بکرا بنا کر اپنے وعدے کا بھرم

رکھنا چاہتی ہیں۔آپ کیسی ماں ہیں جو میرے دل سے اٹھتی ہوئی آگ کے شعلوں کو دیکھ کر بھی خاموش ہیں۔میری آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے ان آنسوؤں کو دیکھ کر بھی چپ ہیں۔ممی یہ آنسو آپ کے دل کی دنیا میں ہلچل نہیں مچاتے۔آپ کا دل پتھر کا ہے۔پتھر کا۔'' وہ انہیں بُری طرح جھنجھوڑ رہی تھی۔بیگم اشرف بے چینی سے بیٹی کے آنسو بہتے دیکھ رہی تھیں۔جو موتیوں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے حسین رخساروں پر دوڑ رہے تھے۔یہ آنسو ان سے کچھ مانگ رہے تھے انہیں کچھ کرنے کا کہہ رہے تھے۔لیکن ان آنسوؤں کو بیٹی کے رخساروں سے پونچھنے کی قیمت بڑی مہنگی تھی۔انہیں اپنا دامن ندامت کے داغوں سے بھرنا پڑتا۔بیٹی کی کامیابی اسما کی کامیابی تھی اور اسما سے شکست کھانے کے لیے وہ کبھی تیار نہ تھیں۔انہیں شک ہی نہیں یقین تھا کہ اسما شیبہ کو گاؤں میں منیب سے ملاتی رہی ہے تا کہ تعلق کو فروغ دے کر وہ میرے مقابلے پر آ سکے۔

''تمہارا دماغ چل گیا ہے شیبہ! تمہیں جذبات نے اندھا کر دیا ہے۔کبھی سوچو گی تو احساس ہوگا کہ میں نے واقعی تمہارے لیے آکاش سے تارہ توڑا تھا۔ہاشم تو ہیرا ہے ہیرا۔میرے انتخاب پر یقیناً شیبہ تمہیں ایک دن فخر ہوگا۔''

ذہن سلگ رہا تھا۔وہ شکستہ لہجے میں بولی ''آپ ہیرا کہہ رہی ہیں وہ تو پتھر بھی نہیں ہے۔''

نفرت کے شعلوں پر ہر لحظہ پٹرول پڑ رہا تھا اور ان کی بھڑک میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔دل و دماغ جب پوری طرح اس کی لپیٹ میں آ گئے تو وہ انتہائی غضب سے چلائی۔

''آپ یہاں سے چلی جائیں ممی! چلی جایئے مجھے اس آگ میں جل جانے دیجئے میرا جل جانا ہی بہتر ہے۔''

بیگم اشرف نے نیچے آ کر نکو کو اس کے پاس بھیج دیا۔نڈھال ہو کر اس نے سر تکیئے پر رکھ دیا۔باوقار سا ایک چہرہ چپکے سے اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

''منیب''

وہ تڑپ اٹھی یوں لگا جیسے دل درد سے پھٹ جائے گا۔" میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔سچا اور پرخلوص وعدہ اب کیا کہو گے کہ میں نے تمہیں دھوکہ دیا کیا کروں؟ کیوں نہ اپنی زندگی کا خاتمہ کرلوں۔خاتمہ یعنی خودکشی۔" "نہیں، زندگی خدا کی ایک مقدس امانت ہے اور واپس لے لینے کا حق صرف اسی کو حاصل ہے۔" اس کے ضمیر نے آواز دی۔

"آہ لیکن میں کیا کروں۔مجھے راستہ دکھاؤ۔" اس نے تڑپ کر کہا۔

"خدا پر بھروسہ رکھو۔اس پر اعتماد کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔"

ضمیر کی اس آواز پر اس کی بے چینی اور بھی بڑھ گئی۔شکست خوردہ لہجے میں بولی۔

"میں نے اس پر اعتماد کیا تھا۔لیکن اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور مجھے ان تاریک راہوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا۔یہ بھی نہ سوچا کہ ایک لڑکی جس کا دل اتنا نازک ہے کیسے اتنے بڑے غم کو برداشت کر سکے گی۔"

"یوں اس خالقِ حقیقی کو دوش نہ دو۔عبد و معبود کے درمیان اعتماد کی دیوار کو ٹھیس مت پہنچاؤ...... آنسوؤں کو پونچھ اور میدانِ عمل میں ڈٹ جاؤ۔خدا تمہارا کارساز ہے وہ ہمیشہ سے تمہارے ساتھ ہے اور تم اسے ہمیشہ اپنے ساتھ پاؤ گی۔پریشانیوں اور غموں کے حصار سے باہر نکل آؤ۔"

جلتی ہوئی دل کی دنیا میں ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی اور اس کا زخمی دل اس پھوار سے قدرے تسکین پا رہا تھا۔

"میں خودکشی کیوں کروں۔زندگی ایک قیمتی امانت ہے اور ہم اس کے امین ہیں۔اس کی منشا کے بغیر ہمیں اسے ختم کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔میں ڈٹ کر مقابلہ کروں گی۔یہ میرا جہاد ہوگا۔" خود کو سنبھالتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔کمرے میں ٹہلتے ہوئے وہ دفاعی پہلوؤں پر غور کرنے لگی۔

"میں خالد کو فون کروں گی۔یہ نکاح کبھی نہیں ہوگا۔ماں اگر ڈائن بن گئی ہے تو اپنے

آپ کو بچانا مجھ پر لازم آتا ہے وہ مجھے اگر نیلام کرنا چاہتی ہے۔تو میرے لیے اپنی حفاظت مقدم ہے۔یہ کوئی عیب نہیں کوئی جرم نہیں۔"اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

باب نمبر: 43

ریسور کریڈل میں رکھتے ہوئے خالد نے حد درجہ پریشان نگاہوں سے سامنے دیکھا۔ بہن کی دردناک سسکیاں اس کی رگوں میں رواں خون کو منجمد کر رہی تھیں۔ گہرا اضطراب چہرے سے جھلک رہا تھا۔ درد و سوز میں ڈوبے ہوئے الفاظ ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہے تھے اور اس کی بے چینی میں ہر لحظہ اضافہ کرتے جا رہے تھے۔ مصیبت تو یہ تھی کہ اس کے پیہم اصرار پر بھی شیبہ نے کچھ نہ بتایا تھا۔ بس فوراً پہنچنے کے لیے زور دیتی رہی۔

''کیا ہو سکتا ہے؟'' ذہن قیاس کر رہا تھا۔

''کن مصائب میں گھر گئی ہیں شیبہ آپی آپ؟'' خالد غمگین لہجے میں خود سے بولا۔

دوسرے ہی لمحے وہ فون پر ہوٹل میں مقیم عمر کو فوراً تیار ہونے کے لیے کہہ رہا تھا اور تھوڑی دیر بعد وہ رسالپور سے پشاور جا رہے تھے۔ عمر بھی پریشان تھا۔ پشاور سے وہ بذریعہ ہوائی جہاز لاہور پہنچے۔ ٹیکسی پورچ کے قریب آ کر رکی۔ ٹیکسی والے کو فارغ کرنے کے بعد دونوں سرپٹ شیبہ کے کمرے کی طرف بھاگے۔ پردے کے پٹ ہٹا کر تیر کی طرح کمرے میں داخل ہوئے۔ سامنے صوفے پر شیبہ آنکھیں بند کیے نیم دراز نظر آئی۔ اس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔

''شیبہ آپی! خالد کی دردناک آواز پر اس نے اپنی متورم آنکھیں کھولیں۔'' یہ چاند جیسی

اجلی اجلی اور فراخ پیشانی والے میرے بھائی میری آنکھوں کا نور، میرے قلب کا سرور میرے پکارنے پر چلے آئے ہیں۔'' تڑپی، بے قراری سے اٹھی اور خالد کے کشادہ سینے سے لگ گئی۔ دل کا درد ایک بار پھر ابھر آیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ خالد نے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے تڑپ کر کہا۔

''ہمیں صحیح صورتِ حال سے آگاہ کیجئے...... شیبہ آپی کیا ہوا ہے؟'' لیکن وہ روئے جا رہی تھی۔

''ہمارے دل پھٹ جائیں گے۔ خدا کے لیے آپی رونا بند کریں۔'' عمر نے دونوں کو زبردستی الگ کیا۔ لیکن اب اس نے عمر کے کندھے پر اپنا سر ٹکا دیا تھا۔

عمر نے اسے صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''ہمارے ضبط کا امتحان نہ لیں آپی! خدارا ہمیں بتائیں کون سی مصیبت ٹوٹ پڑی ہے؟

''تب اس نے آہوں اور آنسوؤں کے درمیان خالد اور عمر کو ساری بات سنا ڈالی۔ خالد کی آنکھوں سے تو شعلے نکلنے لگے۔ مٹھیاں اضطراری حالت میں بھینچ گئیں۔ چہرہ سرخ ہو گیا اور تقریباً یہی کیفیت عمر پر بھی طاری تھی۔

''یہ گڈے گڑیوں کی شادی سمجھ لی ہے۔ انہیں ایسا کرنے کا حق کس نے دیا تھا؟ تیز اور غصیلی آواز میں خالد فرش پر پاؤں پٹختا ہوا بولا۔

''میں اس کی ماں ہوں اور اس کے مستقبل کے فیصلے کا مجھے پورا پورا حق حاصل ہے۔'' بیگم اشرف نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے گرجدار آواز میں کہا۔

''حق رکھتی ہیں لیکن اگر آپ نے اس کا ناجائز استعمال کیا تو یہ حق آپ سے چھین لیا جائے گا۔'' یہ عمر کی آواز تھی۔ جو خشمگیں نگاہوں سے ماں کو گھور رہا تھا۔

''کون چھین لے گا؟ تم؟ عمر ہوش میں ہو یہ کل کے چھوکرے میرے مقابلے کے لیے

چلے ہیں ۔'' آواز میں کڑک تھی ۔

''ہم چھپیں گے ۔ جوان اولاد مستقبل کے اندھے فیصلوں پر کبھی سر خم نہیں کرے گی ۔ آپ تعلیم یافتہ ماں ہیں ۔ زمانے کی رفتار سمجھتے ہوئے بھی آپ ضد پر اتر آئی ہیں ۔ ہماری تقدیر کے فیصلے کرتے وقت آپ کو ہماری رائے کا احترام کرنا ہوگا ۔'' لہجہ زوردار تھا ۔ دلائل ٹھوس تھے ۔ بیگم اشرف چیخ ہی اٹھیں ۔

''میرے ساتھ ٹکرانے کی کوشش مت کرو خالد ۔ ورنہ کچل دیئے جاؤ گے ۔''

یہ دھمکیاں کسی اور کو دیجئے ممی ! خالد ان سے مرعوب نہیں ہوگا ۔ شیبہ ہماری اکلوتی بہن ہے ۔ ہماری زندگی ہے ۔ ہماری روح ہے ممی ! بہن کی آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے آنسو بھائی کی غیرت کیلئے ایک چیلنج ہوتے ہیں ۔ ممی ہم اس کی زندگی میں بہاروں کی رنگینیاں پیدا کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے ۔''

خالد کا لہجہ کبھی ڈوب رہا تھا کبھی ابھر رہا تھا ۔

''یہ میرا اٹل فیصلہ ہے کہ اس کا نکاح ہاشم سے ہوگا ۔'' بیگم اشرف نے فیصلہ کن انداز میں کہا ۔

'' کیسا نکاح اور کس کا نکاح ؟ آپ ہوش میں ہیں ۔ خالد نے غصیلی نظروں سے ماں کو دیکھا ۔

''تم کس سے بات کر رہے ہو؟ تمہیں میرے ساتھ زبان درازی کرتے ہوئے شرم نہیں آتی '' بیگم اشرف نے سیخ پا ہوتے ہوئے کہا ۔

''آپ زبان درازی پر مجبور کر رہی ہیں ۔''

''میں نے اسے جنم دیا ہے ۔ میں اس کی ماں ہوں میں بہتر سمجھ سکتی ہوں ۔''

''آپ کیسی ماں ہیں؟ جو اپنی معصوم بیٹی کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہیں ۔ کیا آپ بتا سکیں گی کہ آخر آپ کو ہاشم سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟ وہ بدمعاش انسان ہمارے گھر کا ایک فرد بنے ہم

اتنے بے غیرت تو نہیں؟''

''میں نے ایک بار کہہ دیا ہے کہ وہ یہیں دولہا بن کر آئے گا۔'' بیگم اشرف سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے بولیں۔

''ہماری جوان گرم لاشوں پر سے گذر کر ہی آپ ہاشم کو یہاں بلا سکیں گی۔اس گھر میں خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔''

''خالد''

شیبہ تڑپ کر اٹھی اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ چلائی لیکن خالد نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور اسی رعونت سے ماں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہماری زندگی میں ایسا کبھی نہیں ہوگا اس کے ناپاک قدموں کو کاٹ دیا جائے گا۔جو اس خواہش کے لیے چل کر اس گھر کی دہلیز تک آئیں گے۔''

''میں دیکھوں گی۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں۔

''انتیس تاریخ کو ہاشم کی لاش ہی یہاں آئے گی۔''

''اس کی لاش آئے گی اور تمہارا کیا بنے گا؟'' بیگم اشرف نے چلتے چلتے ٹھہر کر پوچھا۔

''مجھے پھانسی ہوگی'' اس نے بے پناہ سکون سے کہا۔

''نہیں نہیں خالد، شیبہ تڑپی۔ مجھے سب کچھ منظور ہے میں زہر کا یہ پیالہ پی لوں گی خالد۔تمہیں کچھ ہوا تو میں جیتے جی مر جاؤں گی۔وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔خالد کا کندھا اس کے آنسوؤں سے تر ہو گیا تھا۔دھیرے سے وہ اسے پلنگ کے قریب لے آیا۔دونوں نے اسے مل کر لٹانے کی کوشش کی۔لیکن وہ تو ان سے چمٹی جا رہی تھی۔

''مجھے تمہاری قربانیوں کی ضرورت نہیں خالد!تم رہتی دنیا تک جیتے رہو۔تم کچھ نہیں کرو گے مجھ سے وعدہ کرو۔''

اضطراری حالت میں وہ ان کے چہروں کو دونوں ہاتھوں میں لیے بار بار پاگلوں کی

طرح اپنے الفاظ دہرا رہی تھی۔

دونوں بھائیوں کی سسکیاں سی نکل گئیں۔شیبہ کیشانے سر پر چہرہ ٹکاتے ہوئے خالد پھوٹ پڑا۔ماں کے ظالمانہ طرزِ عمل نے اس کے .... دل کو کاٹ کر رکھ دیا تھا۔آنسو روانی سے آنکھوں سے نکل نکل کر شیبہ کے گھنے بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔

''وہ کون سی مائیں ہیں جو اُولاد کے لیے اپنا جگر تک نکال دیتی ہیں۔ایک یہ ہماری ماں ہے جو کسی کے لیے بیٹوں کو پھانسی کے تختے پر لٹکا رہی ہے''۔خالد نے کرب سے سوچا۔

دھیرے سے بہن کے سر کو اپنی گود میں رکھتے ہوئے اور اس کے بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اُسنے عمر سے ڈاکٹر اشرف کو جرمنی ٹرنک کال کرنے کے لیے کہا۔

نہیں ہرگز نہیں عمر کو روکو۔میں اس گھر کو کبھی جہنم نہیں بننے دوں گی۔پاپا نہیں آئیں گے میں ہاشم سے شادی کروں گی۔''

''تم جاؤ عمر''اور پھر بڑے ہی دکھ سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''اب تو سکون ختم ہو گیا ہے آپ کا کیا خیال ہے؟ کہ ہاشم کے ساتھ آپ کی شادی ہو جانے سے ہمارے ذہن پر سکون رہیں گے۔ہم نے آپ کے لیے سندر سندر خواب دیکھے ہیں۔ان خوابوں کو یوں آسانی سے ملیا میٹ نہیں کیا جا سکے گا۔''

اور تیزی سے بہتے ہوئے آنسوؤں کے درمیان شیبہ سوچ رہی تھی کہ بھائی چھوٹے ہی کیوں نہ ہوں وہ وقت پر بہنوں کے لیے سینہ سپر ہو جاتے ہیں ...... یہ میرے بازو ہیں میرے لیے ایک مضبوط سہارا ہیں۔کون کہتا ہے کہ خالد اور عمر ابھی چھوٹے ہیں۔ادھر خالد سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ایسی سوچیں جن سے وہ یکدم دوچار ہو گیا تھا۔دماغ سوچ سوچ کر تھک گیا تھا۔کوئی ایسا راستہ نظر نہ آ رہا تھا۔جو قابل عمل ہو۔نکو نے کھانے کیلئے اطلاع دی۔لیکن کھانے کا کسے ہوش تھا۔عمر آ گیا تھا صورت حال پر دوبارہ غور وخوض شروع ہوا۔میرا تو خیال ہے کہ شیبہ آپی کو لے کر گاؤں چلے جائیں۔پاپا جلد از جلد پہنچ رہے ہیں۔

''نہیں ہم یہیں رہیں گے۔ یہ بزدلی مجھے پسند نہیں۔''

''ممی سے ایک بار پھر بات نہ کی جائے؟'' عمر نے تجویز پیش کی۔

''نہیں عمر میں اب ان سے مزید بات کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔'' خالد کی آواز میں ترشی تھی۔

ادھر بیگم اشرف اپنی جگہ پریشان تھیں۔ بیٹے مقابلے پر آ ڈٹے تھے۔ صورتِ حال بہت نازک تھی۔

ہاشم کا جوش بھی مدھم پڑ گیا تھا۔ اگر اسے صورت حال کا علم ہو جائے کہ میرے بیٹے اُسے مرنے مارنے پر تلے بیٹھے ہیں تو پھر کیا ہو۔ وہ تو اس دن اتنی ڈھیروں تسلیاں دیں تب کہیں جا کر اس کے چہرے پر ذرا سی بشاشت آئی۔ ضد کرتی ہوں تو انجام سامنے نظر آ رہا ہے۔ خالد جیسا جوشیلا انسان حقیقتاً اسے قتل کر دے کچھ بعید نہیں۔ بازی ہاتھوں سے نکلتی دکھائی دے رہی تھی۔ سوچوں کے تانے بانے پھیل رہے تھے۔ تصور نے ایک بڑا ہی عجیب سا منظر سامنے لا کھڑا کیا۔ اسما طنزیہ ہنستی ہنستی سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''شکست تمہارا مقدر ہے۔ تم میرے مقابلے پر کبھی نہیں جیت سکیں۔ بیٹوں سے جھڑپ کا نتیجہ دیکھ لیا ہے۔ مات کھا گئی ہونا۔ وہ میرے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ بازی میرے ہی ہاتھ ہو گی۔''

گہرے اضطراب سے وہ اٹھیں۔ کمرے میں ٹہلتے ہوئے خود سے بڑبڑائیں۔

''میں وہی کروں گی جو میرا دل چاہتا ہے۔ شکست کا داغ میں اپنی پیشانی سے دھو ڈالوں گی اور اس کے لیے خواہ مجھے کتنی ہی بڑی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ میں دوں گی۔'' زندگی کا ایک ایک پہلو نگاہوں کے سامنے آ رہا تھا۔ شوہر جسے زندگی کا ساتھی کہا جاتا ہے۔ جو دکھوں اور غموں میں برابر کا شریک ہوتا ہے میری کتنی بدقسمتی ہے کہ مجھے ساری عمر شوہر سے دُکھ ہی ملے۔ حالات میرے سامنے ہیں۔ مستقبل میں بیٹوں سے کیا توقع کی جا سکتی ہے؟ آج ہی انہیں عزت و

احترام کا رتی بھر احساس نہیں ۔کل کے متعلق کون کیا سوچ سکتا ہے ۔ جو کچھ بھی ہونا ہے ہو جائے مجھے کسی کی پرواہ نہیں ۔

''تو اتنے خوبرو اور پیارے بیٹوں کو اپنی جھوٹی آن پر تباہ کرگی ۔'' ضمیر چیخا ۔'' تو ماں ہے یا ڈائن ۔ایک چوٹ پڑی ۔

''عقل سے سوچ وہ کیسے بھی ہیں بیٹے تو تیرے ہی ہیں کیا ہوا ۔ وہ اسما کے نام کی مالا جپتے ہیں ۔لیکن اتنا تو غور کر کہ دنیا ہمیشہ یہی کہے گی کہ خالد اور عمر فریدہ کے بیٹے تھے کوئی اسما کا نام تک نہیں لے گا ۔یوں اپنے بیٹوں کو تباہی کے عمیق گڑھوں میں دھکیل رہی ہے ۔انہیں اگر کچھ ہو گیا تو کیا کرو گی''؟

''لیکن یہ میری شکست ہوگی ۔اسما جیت جائے گی ۔''

''ہوش میں آؤ تو شرط لگا دو کہ شیبہ کی شادی میں میری رضامندی شامل ہونی چاہیے ۔ بس ٹھیک ہے ۔''

تجویز بظاہر ٹھیک نظر آتی ہے ۔'' انہوں نے دل میں کہا ۔پھر غور و خوض کرتی رہیں ۔ انہوں نے نوکر سے خالد اور عمر کو بلوانے کے لیے کہا ۔

پیغام ملا خالد چلنے کیلئے بالکل رضامند نہیں تھا ۔لیکن عمر اسے زبردستی لے آیا بیٹوں پر نظر پڑتے ہی دل بھر آیا ۔لیکن ضبط کرتے ہوئے بولیں ۔''میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تمہیں ہاشم سے آخر کیا عداوت ہے؟ کیا برائی نظر آتی ہے تمہیں اس میں؟ صاحب جائیداد ہے ۔تعلیم یافتہ ہے ۔ خوبرو ہے اور سوسائٹی میں قابل قدر ہے ۔''

''اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیں کہ اول درجے کا لفنگا شرابی اور بدمعاش ہے ۔اس کا کردار کھوکھلا ہے ۔دولت تو ہر چیز کا علاج نہیں ہوتی ''۔خالد تیزی سے بولا ۔

''ممی ہمارے جذبات کو پس پشت نہ ڈالیئے ۔ہماری آرزوؤں کا خون نہ کیجئے ۔اس گھر کے سکون کو درہم برہم نہ کریں ۔'' عمر نے رقت آمیز لہجے میں کہا ۔

”آپ کا فیصلہ کیا ہے؟“ خالد نے بات ختم کر دینے کے انداز میں کہا۔

”میرا فیصلہ؟ میں تمہاری بات مانے لیتی ہوں۔ لیکن ایک شرط پر جہاں تم چاہو گے۔ اس میں میری پسند بھی شامل ہونی چاہیے۔“

”آپ کی پسند کا احترام کیا جائے گا ممی۔“ خالد نے کہا اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے تھے۔

باب نمبر: 44

کھولتے ہوئے ذہنوں میں جو لاوا پک رہا تھا۔اس میں کچھ کمی آ گئی تھی ۔طوفانی لہریں جو ذہن کے سمندر میں تڑپ تڑپ کر اٹھ رہی تھیں ذرا سکون پذیر ہو گئیں ۔

لیکن دلی سکون انہیں اب بھی حاصل نہ تھا۔ماں کی جولانی طبیعت ان سے پوشیدہ نہ تھی ۔لیکن اتنا ضرور تھا کہ خطرہ جو سروں پر منڈلا رہا تھا۔قدرے دور ہو گیا تھا۔وہ ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہوئے شیبہ کے کمرے میں داخل ہوئے ۔

''اٹھیے شیبہ آپی جب تک ہم زندہ ہیں کوئی ہماری امنگوں کا خون نہیں کر سکتا۔''

خوشی کی لہر شیبہ کے دل میں دوڑ گئی ۔لیکن اگلے ہی لمحے وہ افسردگیوں کی تہہ میں بیٹھ گئی تھی ۔

''کون جانتا ہے ۔یہ بھی ایک سازش ہو۔اس ایک فریب ہو۔''

''مجھے ورغلانے کا ایک انوکھا انداز ہو۔دھوکہ دہی کا ایک انوکھا ہتھیار ہو۔''

بہن کے قریب پہنچ کر خالد نے پیار سے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا اس کا معصوم چہرہ غم کے گرم گرم تھپیڑوں نے جھلسا دیا تھا۔حالات کی اس نئی افتاد نے اس پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا۔

اسے زبردستی دودھ پلایا گیا ۔خالد نے اس کی متورم آنکھوں میں دوا ڈالی ۔پپوٹوں کو کتنی دیر تک سہلاتا رہا۔تھوڑی دیر بعد وہ سو گئی ۔خالد اور عمر بھی وہیں اس کے پاس سوئے ۔

انتیس تاریخ کا سورج طلوع ہوا گو اب خطرہ ٹل چکا تھا۔لیکن اس کا بے قرار دل قابو نہ تھا۔بار بار دھڑک اٹھتا۔آنکھیں بے چین کیفیت کی غمازی کر رہی تھی۔اس کی پریشانی محسوس کرتے ہوئے خالد اسے بازار لے گیا۔اور وہیں اسے عطیہ مل گئی اسکی صورت دیکھ کر دنگ رہ گئی چھوٹتے ہی بولی۔

''تمہاری دادی اماں کا کیا حال ہے۔گاؤں سے کب آئی ہو تم؟''

دادی اماں! گاؤں یہ سب کیا ہے؟ گھبرا کر اس نے خالد کی طرف دیکھا۔اس کے چہرے پر بھی حیرانی کی لکیریں تھیں۔انہیں بوکھلایا ہوا دیکھ کر عطیہ بولی۔

''ہفتہ کے دن تم یونیورسٹی نہیں آئیں تو میں معلوم کرنے کے لیے تمہارے گھر گئی۔آنٹی نے بتایا کہ تم گاؤں گئی ہو کیونکہ تمہاری دادی اماں کا تار موصول ہوا تھا۔کل شام بھی میں نے فون کیا لیکن کسی نے ریسور ہی نہیں کیا۔دادی اماں کی صحت اب کیسی ہے؟''

وہ سن ہو گئی۔آنسو اس کی آنکھوں میں آگئے تھے اور لمبی پلکوں کے سائے میں موتی بن کر جم گئے۔لیکن وہ انہیں بہا نہ سکی۔آہیں سینہ توڑ کر باہر نکلنا چاہتی تھیں۔لیکن اس نے انہیں اندر ہی اندر گھٹ کر دم توڑنے پر مجبور کر دیا۔کس کے ظلم وستم کی داستان عطیہ کو بتائے۔اپنے پیٹ سے کپڑا اٹھانے کا نتیجہ خود کو ننگا کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔عطیہ اس کی بے حد مخلص دوست تھی لیکن جانے کیوں اس کا دل نہ چاہا کہ وہ اسے حادثہ کے متعلق بتائے۔

اب تو ٹھیک ہیں۔اس نے مختصر جواب دیا۔

تم یونیورسٹی کب آرہی ہو؟

''کہہ نہیں سکتی شاید ہم آج ہی پھر واپس چلے جائیں۔خالد آیا ہوا ہے نا۔''

''کیوں کیا وہ ابھی صحت یاب نہیں ہوئیں۔عطیہ اُسے دیکھتے ہوئے بولی۔

اس سوال کا جواب شیبہ نے نہیں دیا۔بس خاموشی سے بات ٹال گئی۔عطیہ نے افسوس ناک لہجے میں کہا۔

”امی ٹھیک نہیں ہیں شیبہ۔ ورنہ میں تمہارے ساتھ چلتی۔ مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے تمہاری حالت دیکھ کر۔“ کچھ دیر خالد سے باتیں کرنے کے بعد عطیہ معذرت کر کے چلی گئی۔

اس نئے انکشاف نے اس کی پریشانی اور بھی بڑھا دی۔ ماں کا سنگدلانہ برتاؤ دل پر کچوکے لگا رہا تھا۔ مجھے تباہ کرنے کی سازش اتنی گہری...... اس نے دکھ سے سوچا۔ اب بھی کیا بھروسہ۔ ہونے والا ہے؟ خالد اُسے پکچر دکھانے لے گیا۔ لیکن وہ وہاں بھی بہل نہ سکی۔ اس کی طبیعت یکسر اچاٹ ہو چکی تھی۔ منیب کا خیال آتا تو یوں لگتا جیسے وہ ایک خواب تھا۔ ایک سپنا تھا جو تھوڑی دیر کے لیے دیکھا تھا۔ وہ اتنی خوش نصیب کہاں؟ کہ اسے پا سکے۔ سوچتی کبھی آئیڈیل بھی ملے ہیں۔ یوں لگتا جیسے ابھی ابھی ایک طوفان اٹھے گا اور وہ اس میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جائے گی۔ ایک اذیت ناک کرب میں وہ مبتلا تھی۔ ذہنی سکون ہوش و حواس ہر چیز رخصت ہو چکی تھی۔ سحر زدہ سے انسان کی طرح غم صُم وہ ان خوش گوار دنوں کا تصور کرتی۔ اس خط کے حروف اسے یاد آتے۔ اپنے وعدے کا احساس تڑپاتا۔ ہوا کی لہروں سے کھیلتی ایک باوقار گھمبیر آواز اس کی سماعت سے ٹکرا کر اس کی دنیا میں کہرام مچا دیتی۔ لیکن جلد ہی وہ اس حسین دنیا سے باہر نکل آتی۔ پاگلوں کی طرح سوچتی رہتی حتیٰ کہ دماغ بالکل تھک جاتا۔ تب سر کو کرسی کی پشت سے ٹکا کر وہ آنکھیں بند کر لیتی۔

اس صورتِ حال سے خالد بہت پریشان تھا۔ وہ اور عمر اسے سمجھاتے سمجھاتے تھک چکے تھے۔ لیکن اس کے دماغ میں ایک ہی چیز گھر کیے ہوئے تھی کہ جو ماں اتنا بڑا فراڈ کر سکتی ہے اس کے ہاتھوں سے بچ کر وہ کہیں نہیں جا سکے گی۔ جب داؤ چلا وہ کہیں نہ کہیں نیلام کر دے گی۔ یونیورسٹی جانا اس نے بالکل بند کر دیا تھا۔ اکتیس تاریخ ہو رہی تھی ڈاکٹر صاحب ابھی نہیں آئے تھے۔ بہن کی ابتر حالت کے پیش نظر خالد خاموشی سے عطیہ کے پاس گیا اور سارا معاملہ اس کے سامنے رکھتے ہوئے اس کی مدد چاہی۔ عطیہ تو سکتے میں آ گئی۔ اسی وقت خالد کے ساتھ گھر آئی۔ اسے سمجھایا بجھایا اور اگلے دن یونیورسٹی لے گئی۔ اس کی حالت دیکھ کر سبھی دنگ رہ گئیں۔ عطیہ کی

زبانی انہیں اس کی دادی اماں کی بیماری سے متعلق پتہ چل چکا تھا۔باری باری سبھی نے تسلی دی۔سبھی نے سمجھایا۔عطیہ اسے لیے سارا دن اِدھر اُدھر پھرتی رہی۔ہر طرح اس کے غم غلط کرنے کی کوشش کرتی رہی۔شام کو جب گھر آئی تو برآمدے میں ڈاکٹر اشرف خالد سے باتوں میں مصروف تھے۔

"یہ میرے پاپا ہیں۔"اس نے بے یقینی سے دیکھا۔

"تاریک تاریک راہوں پر یہ روشن دیئے کس نے رکھ دیئے ہیں؟" وہ خود سے کہتی ہوئی بھاگی۔

بیٹی کو بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے اور اس کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے ان کے چہرے پر تفکر کی لکیریں کچھ زیادہ نماں محسوس ہو رہی تھیں۔شیبہ جان گئی کہ سب واقعات ان کے علم میں آ چکے ہیں۔

ان کے سینے سے لپٹی ہوئی وہ اتنا سکون محسوس کر رہی تھی اسے اطمانیت محسوس ہو رہی تھی۔بالکل یہی لگ رہا تھا جیسے خوفناک آندھیاں دم توڑ چکی ہیں۔

شب تاریک کے بعد اُمید کی سنہری کرنیں پھوٹ پڑی ہوں۔

یوں جیسے ایک ڈھال مل چکی ہو۔

سارے مصائب اور کلفتوں کے بوجھ سے یکسر آزاد ہو گئی ہو۔

"خالد بیٹے تم جانے کی تیاری کرو اب۔گھبرانے والی کوئی بات نہیں ہے"

محبت کی ایک بھرپور نظر سے انہوں نے بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔وہ بیٹے پر جتنا بھی فخر کرتے کم تھا۔

کار رکی اور بیگم اشرف باہر نکلیں۔لیکن شوہر پر نظر پڑتے ہی قدم جہاں تھے وہیں جم گئے۔

"یہ کیسے آ گئے ہیں؟ یہ میری اولاد ہے کیا؟ ایسی ذلیل اولاد سے بے اولاد رہنا بہتر نہیں۔پہلے خود مقابلے کے لیے ڈٹے تھے۔اب باپ کو بلا لیا ہے۔خیر کوئی بات نہیں گھبرانے اور

پریشانی سے فائدہ؟'' انہوں نے اپنے حواس درست کرتے ہوئے خود سے کہا۔

افسوس صد افسوس کام ہی بن جاتا تو بھی ایک بات بھی تھی۔آرزو بھی تشنہ رہی اور ذلت سے الگ ہمکنار ہونا پڑا۔

''آپ کب آئے؟'' انہوں نے قریب آکر حیرانی سے پوچھا۔

''تقریباً دو گھنٹے ہوئے ہوں گے۔'' ڈاکٹر اشرف نے کمال اطمینان سے جواب دیا۔

''لیکن یہ یک دم کیسے چلے آئے؟'' بیگم اشرف نے دوبارہ پوچھا۔

''اعظم بیمار ہو گئے تھے انہیں لے کر آنا پڑا۔''

اعظم ڈاکٹر اشرف کے دوست تھے اور ان کے ساتھ ہی ریسرچ کے لیے گئے تھے۔ بیگم اشرف کا دل خوشی سے جھوم اٹھا کہ شوہر کو گھر میں ہونے والے حادثے کے متعلق کوئی علم نہیں۔ گو وہ ڈرتی نہ تھیں۔لیکن اس ذکر سے حاصل ......شوہر کے دل میں بدگمانی پڑنے والی بات ہی تھی۔

''اعظم کیسے بیمار ہو گئے؟''

''آب وہوا ٹھیک نہیں رہی۔''

''وہ اب کہاں ہیں؟'' بیگم اشرف نے پوچھا۔

''ہسپتال میں'' انہوں نے مختصر جواب دیا۔

''خالد تم کتنے دن کی چھٹی پر آئے تھے۔'' انہوں نے بیٹے پوچھا۔

''چھ دن کی'' اس نے ادب سے جواب دیا۔

شیبا اور خالد کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی کہ ان کے پاپا کتنے گہرے انسان ہیں۔ تحمل و ضبط اور بردباری میں شاید ہی کوئی انسان ان کا ثانی ہو۔نازک ترین لمحات میں بھی انہوں نے ضبط کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ان کی زندگی قربانیوں اور ایثار کی ایک مکمل تفسیر تھی۔

اگلے دن جب اُس نے عطیہ کو پاپا کے پہنچ جانے کے متعلق بتایا تو عطیہ نے اسے مشورہ دیا کہ اب منیب کو فوراً اطلاع دینی چاہیے۔ حالات سازگار معلوم ہو رہے ہیں۔ اس کے بار بار سمجھانے پر خود اس نے بھی سوچا کہ واقعی یہ تجویز ٹھیک ہے اور اسی شام اُسی نے ٹرنک کال کی۔

منیب کی آواز سنتے ہی اس کا دل دھڑک اٹھا اور دھڑکنوں کے درمیان اس نے انہیں فوراً پہنچنے کے لیے کہا۔

''میں جلد از جلد پہنچ رہا ہوں۔'' اُسے اُن کی گھمبیر آواز سنائی دی۔

وہ رات اس نے سوتے جاگتے میں گذاری۔ ''کیسے کہوں گی؟ کیا بتاؤں گی۔'' اس کا دل دھڑک دھڑک اٹھا۔

''یہ وقت فضول شرم کا نہیں۔ اگر میں نے اس وقت کوتاہی کی تو ساری عمر پچھتاؤں گی۔''

''میں ان سے صاف صاف کہہ دوں گی۔''

اگلے دن وہ یونیورسٹی نہ گئی۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھی کام کرتی رہی ہر بار فون کی گھنٹی بجتی تو وہ لرزتے دل اور ہاتھوں سے ریسیور اٹھاتی۔ لیکن اُمید ٹوٹ جاتی''

''ایک بجے کے قریب پھر گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا تو دل کی دنیا عجیب سے سرور سے سرشار ہوگئی۔

''میس'' کمرے کا نمبر اس نے ایک بار دہرایا اور فون بند کر دیا۔

باب نمبر: 45

آفیسرز میس کے گیٹ کے قریب منیب بے چینی سے اُس کے منتظر تھے۔سوچ رہے تھے۔کہ فوری طور پر بلوانے کی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟ اتنے میں کار آ کر رُکی اور پچھلی سیٹ سے شیبہ باہر نکلی۔منیب کی نگاہوں میں حیرانی اُبھر آئی۔ یقیناً وہ شیبہ ہی تھی۔لیکن اس کی پیازی رنگت پیلاہٹوں میں کیوں بدلی ہوئی تھی؟ اس کا حسین چہرہ اُداسیوں کے ہالے میں کیوں لپٹا ہوا تھا؟ ادھ کھلی کلیوں جیسی پیاری مسکراہٹ جانے کہاں گم تھی نگاہوں میں مسرت کی کرنیں جگمگا نہیں رہی تھیں۔احمریں ہونٹوں پر دبیز سنجیدگی مسلط تھی۔حسین آنکھوں کے گرد تفکرات کے ہالے پڑے ہوئے تھے۔

لیکن اس کے باوجود اس کا سوگوار حُسن منیب کو آج بھی دلفریب نظر آ رہا تھا......وہ پیشوائی کے لیے آگے بڑھے۔نگاہیں ملیں اور ایک مغموم سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ گئی۔یہ کیسی مسکراہٹ تھی یوں لگا جیسے گہری تاریک شب میں اُفق پر روشن ستارا جھلملا گیا ہو۔

بغیر کچھ کہے وہ آگے بڑھنے لگی۔منیب اس کے ساتھ چل رہے تھے۔میس کی شاندار عمارت اُس کے سامنے تھی۔

گھٹی گھٹی آہوں کا دھواں اس کے اندر سے منیب کو دیکھتے ہی اٹھنے لگا۔ضبط دم توڑتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔آنکھوں کے گوشوں سے اس نے اپنے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بلند وبالا اور وجیہہ

وجود کو دیکھا ۔دماغ کو ایک بار پھر شدید جھٹکا لگا۔

''منیب سے بچھڑ کر زندگی دکھوں اور آہوں کا ایک دردناک گیت نہ بن جائے گی۔''

اس نے دُکھ سے سوچا۔

دھیمی چال چلتے ہوئے شیبہ صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔منیب پردے درست کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کے مقابل صوفے پر بیٹھ گئے۔نگاہوں کا تصادم ہوا اور اس کی حسین آنکھوں میں مچلتی درد و اضطراب کی لہریں منیب کو تڑپا گئیں۔وہ خاموش تھی۔لیکن آنکھوں میں ہزاروں طوفان تڑپ رہے تھے۔

''شیبہ''

منیب نے اسے پکارا۔

لمبی پلکوں نے جنبش کی اور ان پلکوں کے گھنے سائے تلے شبنمی آنکھیں اوپر اٹھیں ان نگاہوں میں منیب کو کیا کچھ نہ محسوس ہوا۔بے چینی،اضطراب،محبت کی شدت،بیگم اشرف خطرناک ارادوں کے ساتھ شیبہ کے تصور میں ابھریں۔نگاہوں پر دھند کا غبار چھایا جا رہا تھا۔منیب ڈوبتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ایک سسکی ابھری اور شبنم کے قطرے دامن میں لڑھک گئے۔

بے چین ہو کر منیب اٹھے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بڑی ہی بے چین آواز میں بولے۔یہ اضطراب اور پریشانی کیسی ہے؟ مجھے بھی کچھ بتاؤ نا شیبہ!

ہاتھوں کا یہ پیار بھرا لمس اور محبت کے یہ بول اس کے ضبط کا بند توڑ گئے۔رُکی رُکی آہیں اور سسکیاں مچل اٹھیں۔حسین آنکھیں ساون بھادوں کی طرح برس پڑی تھیں۔سر منیب کے شانوں سے ٹکا ہوا تھا۔

''منیب اگر تم مجھ سے بچھڑ گئے تو میں ختم ہو جاؤں گی۔'' شدتِ جذبات سے اس کا گلا رُندھ گیا تھا۔

''اس کے سر کو تھپتھپاتے ہوئے۔منیب نے بڑے جوش سے کہا۔

کون کہتا ہے شیبہ! تم مجھ سے بچھڑ جاؤ گی۔

''خدا پر اعتماد رکھو! شیبہ! ہم انشا اللہ ایک ہی منزل کے راہی بنیں گے۔''

''یہ کلمات کیسے ہیں جو میرے کانوں میں شہد گھول رہے ہیں۔

بجھتی ہوئی اُمیدوں میں از سرِ نو زندگی پیدا کر رہے ہیں۔''

سسکیاں قدرے کم ہو گئی تھیں۔ایک گہری نظر منیب نے اس پر نظر ڈالی۔بند آنکھوں سے موتیوں کی مالا ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے بہہ رہی تھی۔بھیگی بھیگی پلکوں پر کہیں کہیں موتی اٹکا ہوا تھا۔گرم گرم سانسوں کی تپش انہیں چہرے پر محسوس ہو رہی تھی۔ایک بار تو شدت سے دل چاہا کہ ان بھیگی بھیگی آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیں۔ان قطروں سے انہیں تر کر لیں۔جو جذبات کی شدت سے جلے جا رہے تھے۔لیکن وہ ایسا نہ کر سکے۔کتنی ہی دیر دیکھتے رہے۔دماغ کچھ جب سکون پذیر ہوا تو معاً انہیں احساس ہوا جیسے وہ لطیف سا بار جو شانے سے ٹکا ہوا تھا ہٹ گیا ہے۔پلٹ کر دیکھا تو شیبہ سیدھی بیٹھ چکی تھی۔

کتنے ہی لمحے گذر گئے۔تب منیب نے اسے پکارا۔

''شیبہ!''

اور اس پکار پر اس نے نگاہیں اٹھائیں۔ان کی نگاہوں میں گہرا پیار تھا۔

''میں سب باتیں تفصیلاً جاننا چاہتا ہوں۔''

دھیرے دھیرے رُک رُک کر جھکی جھکی نگاہوں سے اس نے سب باتیں منیب کے گوش گذار کر دیں اور جب اس نے نگاہیں اوپر اٹھائیں،ان کو دیکھا تو وہ سوچوں میں محو تھے۔نگاہیں ملیں۔منیب نے قدرے مسکراتے ہوئے شیبہ کو دیکھ کر کہا۔

''خالد حقیقتاً خالد ہی ثابت ہوا۔''

''میں عمر اور خالد دونوں پر جتنا فخر کروں کم ہے۔''شیبہ نے آہستگی سے کہا۔

بھائی کی تحسین و تعریف پر اس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

''شیبہ ڈاکٹر فرخ کے خاندان کے کسی فرد کے متعلق تمہارے پاپا کو کوئی علم نہیں۔''

''وہ ڈاکٹر فرخ جو میرے پاپا کے گہرے دوست تھے جن کی تصویر آپ نے لائبریری اور پاپا کی خواب گاہ میں دیکھی تھی وہ نا۔ آپ ان کے متعلق پوچھ رہے ہیں نا؟'' اس کی آنکھوں میں بے پناہ حیرانی تھی۔

''ہاں!''

''لیکن ان کا اس واقعہ سے کیا تعلق؟'' شیبہ نے قدرے پریشانی سے پوچھا۔ دراصل اس کا ذہن اس قدر متاثر ہو چکا تھا کہ وہ بات کی تہہ تک یہ جانتے ہوئے بھی نہ پہنچ سکی کہ منیب کا پورا نام منیب فرخ ہے۔ ویسے ایسی کوئی بات اس کے تصور میں بھی نہ تھی۔ کہاں وہ ڈاکٹر فرخ جو بقول اس کے پاپا کے لینڈ لارڈ تھے اور کہاں منیب۔ ذہن اتنی لمبی چھلانگ لگاتا بھی تو کیسے؟

''تعلق تو بڑا گہرا ہے۔'' وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولے۔

''کیا آپ؟''.......... اس نے یکلخت نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔

''منیب فرخ..... منیب فرخ'' اس کے ذہن میں ان کا نام گونجا اور یہ گونج شعور کو جھنجھوڑ گئی۔

''وہ میرے ابو تھے شیبہ!''

اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہ حیرت سے ان کو تکے جا رہی تھی۔ یہ مسرور کن انکشاف منیب اس فرخ کے بیٹے تھے۔ جن سے اس کے باپ کو ایسی محبت تھی۔ جسے موت بھی ختم نہ کر سکی تھی۔ ذہن کہاں کہاں بھٹکتا رہا یہ تو اس کی کم عقلی تھی کہ وہ سمجھ ہی نہ سکی۔

تب منیب کے ساتھ ساتھ قدم اٹھاتی ہوئی وہ حال کو بہت پیچھے چھوڑ کر اس دنیا میں چلی گئی جہاں ان کا بچپن خوش گوار اور تلخ یادوں کے سائے میں بکھرا پڑا تھا۔ اُن اُن جگہوں پر گھومی جہاں جہاں دُکھ اور غم ان کی جھولی میں پڑے۔ انہوں نے اپنے بے پناہ عزم سے اپنی تقدیر بنائی

تھی۔ کٹھن راہ کی صعوبت کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا تھا۔ مصائب کی آندھیوں میں اپنی لگن کا دیا جلایا۔ یہ دیا بار بار بجھا۔ لیکن ان کے عزم نے دم نہ توڑا۔ ہر بار نئے سرے سے اسے جلایا اور ایک وقت آیا جب غم و آلام کے یہ سیاہ جھکڑ ختم ہو گئے۔ ہر طرف روشنی ہی روشنی بکھر گئی اور زندگی پرسکون ہو کر ایک ڈگر پر چلنے لگی۔ ان کی زندگی کے ایک ایک پہلو سے اچھی طرح آگاہی حاصل کرنے کے بعد جب وہ میس کے اسی کمرے میں واپس لوٹی تو اس کا دل عقیدت و احترام کے جذبات سے لبریز تھا۔

''لوگ کتنے ریا کار ہیں'' وہ سوچ رہی تھی۔ کتنی رنگین داستانیں سناتے ہیں۔ انقلاب کی آڑ میں خود کو جانے کہاں کہاں کے لینڈ لارڈ بتاتے ہیں۔ لیکن یہ انسان جو عظمت کی اتنی بلندی پر ہے۔ جس کا ماضی اتنا شاندار تھا۔ جو میرے گھر اپنے باپ کی تصویر دیکھ کر بھی خاموش رہا۔ ظاہر تک نہ ہونے دیا۔ شدت سے اس کا دل چاہا کہ وہ ان ہاتھوں کو تھام کر اپنے ہونٹوں سے لگا لے۔ وہ یقیناً دُنیا کی خوش قسمت لڑکی ہے جسے اتنا اچھا انسان ملا۔ بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ منیب اٹھے۔ نوکر چائے کی کشتی لیے کھڑا تھا۔ چائے میز پر رکھ کر وہ چلا گیا۔ چائے بناتے ہوئے انہوں نے شیبہ کی طرف دیکھا اور اعتماد سے بھرپور آواز میں بولے۔

''غم مت کرو شیبہ ہم انشاءاللہ ضرور ملیں گے۔''

جسم کا سارا خون چہرے کی طرف دوڑ رہا تھا۔ وہ ہاتھ جس میں کپ پکڑا ہوا تھا لرز اٹھا۔

''ماما کب آئیں؟'' منیب شوخی سے مسکرائے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

''بتاؤ نا پھر''۔ پیار بھرا اصرار تھا۔

وہ کھڑی ہو گئی۔ اس کے ساتھ منیب بھی کھڑے ہو گئے۔

''پرسوں تک ماما تمہارے ہاں ہوں گی۔'' باہر نکلتے ہوئے انہوں نے شیبہ سے کہا۔

’’ہمیں خالقِ حقیقی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔فکر اور پریشانی سے کبھی مشکلات ختم نہیں ہوتیں۔‘‘

باب نمبر: 46

دن کے کوئی دو بجے ہوں گے۔''ما ہسپتال'' کے ایک کمرے میں ڈاکٹر اشرف پلاسٹک سرجری کے طریق کار کے متعلق اپنے عملے کو ایک معلومات افروز لیکچر دے رہے تھے۔جب نوکر نے انہیں اطلاع دی کہ ان کی والدہ صاحبہ گاؤں سے تشریف لائی ہیں۔بے پناہ خوشی کے ساتھ انہیں حیرانی بھی ہوئی۔حیرانی کی وجہ یہ بھی تھی کہ تیرہ سال کے طویل عرصے میں وہ ان کے ہاں صرف دو مرتبہ آئی تھیں۔پہلی دفعہ ما ہوسپٹل کے افتتاح پر آئی تھیں اور دوسری عامر کی سالگرہ پر۔تیز تیز قدم اٹھاتے وہ گھر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ڈرائنگ روم کا پردہ اٹھایا تو ماں کا نورانی سفید چہرہ بے شمار جھریاں لیے نظر آیا۔وفورِ شوق سے آگے بڑھے اور ان کے گلے سے لگ گئے۔ ماں نے پیار بھرے بوسوں کی بوچھاڑ کر دی۔سینے سے لگایا۔

''آپ ٹھیک ہیں ما بی جان''انہوں نے تیزی سے پوچھا۔

''ہاں بیٹے!خیریت سے ہوں''۔فاطمہ نے مسکراتے ہوئے روشن کی طرف دیکھ کر کہا۔جو دوسرے صوفے پر بیٹھی ماں بیٹے کے ملاپ کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔بیتابی شوق میں ڈاکٹر اشرف نے یہ بھی نہ دیکھا کہ کمرے میں کوئی دوسرا بھی موجود ہے۔ماں کی نگاہوں کا رخ بدلتے دیکھ کر انہوں نے بھی پلٹ کر دیکھا۔ادھیڑ عمر کی ایک معزز خاتون موسم کی مناسبت سے بہترین لباس میں ملبوس صوفے پر تمکنت سے بیٹھی تھیں۔ان کے چہرے کے خدوخال ڈاکٹر

اشرف کے ذہن میں کھلبلی مچ گئی۔انہوں نے سلام کیا جس کا جواب خاتون نے بڑے ہی سلجھے ہوئے انداز میں دیا۔وضع قطع سے کسی اعلیٰ خاندان کی فرد معلوم ہوتی تھیں۔

یہ شکل انہوں نے دیکھی ضرور ہے لیکن کہاں؟ کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔وقت کی راکھ نے ہر چیز پر ایک تہہ جما دی تھی۔روشن اپنی جگہ سوچ رہی تھی کہ وقت کے ساتھ ساتھ انسانی شکلوں میں کتنا تغیر رونما ہو جاتا ہے۔اگر منیب مجھے ان کے متعلق نہ بتا چکے ہوتے تو شاید میں پہچاننے میں کامیاب نہ ہو سکتی۔شناسا صورت ضرورت معلوم ہوتی۔لیکن سمجھ نہ پاتی کہ اسے کہاں دیکھا ہے۔ ماضی کی بھولی بسری کہانی وقت کے درمیانی فاصلوں کو تیزی سے ہٹاتی سامنے آ گئی تھی۔یوں جیسے ابھی کل کی بات ہو۔

وہ اور منیب کی امی ثریا ڈاکٹر رحمان کے گہرے دوست کی بیٹیاں تھیں۔ان دنوں روشن کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔وہ اپنے شوہر رضا علی اور ثریا کے ساتھ فرخ کے ہاں آئی ہوئی تھی۔ بہار کے چمکتے دن تھے۔جب فرخ اشرف کے ساتھ گھر آیا۔اشرف کی عادت کو سبھی نے پسند کیا۔ ثریا کو رائیڈنگ کا خبط تھا اور اشرف بھی اس کا خاصا رسیا تھا۔دونوں کے مقابلے ہوتے۔تاش کی محفلیں جمتیں۔

رات کے ایک ایک بجے تک وہ لوگ ایک دوسرے کو کہانیاں سناتے۔دلچسپ لطیفے دہرائے جاتے۔زندگی سے بھرپور صحت مند قہقہے فضا میں بکھرتے اور کمرے کی دیواریں گونج اٹھتیں۔

کتنے حسین اور دلفریب تھے وہ دن بھی جو بیت گئے اور اب کسی قیمت پر لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

رضا اور ثریا کی یادوں نے اسے بے چین کر دیا تھا۔نگاہ اٹھا کر دیکھا تو ماں بیٹا باتوں میں مصروف تھے۔

''تم نے انہیں پہچانا نہیں اشرف!'' فاطمہ نے بیٹے سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

ایک بار انہوں نے پھر مہمان خاتون کی طرف دیکھا۔تذبذب میں پڑ گئے ۔

روشن اب اس راز سے پردہ اٹھا دینا چاہتی تھیں۔اشرف کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

''میں روشن ہوں اشرف!''

ان کے منہ سے یہ نام سنتے ہی ڈاکٹر اشرف چیخ سے پڑے یوں لگا جیسے وہ خواب دیکھ رہے ہوں یا یہ نام خواب میں سن رہے ہوں ۔کتنی تگ و دو کی تھی ۔انہوں نے کہ وہ فرخ کے خاندان کے کسی فرد سے مل سکیں ۔لیکن وہ اپنی اس کوشش میں نا کام رہے اور آج وہ کیا دیکھ رہے ہیں؟ کیا سُن رہے ہیں؟ روشن ان کی والدہ کے ساتھ ان کے سامنے بیٹھی ہیں ۔

روشن نے ماضی کے چہرے پر پڑے پردے کو سرکایا۔اور انہیں فرخ کے حادثے میں ہلاک ہونے ۔ثریا کی موت ۔ڈاکٹر رحمان کے المناک قتل اور خود اپنے مصائب اور غم و آلام پر مشتمل ایک طویل دردناک کہانی سنائی ۔ضبط کے باوجود ڈاکٹر اشرف کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے ۔فرخ کا بیٹا پانچ سال تک لاہور میں پڑھتا رہا۔لیکن انہیں علم تک نہیں ہوا۔یہ کتنی المناک بات تھی۔

''منیب اب کہاں ہیں؟''انہوں نے بے چینی سے پوچھا۔وہ فرخ کے بیٹے کو جلد از جلد دیکھنا چاہتے تھے۔

''وہ میس میں ٹھہرا ہوا ہے۔ روشن نے جواب دیا۔''

''وہ میس کیوں چلا گیا؟ کیا وہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔

اور دوسرے ہی لمحے وہ میس فون کر رہے تھے ۔فوراً پہنچنے کا کہتے ہوئے واپس پلٹے ۔

روشن نے معنی خیز نظروں سے فاطمہ کی طرف دیکھا۔یوں جیسے بات کرنے کا عندیہ لے رہی ہوں اور پھر ان کی نگاہوں میں کچھ محسوس کرتے ہوئے گویا ہوئیں ۔

اشرف تم نے منیب کو بلا لیا ہے۔لیکن اس کے یہاں پہنچنے سے قبل میں تم سے کچھ گذارش کرنا چاہتی ہوں۔ایک درخواست لے کر آئی تھی جسے شاید تم شرفِ قبولیت بخش سکو۔کچھ جلدی اس لیے بھی ہے کہ بی جان صبح ہی واپس جانا چاہتی ہیں۔اتنا کہہ کر وہ رُکیں۔

''آپ ہچکچا کیوں رہی ہیں روشن آپا؟ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں بلا تکلف کہہ ڈالیے۔وقت نے ہمارے درمیان بیگانگی اور اجنبیت کی کوئی دیوار قائم نہیں کی۔فرخ کا خاندان ہمارا اپنا خاندان ہے۔''

مَیں تمہارے ان احساسات کے لیے تمہاری شکر گزار ہوں۔لیکن پھر بھی لبوں پر بات لاتے ہوئے زبان رُکتی ہے۔زمانہ بدل گیا ہے۔ہم وہ نہیں ہیں جو کبھی تھے۔وقت نے ہمیں بادشاہ سے فقیر بنا ڈالا ہے۔لیکن'' ....

ڈاکٹر اشرف نے یکلخت ان کی بات کاٹ دی۔

''یوں نہ کہیے روشن آپا۔روپیہ پیسہ سب مادی چیزیں ہیں جن کا قلبی رشتوں سے کوئی تعلق نہیں۔آپ کی خاندانی عظمت کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔مَیں آپ کی زبان سے اظہارِ مدعا صاف صاف سننا چاہتا ہوں۔تکلفات کے ان پردوں کو ہٹا دیجیے مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔''

تھوڑی دیر تک وہ کچھ سوچتی رہی اور پھر کس قدر عزم سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

''اشرف مَیں فرخ کا بیٹا تمہیں دینے اور شیبہ کو تم سے لینے آئی ہوں۔''

قدرت کے کام کتنے نرالے ہیں۔حالات نے کتنے ستم ڈھائے ہیں۔وقت کی چکی نے ان لوگوں کو پیس کے رکھ دیا۔لیکن میڈیکل ہوسٹل کے اس کمرے میں وہ معصوم سا وعدہ جو فرخ اور اشرف کے مابین ہوا تھا۔کاتبِ تقدیر نے اسی وقت اس وعدے پر تکمیل کی مہر ثبت کر دی تھی۔وہی کمرہ ان کی نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔جہاں فرخ نے ان دن مسکراتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

''میری یہ خواہش ہے کہ ہمارے مابین پیار کا یہ بندھن اور بھی مضبوط ہو جائے''۔جس کے جواب میں اشرف نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

''اسے مضبوط تر بنانے کے لیے تم کیا تجویز پیش کرتے ہو؟''

''میرے بیٹے اور تمہاری بیٹی کی شادی۔''فرخ نے شرارت سے کہا۔

''مجھے منظور ہے۔''اور یہ کہتے ہوئے اشرف نے فرخ کے بڑھے ہوئے۔ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

وقت کتنی بڑی کروٹ بدل گیا تھا۔گردش زمانہ نے کیا کیا رنگ دکھائے؟ لیکن وہ مقدس سا وعدہ جس میں فرخ کی دلی تمنائیں شامل تھیں۔قدرت نے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے حالات کا رُخ کیسے موڑا۔پچھلے چند دنوں سے وہ خاصے پریشان تھے۔ان کے ملنے والوں میں سے بہت سے لوگ دلی طور پر شیبہ کے لیے خواہش مند تھے اور وہ خود فوراً کسی موزوں جگہ بیٹی کی شادی کر کے فریدہ والے جھنجھٹ کو یکسر ختم کر دینا چاہتے تھے۔

''وعدے اگر صدقِ دل سے کیے ہوں۔ان میں خلوص اور نیک نیتی کی روح کارفرما ہو اور جذبے کی لگن شامل ہو تو کیسے نہ ان کی تکمیل ہوگی۔''وہ سوچ رہے تھے۔ان کی خاموشی سے روشن کا دل ڈوبنے لگا۔ہمت کرتے ہوئے بولیں۔

''تم خاموش کیوں ہو گئے اشرف؟''

''روشن آپا!فرخ کے بیٹے سے بڑھ کر مجھے اور کوئی پیارا نہیں ہو سکتا۔میری خاموشی کی وجہ کچھ یہ بھی ہے کہ مَیں اس سلسلے میں شیبہ کی رضامندی چاہتا ہوں۔''

مَیں تمہاری ممنون ہوں اشرف۔''روشن نے احساس مندی کے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا۔

تبھی باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔

''منیب اندر چلے آؤ۔''

اوراس آواز کے ساتھ ہی ہلکی سانولی رنگت لیے ایک باوقار سے نوجوان کو ڈاکٹر اشرف نے دروازے میں کھڑے دیکھا۔برق کی تیزی سے وہ کھڑے ہوئے۔آگے بڑھے اور نوجوان کو اپنی گرفت میں سمیٹ لیا۔محبت کی کرنیں دل سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھیں اور منیب کی پیشانی پر ثبت ہو رہی تھیں۔وہ ان کے گلے میں بانہیں ڈالے بے خود سے کھڑے تھے۔ ڈاکٹر اشرف کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔اپنے بازوؤں میں سمیٹے اور انہیں صوفے کے قریب لے آئے۔

''روشن آپا!اس کے نقوش ثریا پر ہیں۔رنگت اور آنکھوں میں بلا کی خود اعتمادی فرخ کی ہے۔''انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم نے ٹھیک اندازہ لگایا ہے اشرف......''روشن ہنستے ہوئے بولیں۔

بیگم اشرف سو رہی تھیں۔اٹھیں تو نوکر نے انہیں ڈاکٹر صاحب کی والدہ اوران کے ساتھ کسی خاتون کی آمد کا حال سنایا۔

اسی وقت اٹھ کر ڈرائنگ روم کی طرف بھاگیں اور جب اندر جا کر دیکھا تو یوں محسوس ہوا جیسے جسم سے جان نکل گئی ہو۔وہی نوجوان جس سے وہ حد درجہ متنفر تھیں صوفے پر بیٹھے ڈاکٹر صاحب سے باتوں میں مصروف تھا۔ڈاکٹر صاحب کی والدہ کے ساتھ ایک نئی صورت تھی۔دل چاہا ابھی اسی وقت ان لوگوں کو بازو سے پکڑ کر باہر نکال دیں۔لیکن سینے پر پتھر کی سل رکھ کر آگے بڑھیں۔منیب نے کھڑے ہو کر آداب کیا۔بے اعتنائی سے جواب دیا۔فاطمہ نے بہو کے سر پر ہاتھ پھیرا۔روشن نے ہاتھ ملایا۔تھوڑی دیر تک وہاں بیٹھی جلتی رہی اور جب جلن حد سے بڑھنے لگی تو اٹھ کر باہر آ گئیں۔شوہر پر حد درجہ غصہ آ رہا تھا۔

ڈاکٹر اشرف نے منیب کو دیکھ کر دلی خوشی محسوس کی تھی۔مختصر سے وقفے میں ہی وہ انہیں متاثر کر چکا تھا۔رات کے کھانے سے فارغ ہو کر منیب نے جانے کی اجازت چاہی۔ڈاکٹر اشرف کے روکنے کے باوجود وہ میس چلے گئے۔

روشن اور فاطمہ دس بجے تک ڈاکٹر صاحب سے باتیں کرتی رہیں۔ پھر وہ انہیں سونے کے کمرے میں چھوڑ کر خود شیبہ کے پاس گئے وہ اس کی رضامندی لے کر صبح انہیں مقررہ تاریخ دینا چاہتے تھے۔ کمرے میں داخل ہوئے تو شیبہ پڑھنے میں مصروف تھی۔ لبوں پر شیریں مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ باپ کو آتا دیکھ کر وہ کھڑی ہو گئی۔ ہمیشہ کی طرح آج اس کے انداز میں شوخی اور چلبلا پن نہ تھا۔ اس کے احساسات کچھ عجیب سے ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر اشرف کافی دیر اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر بڑے ہی دھیمے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔

''شاید تمہیں معلوم ہی ہو شیبہ! کہ روشن اور بی جان یہاں کس مقصد کے تحت آئی ہیں۔ اس وقت جبکہ میں تمہارے مستقبل کے متعلق کوئی اہم فیصلہ کرنے والا ہوں۔ میں تمہاری بے رائے جاننے کا متمنی ہوں تاکہ اس کی روشنی میں سوچا جا سکے۔''

اس کے رخسار اندر کی دہکتی آگ سے جلنے لگے۔ سر جھک گیا۔ حجاب اظہار کی راہ میں حائل ہو گیا اور وہ خاموش رہی۔

''میں تمہاری رائے عُمر کے ذریعے بھی معلوم کروا سکتا تھا۔ لیکن تمہاری ماں کے طرزِ عمل سے میں بہت محتاط ہوں۔ شاید تمہیں معلوم نہ ہو منیب، فرخ کا بیٹا ہے اور فرخ کے متعلق میرے احساسات تم سے پوشیدہ نہیں۔ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا ہے۔ یہ اس وعدے کی تکمیل ہے جو میں نے اپنے عزیز ترین دوست کے ساتھ کیا تھا۔ منیب بہت متین اور سلجھا ہوا لڑکا ہے۔ جو مجھے چند گھنٹوں میں متاثر کر گیا ہے میں تمہاری رائے جاننا چاہتا ہوں۔ مجھے آزادی سے بتاؤ کہ تم میری رائے سے اتفاق کرتی ہو یا نہیں۔''

سر مزید جھک گیا۔ کیا کہے اور کیا بتائے؟ شرم سے زبان گنگ ہو گئی۔ ڈاکٹر اشرف خاموش بیٹھے کتنی دیر دیکھتے رہے۔ پھر اس کے قریب آئے اور سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

''شیبہ بیٹے! میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں۔''

کتنے ہی خیال دماغ میں آئے اور گذر گئے۔ پھولوں کی خوشبو دماغ میں رچ گئی۔

کلیوں کی مہک عطر بیز کر گئی۔ سپنے لہرائے۔خوشیوں کے عکس پھیلےاوراس کے وجودکواپنی لپیٹ میں لے گئے۔حسین آنکھیں نے ٹہنی پر جھولتے گلاب کے تن تنہا خوبصورت پھول کو دیکھا۔دل و دماغ سرشار ہو گیا۔انگلیاں بڑھیں اور پھول توڑ لیا۔لیکن توڑتے سے انگلی میں کانٹا چبھ گیا۔ نا قابلِ برداشت کسک محسوس ہوئی۔

یہ کانٹااوراس کی کسک ڈاکٹراشرف سے جُدا ہونے کےتصور کی تھی۔آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔سسکی اُبھری۔

''یوں نہیں جان پدر'' انہوں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

آبگینوں کوٹھیس لگ گئی تھی۔ پھوٹ پڑی۔ڈاکٹر صاحب پیار سے اس کا سر سہلاتے رہے۔اُسے خاموش کرواتے رہے۔آنسوؤں کا زور تھما تو انہوں نے پانسہ پھینکا۔

''ٹھیک ہے میں کل روشن کو جواب دے دوں گا۔کہ شبیر رضامند نہیں۔''

''ہائے جواب!''

''پاپا کیا کہہ رہے ہیں۔'' یکدم باپ کے سینے سے سر نکا کران کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں محبت وشفقت کے دریا بہہ رہے تھے۔

''نہیں پاپا!'' دوسرے ہی لمحے وہ بچوں کی طرح ان کے سینے میں منہ چھپا چکی تھی۔

طمانیت آمیز مسکراہٹ ان کے لبوں پر بکھر گئی۔

ڈاکٹراشرف جب اپنی خواب گاہ میں واپس آئے تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔آج کادن ان کی زندگی کا کتنا اہم تھا۔آج وہ اتنے خوش تھے کہ کوئی انسان ان کی حقیقی خوشی کا تصور بھی نہ کرسکتا تھا۔وہ مایوس ہو چکے تھے۔بے انتہا مایوس۔کب امید تھی کہ فرخ کے خاندان کا کوئی فرد انہیں کبھی مل سکے گا......سامنے مینٹل پیس پر فرخ کی تصویر مسکرا رہی تھی۔

''فرخ! تمہارا بیٹا بڑی دلکش شخصیت کا مالک ہے۔مَیں نے اسے دلی طور پر پسند کیا ہے۔''

وہ تصویر کے سامنے کھڑے تھے۔میڈیکل ہاسٹل کا وہی کمرہ نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔جہاں اس معصوم سے بندھن کا وعدہ کیا گیا تھا۔قدموں کی آواز نے ان کا سلسلہ خیالات توڑ دیا۔بیگم اشرف کمرے میں داخل ہو رہی تھیں چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا بھنویں چڑھی ہوئی تھیں اور تیور بگڑے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

''کیسے آئی ہو فریدہ! طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟انہوں نے نرمی سے پوچھا۔

''وہ لوگ کون ہیں؟''......بیگم اشرف غصے سے بھڑکتی ہوئی بولیں۔

''نوجوان فرخ کا بیٹا ہے۔خاتون ان کی عزیزا اور دوسری خاتون تمہارے شوہر کی والدہ ہیں۔شاید پہچانتی ہوں۔''ڈاکٹر اشرف نے طنز کا گہرا تیر چلایا۔

یہ فرخ کا بیٹا اور عزیزآج کہاں سے ٹپک پڑے۔تیرہ سال تک تو ان کا کوئی کھوج نہ ملا۔

''یہی باتیں اطمینان سے بھی کی جا سکتی ہیں۔تمہارے انداز میں اتنی رعونت جوش اور غصہ کیوں ہے؟ کیا پوچھنا چاہتی ہو تم؟''

''ان کی آمد کا مقصد واضح طور پر جاننا چاہتی ہوں۔''بیگم اشرف نے شوہر کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔

''وہ شیبہ کا رشتہ مانگنے آئے ہیں۔''انہوں نے کمال اطمینان سے کہا۔

شوہر کی اس بات پر تلملا ہی تو اٹھیں۔''میرا قیاس میرے اندازے کبھی غلط ہوں یہ ناممکن ہے۔خدشہ سامنے آ کر رہا۔خیر میرا نام بھی فریدہ ہے۔''

انہوں نے خود سے کہا۔

''آپ نے ان سے کیا کہا؟''......شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

''کہنے کا کیا سوال؟میں تم سے اس بات کا تذکرہ پہلے بھی دو تین بار کر چکا تھا اور اب تو اس وعدے کی تکمیل میرا فرض ہے تا کہ اس عزیز ترین دوست کی خواہش کو پورا کیا جا سکے۔''

''میں کسی وعدے کی تکمیل نہیں جانتی ۔ مجھے کسی ایسے وعدے سے کوئی سروکار نہیں ۔ شیبہ کی شادی یہاں ہرگز نہیں ہوگی ۔''انہوں نے خاوند کی طرف دیکھتے ہوئے ڈٹ کر کہا۔

''کیوں؟ نظروں میں ہاشم سمایا ہوا ہے نا؟''.....انہوں نے طنز سے کہا۔

''اس معمولی سے ڈاکٹر کا آپ ہاشم جیسے صاحبِ ثروت سے مقابلہ کرنے چلے ہیں ۔ کہاں زمین کہاں آسمان ۔کہاں پستی کہاں بلندی ۔آپ کو اس کا کوئی احساس نہیں؟''

''میرے احساس کی بھی خوب کہی ،فریدہ ایسے احساسات کی ساری دولت تو قدرت نے تمہارے خاندان کو ودیعت کر دی ہے ۔وہ چیز کو حتیٰ کہ انسانی کردار و شرافت کو بھی دولت کے ترازو میں تو لتے ہیں ۔سننا ناگوار خاطر نہ ہو تو مَیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ایک وقت تھا۔ جب وہ ہاشم جیسے ہزاروں کو خرید سکتے تھے ۔آج اگر وقت نے ان کی حالت بدل دی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی عظمت کو فراموش کر دیا جائے ۔''

''میرے خاندان میں تو کیڑے نکالنے شروع کر دیے ہیں ۔کبھی اپنی طرف بھی دیکھا ہے؟ مثل مشہور ہے اپنی آنکھ کا شہتیر بھی نظر نہیں آتا ۔بڑی عظمت والا ہے نا تمہارا خاندان!'' بیگم اشرف غرائیں ۔

''ذرا گریبان میں منہ ڈال کر تو دیکھو ۔تمہیں خود ہی جواب مل جائے گا ۔''

''کیا جواب مل جائے گا؟'' وہ تڑپیں ۔

''میرے خاندان کی عظمت کے بارے میں تمہیں ابھی تک شک ہے ۔اگر میری رگوں میں شرافت کا لہو نہ دوڑتا ۔تو تمہارے سب ہتھکنڈوں اور فریبوں کو جانتے ہوئے بھی مَیں تمہیں کبھی نہ اپناتا ۔وہ لڑکی جس کی آرزوؤں جس کی خوابوں کی تعبیر مَیں تھا ۔یوں اپنے سپنوں کو اجاڑ کر اپنی خواہشات ملیامیٹ کر کے کبھی تمہیں اپنا سہاگ نہ سونپتی ۔تمہاری مانگ میں افشاں نہ بھرتی ۔میرا ہاتھ تھام کر وہ مجھے اس راہ پر ڈال گئی ۔جس کا مَیں آج راہی ہوں اس نے اپنے لیے کانٹوں بھری راہیں منتخب کر لیں اور تمہیں پھولوں کی سیج دی ۔آج بھی وہ اُسی آن بان سے ہماری عزت و وقار کا

علم بلند کیے ہوئے ہے۔میرے خاندان کے ہر فرد کی پیشانی پر تمہیں ایثار و عظمت کی کہانیاں لکھی نظر آئیں گی اور اسی روشنی میں ذرا اپنے خاندان کا بھی جائزہ لے لو۔اپنے والدین کو دیکھو اور خود اپنے کردار کا بھی تجزیہ کر لو۔ایک بار بھی فریدہ تم نے کوشش کی کہ تم میرے رستے ہوئے زخموں پر سکون کے پھاہے رکھ سکو۔ایک بار بھی تم نے چاہا کہ تم میرے دکھوں کو بانٹ سکو۔تم نے مجھے جتنے دُکھ دیے ہیں فریدہ! میں گنوانا چاہوں تو مہینے گذر جائیں۔لکھنا چاہوں تو کتاب مرتب ہو جائے۔ تمہاری زندگی کلبوں، سینماؤں اور تفریح گاہوں کے گرد گھومتی ہے۔تمہیں کیا ضرورت ہے کہ تم ایک دُکھی انسان کے لیے کچھ کر سکو۔تم نے شیبہ کا رشتہ ہاشم سے کرنے کی ساز باز کی۔ایک بار بھی تمہارے پتھر دل نے یہ نہ سوچا کہ تمہاری معصوم بیٹی ہاشم جیسے آوارہ فحش انسان کے ساتھ گذارہ کر سکے گی۔تم نے کیسی کیسی گھناؤنی حرکات کیں۔کیسے کیسے ناجائزہ حربے استعمال کیے؟ مجھے بتاؤ نا کیا تم بیٹی کو فروخت کرنا چاہتی تھیں؟'' ان کی آواز میں گرج تھی۔آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

لیکن نہ تو آواز کی یہ گھن گرج بیگم اشرف کو متاثر کر سکی اور نہ ہی انہوں نے شعلوں سے کوئی تاثر لیا۔آج تو وہ بھی مقابلے کے لیے پوری طرح صف آرا تھیں۔غصے سے ان کو گھورتے ہوئے بولیں۔

''یہ غلط خیال آپ کے دل میں کیونکر آیا؟''

''تمہاری حرکتیں دیکھ کر۔'' انہوں نے کہا اور پھر ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''میں اگر تمہاری حرکات پر تنقید نہیں کرتا۔میں نے اگر کبھی تم سے تمہارے مشاغل کے متعلق باز پرس نہیں کی تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم من مانی کارروائیاں شروع کر دو۔فریدہ ہر چیز جب حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو اس کا انجام خراب ہوتا ہے۔ہوش میں آؤ۔اب بھی وقت ہے۔''

''مجھے ہوش میں آنے کی کوئی تمنا نہیں۔یہ بے ہوشی ہی میرے لیے سود مند ہے۔جلنے اور کڑھنے کے سوا اور کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ اپنے دل کے پھپھولے تو پھوڑ لیے ہیں۔کبھی میرے

زخموں کو بھی دیکھا ہے؟''

''بغور دیکھا ہے اور یہی افسوس ہے کہ وہ قدرتی نہیں خود ساختہ ہیں۔''

''میں آپ کا فیصلہ سننے کی منتظر ہوں۔''

''میرا فیصلہ اٹل ہے۔ترمیم کی کوئی گنجائش نہیں۔''

''مجھے زیادہ غصہ دلانے کی کوشش مت کیجئے۔ میں اگر انتقام لینے پر اتر آئی تو مجھے دنیا کی کوئی طاقت نہ روک سکے گی۔ایک لمحے میں اس گھر کو جہنم کا نمونہ بنا ڈالوں گی۔ایک پل میں اس کا گھر کا سکون تہہ وبالا ہو جائے گا۔''

جس گھر میں تم جیسے شیطانی عنصر ہوں۔وہ گھر بھی کبھی جنت بنے ہیں۔وہاں سکون وشانتی کا کیا کام؟ یہ گھر جہنم ہی تو ہے۔''انہوں نے سکون سے بیوی کو دیکھتے ہوئے چوٹ کی۔

پارۂ اضطراب بے قرار ہوا تھا۔شدید اضطراری حالت اس پر طاری ہو گئی۔

''اگر آپ نے بھی وہاں شادی کرنے کی ٹھان لی ہے۔تو میں بھی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اس گھر میں شدید طوفان اٹھے گا۔جب اندھیرا چھٹے گا۔تو گھر کی ایک قیمتی چیز اس طوفان کی بھینٹ چڑھ جائے گی اور وہ چیز تمہاری لختِ جگر شیبہ ہو گی۔''

''لہجہ اتنا خوفناک تھا کہ آنکھوں سے انتقام کی چنگاریاں اُٹھ رہی تھیں۔

ڈاکٹر اشرف چھلک پڑے۔

''کیا مطلب ہے؟''

''مطلب اب بیٹھ کر سوچیں یہ بھی میں نے بتا دیا تو بات کیا بنی؟''

فریدہ تو چلی گئی۔لیکن ڈاکٹر اشرف کی نیند حرام کر گئی۔ساری رات وہ خوفناک اندیشیوں کی بھول بھلیوں میں کھوئے رہے۔پریشانی اور اضطراب میں ڈوبے رہے سوچتے رہے۔ وہ تو فریدہ کے ایک ہی وار سے اتنے شدید زخمی ہو چکے تھے کہ سالہا سال گذر جانے کے بعد بھی صحت یاب نہ ہو سکے تھے اور اب یہ دوسرا وار۔کیا وہ اسے سہہ لیں گے۔دل وجگر میں اتنی تاب

ہے؟''

وہ خوفزدہ ہرگز نہ تھے۔لیکن یہ وہ جانتے تھے کہ عورت جب انتقام لینے پر آتی ہے تو ایک ڈائن کا روپ دھار لیتی ہے۔تب اس کے پیشِ نظر نہ تو انسانیت ہوتی ہے۔نہ ممتا اور نہ ہی کوئی اور لازوال جذبہ۔

خوفناک لب ولہجہ میں ادا کیے گئے الفاظ ان کے کانوں میں گونج رہے تھے......

یہ احساس بھیانک تھا۔وہ کانپ اٹھے۔انہیں بیٹی سے والہانہ پیار تھا۔

اسے اگر کچھ ہو گیا تو وہ زندہ رہ سکیں گے؟ سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گئے۔

''اس کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں۔انسانوں کو شکار کرنے کا جذبہ اسے وارثت میں ملا ہے۔''

انہوں نے خود سے کہا۔

ساری رات سوچوں میں گذر گئی۔نماز پڑھنے کے بعد انہوں نے خلوصِ ودل سے دُعا مانگی۔کافی دیر گم رہے اور جب سوچ کے گہرے سمندر سے باہر نکلے تو آنکھیں کسی انجانے احساس سے چمک رہی تھیں۔

''اگر اسے بھی ایک تلخ سبق نہ ملا تو وہ کیا یاد کرے گی؟ خدا سچائی کے ساتھ ہے۔''

نوکر بیڈ ٹی لے کر آیا تو انہوں نے بیگم اشرف کو بلوانے کیلئے کہا۔

دوسری طرف بیگم اشرف بھی سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔اس بات کا تو انہیں وہم وگمان بھی نہ تھا کہ منیب فرخ کا بیٹا نکلے گا۔دماغ پر اسما کا بھوت سوار تھا۔ایک خیال تو یہ آتا کہ ٹھیک ہے جو بھی زد میں آئے چوٹ سہے۔لیکن دوسرے ہی لمحے خیالات کا دھارا بدل جاتا۔ لیکن جب اسما کا خیال آتا تو اندر کا ناگ پھن مار کر لہراتا۔تڑپ اٹھیں۔

صبح ہو رہی تھی اور اس کے ساتھ ان کے عزائم اتنی ہی خوفناک شکل لیے دماغ میں گھوم رہے تھے۔

"یہ شادی ہر قیمت پر رُکنی چاہیے۔ ہر قیمت پر۔"

نوکران کے لیے بیڈٹی لایا اور ساتھ ہی ڈاکٹر اشرف کا پیغام بھی۔

"ہوں"۔

"معلوم ہوتا ہے دھمکی اثر کر گئی ہے۔ ساری اکڑ وکڑ بھول گئے ہیں۔" نائٹ گون ٹھیک کرتے ہوئے وہ ان کے کمرے کی طرف چل دیں۔ ان کی سرخ سرخ آنکھیں دیکھ کر سمجھ گئیں۔ رات آنکھوں میں کٹی ہے۔

"آپ نے مجھے یاد فرمایا ہے۔" خاوند کی طرف دیکھ کر انہوں نے طنز سے کہا۔

"فریدہ اپنا فیصلہ بدل دو۔ یہ میری درخواست ہے۔ التجا ہے۔ ایک مرحوم دوست سے کئے ہوئے وعدے کی تکمیل میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔ میری مدد کرو۔"

"نہیں مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔"

"میں اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟" انہوں نے نرمی سے پوچھا۔

دل چاہا سب کچھ انہیں بتا دیں۔ لیکن سب کچھ کہنا کتنا مشکل تھا۔ ان کا بے پناہ ضبط یقیناً جواب دے جاتا۔ نہ جانے کیا کر بیٹھتے۔ اسما کے متعلق ایک لفظ بھی سننا گوارا نہ تھا۔ اور اتنی نفرت رکھنے کے باوجود بھی بیگم اشرف کی کیا مجال کہ وہ اس کے متعلق کچھ کہہ سکتیں۔ یہ نفرت یہ گھٹن تو ان کا مقدر بن چکی تھی۔

"میں اس رشتے کے محاسن و عیوب پر بحث کے لیے تیار نہیں۔" انہوں نے فاتحانہ شان سے کہا۔

"ٹھیک ہے کوئی اور بہتر رشتہ تلاش کرو۔"

بیگم اشرف باہر آ گئیں۔ لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔

بیٹی ان کی کمزوری تھی۔ دھمکی نے خاطر خواہ اثر کیا تھا۔ یہی سوچتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھیں۔

ڈاکٹر ہسپتال چلے گئے ۔وہیں انہوں نے روشن اور والدہ کو بلا لیا صورتِ حال سے انہیں مختصراً آگاہ کرتے ہوئے اگلے ایک دو ماہ کے دوران سازگار حالات میں نکاح کے لیے کہا۔ روشن تاریخ طے کرنا چاہتی تھیں ۔ان کی بے چینی محسوس کرتے ہوئے وہ ان سے مخاطب ہوئے ۔

''روشن آپا! شیبہ پر سب سے زیادہ آپ کا حق ہے۔ میں کوشش کروں گا۔جتنی جلدی ہو سکے۔آپ کا حق آپ کو سونپ دوں اور خود بھی اس فرض سے سبکدوش ہو جاؤں ۔لیکن موجودہ حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ تاریخ کا تعین کیا جا سکے۔''

باب نمبر: 47

سبھی اپنی جگہ مطمئن ہو چکے تھے۔بیگم اشرف اپنی دانست میں معرکہ سر چکی تھیں۔بازی ہارتے ہارتے وہ ڈرامائی انداز میں خود کو جیتا ہوا محسوس ہو کر رہی تھیں۔ڈاکٹر صاحب بظاہر ہار مان چکے تھے اُن کی ضد وہ توڑ چکی تھیں۔جو خطرہ ان کے سر پر منڈلا رہا تھا۔بیگم اشرف کی نظر میں اس کا قلع قمع ہو چکا تھا۔

شیبہ اپنی جگہ مسرور و شادماں تھی۔آنے والے حسین دنوں کے تصور میں گم تھی۔آرزوؤں کے چمن میں فصلِ بہار کی آمد آمد تھی ارمانوں کی ننھی منی کلیاں پھول بننے کے خواب میں کھلی جا رہی تھیں۔

منیب خوش تھے کہ شاہراہِ حیات پر انہیں ایک حسین اور پیارا ہم سفر ملنے والا ہے۔ایسی ہستی کی رفاقت میسر آنے والی ہے جو انہیں بے حد محبوب ہے۔

روشن بھی خوش تھیں کہ شیبہ جیسی صالح لڑکی ان کی بہو بننے والی ہے۔لیکن اگر کوئی ہستی پریشان تھی تو وہ صرف ڈاکٹر اشرف تھے۔جنہیں چند دنوں کے اندر ہی بیگم اشرف رشتہ طلب کرنے والوں کی ایک لمبی فہرست تھما چکی تھیں۔اور دو تین بار ان کے لیے غور و خوض کا بھی کہہ چکی تھی۔لیکن پچھلے تین چار دنوں سے تو وہ انہیں بار بار احساس دلا رہی تھیں۔عجب گو مگو کا عالم تھا جو تجویز ان کے ذہن میں تھی۔اسے عملی صورت دینے کا کوئی امکان ہی نظر نہ آ رہا تھا۔

''خدا فرض کا عظیم بار میرے شانوں پر پڑا ہے۔ حالات کو سازگار بنا! تا کہ میں سبکدوش ہوسکوں۔''

دل کی عمیق گہرائیوں سے نکلی ہوئی دعائیں کبھی رائیگاں نہیں گئیں۔اس دن وہ گھر آئے تو بیگم اشرف ان کے کمرے میں آئیں۔ہاتھ میں کوئی خط پکڑا ہوا تھا۔

''آپا کا خط آیا ہے۔ نجمی کی شادی انتیس تاریخ کو ہورہی ہے۔میں کل پرسوں تک جانا چاہتی ہوں۔''

انہوں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''لیکن اتنی جلدی جانے کی کیا ضرورت ہے؟''انہوں نے عقلمندی سے کام لیتے ہوئے کہا۔وہ بیوی کی نفسیات سے خوب واقف تھے۔

اور واقعی یہی بات بیگم اشرف کو حد درجہ اطمینان دلا گئی۔گو مطمئن تو وہ پہلے بھی تھیں۔ لیکن پھر بھی خلش کا ایک ننھا سا کانٹا انہیں کبھی کبھی پریشان کر دیتا تھا آج تو گویا اس کی جڑیں بالکل اکھڑ گئی تھیں۔فوراً بولیں۔

''انہوں نے بلایا ہے۔مجبوری بھی لکھ دی ہے۔اب نہ جانا بڑی بری بات ہوگی۔لیکن آپ کب آئیں گے؟''

''میں تو مقررہ تاریخ پر ہی پہنچ سکتا ہوں۔''

''میرا ارادہ بچوں کو بھی ساتھ لے کر جانے کا تھا۔''

''بچوں سے پوچھ لو۔اگر وہ جانا چاہتے ہیں تو چلے جائیں ویسے شیبہ اور عمر کے تو امتحانات سر پر ہیں۔''

''تو ٹھیک ہے آپ انہیں آتے ہوئے لیتے آیئے۔میں عامر کو ساتھ لے جاؤں گی۔'' بیگم اشرف نے اٹھتے ہوئے کہا۔

جس دن بیگم اشرف گئیں۔اسی دن انہوں نے منیب کو ٹرنک کال کی اور چھٹی لے کر فوراً

پہنچ جانے کے لیے کہا۔اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں میجر اسلم اور کیپٹن عارف کوٹیلیگرام دیا۔خالد کوفون کیا۔لیکن اسے مزید ایک دن کی بھی چھٹی نہ مل سکنے کا سن کر انہیں قلبی دکھ ہوا۔روشن اور والدہ کو تفصیلی خط لکھ کر نوکر کے ہاتھ بھیج دیئے۔شیبہ کی دوست عطیہ کو بلایا۔صورتِ حال بتاتے ہوئے انہوں نے ایک چیک دیا تا کہ شیبہ اپنی پسند کے زیورات اور کپڑے خرید سکے۔

شیبہ جہاں بے پناہ خوش تھی وہاں اداس بھی تھی۔سب سے زیادہ غم تو اسے خالد کے موجود نہ ہونے کا تھا۔ویسے سارے حالات اس کے سامنے آ چکے تھے یہ شادی جس طرح ہو رہی تھی اس سے یہ بات بھی پوشیدہ نہ تھی۔جانے اس کا انجام کیا ہوگا۔ممی کیا کیا فتنے کھڑے کریں گی؟ عطیہ پچھلے تین دن سے اس کے پاس تھی۔

''عطی!اگر اس وقت ممی آ جائیں تو کیا ہو؟'' شیبہ نے عطیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''خدا کے لیے اب تو اپنی ان الٹی سیدھی سوچوں سے باہر نکل آ ؤ۔بارات دروازے پر پہنچ گئی ہے۔''

ڈاکٹر اشرف کے دونوں بھائی اپنے اہل وعیال سمیت پہنچ چکے تھے۔بہنیں بھی پہنچ چکی تھیں۔اب صرف گاؤں سے آنے والوں کا انتظار تھا۔منیب بھی پہنچ چکے تھے اور میس میں موجود تھے۔دن کے تین بجے تھے جب شیبہ کی پھوپھی کی ننھی بچی زرقا بھاگی بھاگی اوپر آئی اور دادی اماں کے پہنچ جانے کی خبر سنائی۔

''اسما پھوپھو آئی ہیں؟'' شیبہ نے بچی سے پوچھا۔

عطیہ بے اختیار ہنس پڑی۔

''اُن کو پوچھ رہی ہو۔روشن خالہ کا پوچھوتا کہ تسکین قلب ہو!''

لیکن بچی کے بتانے پر کہ اسما پھوپھو نہیں آئیں،اس کا دل بے چین ہو اُٹھا۔

ڈاکٹر اشرف نے بھی ان لوگوں کے درمیان جب اسما کو نہ دیکھا تو انہیں دلی تکلیف

ہوئی ۔ ''سب باتیں اپنی جگہ مسلم لیکن اس سے میرا خون کا تعلق بھی تو ہے ۔'' انہوں نے بے اختیار سوچا ۔ والدہ سے اس سلسلے میں بات کی تو انہوں نے کہا '' وہ باوجود میرے اور روشن کے اصرار کے بھی نہیں آئی ۔ مَیں اسے مجبور کر کے لانے سے تو رہی'' ۔

اُسی وقت انہوں نے اسما کو لانے کے لیے عمر کو گاؤں بھیج دیا ۔

گھر میں خوب چہل پہل تھی ۔ روشن اور اسلم کی بیوی رضیہ اوپر آ گئیں ۔

روشن نے شیبہ کو پیار کرتے ہوئے بازار چلنے کو کہا ۔ لیکن جب شیبہ نے پس وپیش سے کام لیا تو رضیہ فوراً بولی ۔

''نہیں رانی روشن آپا ٹھیک کہتی ہیں ۔ وہ سب چیزیں تمہاری پسند سے خریدنا چاہتی ہیں ۔ تم تیار ہو جاؤ ۔ ہم تمہارا نیچے انتظار کرتے ہیں ۔''

شیبہ، روشن، عطیہ اور رضیہ کے ساتھ بازار چل دی ۔ زیور اور کپڑا خرید لیا گیا اور پھر روشن دکاندار سے کپڑے کی سلائی کے متعلق بات چیت کرنے لگیں ۔ شیبہ کے ہاتھ میں چار پانچ بنڈل پکڑے ہوئے تھے ۔ اٹھائے اٹھائے بازو بھی دُکھنے لگے ۔ کار دکان سے ذرا فاصلے پر کھڑی تھی ۔ سوچا خواہ مخواہ تھکنے سے فائدہ، یہ سامان کار میں ہی رکھ آؤں یہی سوچتے سوچتے وہ دکان سے باہر آ گئی ۔ اپنی دُھن پر آگے بڑھتی جا رہی تھی کہ یکدم کسی کے آگے آ کر ٹھہر جانے سے چونک پڑی ۔ نگاہیں اٹھیں چہرے پر شرمیلا تبسم پھیل گیا ۔ منیب اس کے بالکل سامنے راستہ روکے کھڑے تھے ۔ قدم جہاں تھے وہیں رُک گئے دل میں ہلکی ہلکی کپکپاہٹ شروع ہو گئی ۔ ہاتھوں میں پکڑے ہوئے بنڈل جانے کیسے گر گئے ۔ منیب نے جُھک کر انہیں اٹھایا اور آہستگی سے بولے ۔

''تم اکیلی ہو یا ساتھ اور بھی کوئی ہے؟ لیکن وہ کوئی جواب نہ دے سکی ۔

سرِ راہ انہیں یوں کھڑا ہونا عجیب سا لگا ۔

'' کار کدھر ہے؟'' منیب نے دوبارہ پوچھا ۔

نگاہیں اٹھا کر اس نے ذرا فاصلے پر اشارہ کیا ۔

منیب اس طرف چل دیئے۔اور ان کے ساتھ ساتھ اس کے قدم بھی اٹھنے لگے۔
ڈرائیور گاڑی میں نہیں تھا۔سامان رکھتے ہوئے انہوں نے بڑی دھیمی آواز میں سرگوشی کی۔
"یہ اتنا کچھ کس کے لیے خریدا جا رہا ہے؟"
مسکراہٹ سے اس کا چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔آنکھیں خوشی کے بے پایاں احساس سے چمک رہی تھیں۔ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے اس نے شرارت کے انداز میں جواب دیا۔
"یہ سب کچھ میرے اپنے لیے ہے۔"
"میرے لیے کچھ نہیں؟" منیب بھی مسکرائے۔
"نہیں" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔
"ماما کب آئی ہیں" انہوں نے پوچھا۔
"آج' وہ دکان پر ہیں"۔
بے شمار لوگ آ جا رہے تھے۔مزید ٹھہرنا اور باتیں کرنا منیب نے مناسب نہ سمجھا۔خدا حافظ کہتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔لیکن یکدم پھر کسی خیال کے تحت واپس مڑے۔
"شیبہ خالد آ گیا ہے۔" ان کے لہجے میں شوق نمایاں تھا۔
"نہیں اُسے چھٹی نہیں مل سکی۔" وہ یکدم بڑی ہی مغموم ہو گئی۔آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔
"اس میں اداس ہونے کی کیا بات ہے۔ہم انشاءاللہ جلد اس کے پاس جائیں گے۔"
کافی دور تک شیبہ انہیں دیکھتی رہی۔
رات کو جب وہ گھر پہنچیں تو دس بج چکے تھے۔اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے عطیہ سے منیب کے ملنے کا ذکر کیا۔
تو وہ ہنستے ہوئے بولی "یہ ملنے ملانے کے چکر کو چھوڑو۔اب شادی میں ایک دن رہ گیا ہے۔"

''تو کیا میں خود ملنے گئی تھی۔اب سرِ راہ ملاقات ہو گئی تو میرا کیا قصور؟'' شیبہ بھی ہنس کر بولی۔

''قصور کوئی کم ہے۔غضب خدا کا اتنے بڑے جرم کی مرتکب ہو رہی ہو اور ابھی کہتی ہو میں تو بالکل بے قصور ہوں۔اتفاقیہ باتیں تمہارے ساتھ خوب ہوتی ہیں۔ہم بھی تو وہیں تھے۔ ہمیں تو نہ ملا۔''تم نے ضرور اسے فون کیا ہو گا؟'' عطیہ نے اسے چڑاتے ہوئے کہا۔

''اب تو دلوں تک رسائی ہونے لگی ہے۔غیب کے علم میں ماہر ہوتی جا رہی ہو۔آثار کچھ اچھے نہیں لگتے''۔

''آثار اچھے کیسے لگیں گے؟ شیبہ اشرف سے بیگم منیب جو بن رہی ہو۔''

اسی نوک جھونک میں کافی رات گذر گئی۔

جمعہ کے دن نکاح تھا۔منیب ڈاکٹر اشرف کے کہنے پر آ گئے تھے۔یہیں تیار ہوئے۔ دس بجے کے قریب نکاح ہوا۔

اسما ہسپتال کا عملہ، ڈاکٹر رانا شیبہ اور اس کی سہیلیوں اور منیب کے ملاقاتی لوگوں کے سوا باہر سے کسی اور کو مدعو نہ کیا گیا تھا۔

جہیز میں انہوں نے شیبہ کو کوٹھی اور منیب کو دس ہزار کا چیک دیا۔دو بجے کے قریب جب شیبہ کو رخصت کرنے کے لیے نیچے لایا گیا۔تو باپ سے لپٹتے ہی اس کی چیخیں نکل گئیں۔ڈاکٹر اشرف کی آنکھوں کے گوشے بھی بھیگ رہے تھے۔بیٹی انہیں کتنی پیاری تھی اور وہ آج ان سے جدا ہو رہی تھی۔اس کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے انہوں بے پناہ بوجھل آواز میں کہا۔

''میں نے تمہارے لیے ایک ایسا انسان منتخب کیا ہے بیٹے! جس پر مجھے بھی فخر ہے اور تمہیں بھی ہونا چاہیے۔

''منیب مَیں تم سے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔خدا کرے تم لوگ ہمیشہ خوش وخرم رہو۔''

’’انہوں نے اس کی پیشانی پر پیار کیا۔عمر شیبہ سے بری طرح لپٹا ہوا۔تھا۔اس وقت خالد کی کمی شیبہ جس بری طرح محسوس کر رہی تھی وہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔

بڑی مشکل سے دونوں بہن بھائیوں کو الگ کیا گیا۔روشن نے ڈاکٹر اشرف کا شکریہ ادا کیا اور کار دھیرے دھیرے چل دی۔

باب نمبر: 48

گردن مسلسل جھکائے رکھنے سے دُکھنے لگی تھی۔دل چاہتا تھا کہ ہر قسم کے احساس سے بے نیاز ہو کر وہ کار کی بیک سے سر ٹکا لے۔تا کہ گردن کو کچھ سکون مل جائے۔لیکن حجاب حائل تھا۔ویسے کار میں کچھ زیادہ افراد بھی نہ تھے۔اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ منیب پچھلی سیٹ پر اسما اور روشن کے درمیان شیبہ بیٹھی تھی۔اس کی بے کلی کو شاید اسما نے محسوس کر لیا تھا۔شانوں سے پکڑ کر اس کا سر اپنے کندھے پر رکھ لیا۔یوں اسے کچھ آرام مل گیا۔کافی دیر گذر جانے کے بعد روشن نے اس کا سر اپنی طرف موڑ لیا۔نو بجے کے قریب جب وہ گھر پہنچے تو اسما اور روشن اسے منیب کے کمرے میں لے کر آ گئیں۔

کچھ دیر بعد اسما رخصت ہو گئیں۔روشن کھانے لے کر آئیں ان سے کھایا ہی نہ گیا۔آنکھیں نیند کے خمار سے بوجھل ہو رہی تھیں۔چائے کے دو کپ پینے کے باوجود نیند بدستور آنکھوں میں امنڈی چلی آ رہی تھی۔اس نے آنے والے خوشگوار لمحات میں ڈوبنا چاہا۔سپنوں کی وادی میں کھونا چاہا۔لیکن نیند بھگانے کا ہر حربہ ناکام ثابت ہوا۔زچ آ کر اس نے سر تکیے پر پٹخ دیا اور پل بھر میں خوابوں کی دنیا میں پہنچ گئی۔

منیب جب اسما کو چھوڑ کر کمرے میں آئے تو شیبہ کو اطمینان کی گہری نیند سوتے دیکھ کر مسکرائے بنا نہ رہ سکے۔اپنے دامن میں حسن کی کلیاں سمیٹے وہ اتنے دلفریب انداز میں سو رہی تھی

کہ منیب کو یوں محسوس ہوا جیسے خوابوں کی سرزمین سے کوئی حسین شہزادی بھٹکتی ہوئی یہاں آ گئی ہے۔

آہستگی سے وہ اس کے قریب بیٹھ گئے۔اس کے ہونٹوں پر ملکوتی تبسم کھیل رہا تھا۔

''آج کی رات بھی بھلا کوئی سونے کی رات تھی۔تم سو رہی ہو شیبہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ آج میں تمہارے ان احمریں ہونٹوں پر پیار کی روشن کلیاں بکھیرنا چاہتا تھا۔تمہاری ہنستی ہوئی آنکھوں کی روشنی سے اپنے دل میں پیار کے دیپ جلانا چاہتا تھا۔تم سو رہی ہو۔سوتی رہو۔میں تمہیں جگاؤں گا نہیں۔''

دھیرے سے اس کا ہاتھ انہوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔سفید گداز اور خوبصورت ہاتھ ان ہاتھوں کو اس نے عمر بھر کے لیے تھاما تھا۔ہاتھ کو وہ اپنے ہونٹوں تک لے گئے۔کتنی دیر تک اس سے کھیلتے رہے۔پھر شب خوابی کا لباس تبدیل کر کے اپنے پلنگ پر آ گئے۔سونا چاہا لیکن آنکھوں میں نیند کہاں؟ کتنی دیر اس سے کھیلتے رہے۔پھر قدرے جھکتے ہوئے اس کی طرف بولے۔

شیبہ تم نے مجھ پر بہت ظلم کیا ہے''۔

''کیا کیا جائے؟'' انہوں نے خود سے کہا۔

الماری سے کتاب نکالی۔پڑھنا شروع کیا۔کتاب خاصی دلچسپ تھی۔وقت گذرنا شروع ہو گیا۔

رات کے تیسرے پہر اچانک شیبہ کی آنکھ کھلی تو اس نے ٹیبل لیمپ کی روشنی میں تکیے پر ٹیک لگائے منیب کو نیم دراز کتاب پر جھکے پایا۔خوشی کے بے پایاں احساس سے اس کی آنکھیں جگمگا گئیں۔وہ ہلکے سے کھانسی اور کھانسی کی یہ آواز کمرے کا سکوت توڑ گئی۔یکدم منیب نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور اس کی کھلی آنکھیں دیکھ کر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ ان کے لبوں پر آ گئی۔تیزی سے اس کی طرف جھکے۔لیکن اتنی ہی تیزی سے شیبہ اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ چکی تھی۔چند لمحوں

تک وہ ویسے ہی مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھتے رہے ۔پھراس کے ہاتھوں پراپنے ہاتھ رکھتے ہوئے بڑی ہی بوجھل آواز میں بولے ۔

''ہوں اوہوں بالکل غلط ۔اب چھپانے سے فائدہ؟میں نے اس رُخ روشن کو چار گھنٹے خوب جی بھر کر دیکھا ہے ۔''

دل میں لطیف دھڑکنوں کی ہلکی ہلکی موجیں اٹھ رہی تھیں ۔جذبات کا مدوجزر پُرسکون ساحل سے ٹکرا رہا تھا ۔آہستگی سے ہاتھ ہٹانے چاہے لیکن وہ خاصی مضبوطی سے ایک دوسرے پر رکھے گئے تھے ۔

ذرا زور سے انہوں نے ہاتھ ہٹا کر نیچے کر دیئے ۔لیکن اب شیبہ آنکھیں بند کر چکی تھی ۔بند بند آنکھیں جن پر پلکوں کی لمبی لمبی جھالریں پڑی تھیں ۔شرارت سے مسکراتا چہرہ،کائنات سمٹ کراس ایک لمحے میں مقید ہو گئی تھی ۔منیب کچھ اور جھک گئے اور پھراس کے گھنے بالوں سے کھیلتے ہوئے پیار بھری آواز میں بولے ۔

''نیند ابھی تک پوری نہیں ہوئی اور سونے کا ارادہ ہے؟''

لیکن وہ جواب نہ دے سکی ۔گرم گرم سانسیں چہرے سے ٹکرا رہی تھیں تنفس بے حد تیز ہو رہا تھا ۔چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا ۔ہونٹ خشک ہو رہے تھے ۔

''جواب دو نا ۔'' پیار بھرے لہجے میں اصرار تھا ۔

مخمور آنکھیں کھلیں اور انہوں نے منیب کی نگاہوں میں مچلتے جذبات دیکھے ۔آنکھیں خمار سے سرخ ہو رہی تھیں ۔

''پانی'' وہ بمشکل کہہ سکی ۔

تیزی سے اٹھ کر منیب نے جگ سے پانی گلاس میں انڈیلا اور اسے سہارا دے کر گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا ۔ٹھنڈا پانی پی کر اسے کچھ سکون سا ملا ۔

آؤ باہر چلیں ۔انہوں نے ہاتھ بڑھایا ۔

ان کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی ۔ اپنے بازوؤں میں لیے منیب اسے اس چھوٹے سے لان سے میں لے آئے جو انہوں نے خود بنایا تھا۔ باغبانی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ چاند کی دودھیا روشنی میں انواع واقسام کے پھول بڑے دلفریب نظر آرہے تھے۔ سنگِ مرمر کے بنچ پر منیب نے شیبہ کو بٹھا دیا اور خود بھی اس کے قریب بیٹھ گئے ۔

گردوپیش پر نظر دوڑائی ۔ چاند مسکرا رہا تھا۔ اس کی ضیاء پاش کرنوں میں اسے اپنے خوابوں کی تکمیل نظر آرہی تھی ۔ ہر چیز محبت و پیار کے ساغر میں ڈوبی ہوئی تھی ۔ ہوا میں سرسراتے ہوئے سرگوشیوں میں اسے کچھ کہہ رہی تھی ۔ آہستہ آہستہ نگاہیں منیب کی طرف اٹھیں ۔ ان کی نگاہوں میں محبت کے پیمانے چھلک رہے تھے ۔ حجاب سے اس نے فوراً سر جھکا لیا۔ آہستگی سے منیب نے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ نگاہیں ملیں اور اسے ایک انوکھا پیغام دے گئیں ۔ دل نے اس پیغام کو سنا ۔ انہوں نے جیب سے کیس نکالا اس کا ہاتھ تھاما اور پیار کی اولین نشانی بڑی تمنا سے اس کی انگشت حنائی میں پہنا دی۔

اگلی صبح تقریباً سات بجے منیب ناشتے کی میز پر بیٹھے شیبہ اور روشن کا انتظار کر رہے تھے ۔ انہیں انتظار کرتے کرتے بیس منٹ ہو چکے تھے ۔ لیکن دوسرے کمرے سے ابھی تک کوئی برآمد نہ ہوا ۔ انہوں نے تنگ آ کر خادمہ سے پوچھا۔

''وہ دلہن کو تیار کروا رہی ہیں ۔ منیب بیٹے! بس آیا ہی چاہتی ہیں ۔''

''دلہن'' انہوں نے زیرِلب یہ نام دہرایا۔ ''دلہن میری دلہن معاً نگاہیں اٹھیں اور روشن کے ساتھ ساتھ انہوں نے شیبہ کو کمرے سے باہر نکلتے دیکھا۔ شرمیلی نگاہوں سے شیبہ نے منیب کو ایک نظر دیکھا۔ کہنیاں میز پر ٹکائے چہرے کو ہتھیلیوں کے ہالے میں لیے اور نگاہوں میں اشتیاق ومحبت کی دنیا سمیٹے وہ اسے دیکھ رہے تھے ۔ قدم ڈگمگا سے گئے ۔ فوراً وہ روشن کو شانوں سے پکڑ کر ان کے پیچھے چھپ گئی ۔ اس معصوم سی ادا پر منیب اور روشن دونوں ہنس پڑے ۔ اس کی طرف رُخ پلٹتے ہوئے روشن نے اسے گلے لگا لیا اور یونہی گلے سے لگائے لگائے میز کے پاس لے آئیں ۔ منیب

کی آنکھوں کی تپش اپنے چہرے محسوس کرتے ہوئے وہ سرخ ہوتی جا رہی تھی۔

''منیب! اب دعوت کب ہونی چاہیے؟'' روشن نے پوچھا۔

''شیبہ کے امتحان سے فارغ ہونے کے بعد ہی سوچا جائے گا۔انہوں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

دھوپ تیز ہو رہی تھی۔منیب اب گاؤں کا چکر لگا آنا چاہتے تھے۔

''ماما'' وہ روشن سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے ''میرا خیال ہے اب گاؤں چلنا چاہیے۔''

''بیٹے اسما اور بی جان نے بھی تو ابھی آنا ہے۔'' روشن نے جواب دیا۔

''نہیں میں رات انہیں منع کر آیا تھا۔آپ تیار ہو جائیں اب'' انہوں نے کہا۔

''تم دونوں چلو! میں ذرا گھر کی صفائی سے فارغ ہو کر آتی ہوں۔''

''نہیں آپ ہمارے ساتھ چلیں۔'' شیبہ نے دھیمے سے لہجے سے میں کہا۔

تم چلو رانی بیٹی! میں ابھی کام سے فارغ ہو کر آتی ہوں۔''

کار منیب خود ڈرائیو کر رہے تھے اور وہ ان کے ساتھ والی سیٹ پر بڑی تمکنت سے بیٹھی تھی۔

'' کیوں ماما کو ساتھ باڈی گارڈ بنا کر لانا چاہتی تھیں۔'' مسکراتے ہوئے منیب نگاہوں میں شوخی لیے اس سے کہہ رہے تھے۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔یوں جیسے گھنٹیوں کی سریلی آواز فضا میں بکھر گئی ہو۔

''امتحان دینے کا خیال چھوڑو شیبہ! کیا رکھا ہے ان چکروں میں اب۔'' انہوں نے شرارت سے کہا۔

''واہ خیال چھوڑ دوں۔دیکھئے یہ بالکل غلط بات ہے۔میں نے امتحان ضرور دینا ہے نہیں تو ....'' اس نے تیکھی نظروں سے منیب کی طرف دیکھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

نہیں تو کیا؟ کیا کوئی الٹی میٹم دینا چاہتی ہیں بیگم منیب؟''

"بیگم منیب" پر شیبہ ہنس پڑی۔ پیار بھری نظروں سے انہیں دیکھا اور یہ انداز منیب کو سرشار کر گیا۔

وہ سارا دن اس نے بڑے ہی پر لطف طریقے سے گذارا۔ شام کو جب وہ روشن اور منیب کے ساتھ آنے لگی تو بے اختیار رو پڑی۔ اگلے دن اس نے لاہور آنا تھا۔ اس کی روانگی کے وقت روشن بہت اداس تھی۔ لیکن مجبوری تھی جب وہ اپنے گھر پہنچے تو عمر اس سے یوں ملا جیسے مدتوں سے بچھڑی ہوئی ہو۔ ڈاکٹر صاحب فوراً ہسپتال سے آ گئے۔ دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر انہیں بے پایاں خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

باب نمبر: 49

زندگی کسی ایسے مدھراور سریلے ساز کی طرح انہیں محسوس ہو رہی تھی ۔جس کی ہر لہر سے خوشی کے نغمے پھوٹتے ہوں ۔منیب صبح شیبہ کو یونیورسٹی چھوڑ کر جب واپس آتے تو ہسپتال چلے جاتے ۔خطرناک ترین آپریشنز میں ڈاکٹر اشرف کا ہاتھ بٹاتے ۔طبی صلاحیتوں میں بھی وہ ان سے اپنی قابلیت کا اعتراف کروا چکے تھے ۔دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر کچھ دیر آرام کرتے ۔شام کو شیبہ کو یونیورسٹی لینے چلے جاتے ۔رات کو ہسپتال میں راؤنڈ پر نکل جاتے اور شیبہ اپنی تیاری میں مصروف ہو جاتی ۔

منیب اگر چاہتے تو اُسے امتحان نہ دینے پر مجبور کر سکتے تھے ۔لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا ۔وہ ایک ہونہار طالبہ تھی اور اس کی دو سالہ محنت کا انہیں احساس تھا ۔محض چند دنوں کے لیے اسے ایم ۔ایس سی کی ڈگری سے محروم کر دینا انہیں ناپسند تھا ۔شیبہ اپنی خوش بختی پر نازاں تھی ۔شوہر پر جتنا فخر کرتی کم تھا ۔وہ بالکل دوستانہ ماحول میں وقت گذار رہے تھے ۔

ڈاکٹر اشرف رات نجمی کی شادی میں شرکت کے لیے چلے گئے تھے ۔صبح جب منیب کی آنکھ کھلی تو دیکھا شیبہ اپنے گھٹاؤں جیسے لمبے سیاہ بالوں کو تیزی سے باندھ رہی تھی ۔پشت ان کی طرف تھی ۔کلائی پر نگاہ ڈالی تو ساڑھے چھ بج رہے تھے ۔سات بجے وہ یونیورسٹی پہنچ جایا کرتی تھی ۔یونہی کچھ تنگ کرنے کا موڈ بن گیا ۔بازو آنکھوں پر رکھ لیے اور تھوڑی سی کھلی آنکھ سے اُسے دیکھتے

رہے ۔بالوں میں ربن ڈال کراس نے لمبی چوٹی پیچھے پھینکی اور ہلکا کاسنی دوپٹہ شانوں پر ڈالتے ہوئے وہ منیب کی طرف پلٹی ۔گیلا گیلا تولیہ ان کے چہرے سے لگاتے ہوئے وہ بڑے ہی شیریں لہجے میں اُن سے کہہ رہی تھی ۔

''ہم نے کہا ہے صاحب اٹھ جایئے پونے سات ہو رہے ہیں ۔''

لیکن منیب کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ دوسرے ہی لمحہ ان کے بازو کو اٹھا رہی تھی ۔بڑے ہی ضبط سے انہوں نے اپنی ہنسی روکی اور آنکھیں کھول دیں ۔

''اٹھنے کا ارادہ ہے یا نہیں ۔''اب لہجہ قدرے تیز تھا۔

''نہیں ''۔منیب نے سر نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟''اس کی حیرانی قابلِ دید تھی ۔طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟اور فوراً ہی وہ ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھ رہی تھی ۔

''طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے۔بس ویسے ہی موڈ نہیں ۔''انہوں نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''واہ کیا کہنے ہیں آپ کے موڈ کے؟سیدھی طرح اٹھیے؟مَیں لیٹ ہو رہی ہوں ۔''وہ اٹھلاتے ہوئے ان کے بازو کھینچ کر بولی ۔

''تنگ مت کرو شیبہ!میں نے ایک بار کہہ جو دیا ہے کہ آج میں نہیں جاؤں گا۔تم اکیلی ہی جاؤ''۔انہوں نے کروٹ بدل لی ۔

چند لمحوں تک وہ حیرانی سے انہیں دیکھتی رہی اور پھر کندھے جھٹکتے ہوئے انتہائی غصے سے بولی ۔

''ٹھیک ہے!''

لیکن اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھتی ۔انہوں نے لپک کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔وہ غصے کی بلندی پر پہنچی ہوئی معلوم ہو رہی تھی ۔اور منیب مسکرا رہے تھے ۔

''بس چھوڑ دیجئے میرا ہاتھ.....'' اس نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

سختی سے اس کے ہاتھ کو کھینچ کر انہوں نے اسے پلنگ پر گرا لیا اور ہنستے ہوئے بولے۔

''یہ روپ تو آج تک میں نے دیکھا ہی نہ تھا۔ پچ پچ یہ جلال یہ جمال''۔

''بس بس رہنے دیجئے۔ بنانے کی ضرورت نہیں''۔ اس نے اسی طرح بگڑتے ہوئے کہا۔

''کیا رہنے دوں''۔

''وہ اس کی طرف جھک گئے تھے۔ لہجے میں بے پناہ پیار تھا اور آنکھوں میں گہری محبت۔

''میں تو مذاق کر رہا تھا۔ پگلی تم سچ ہی سمجھ بیٹھیں۔''

شیبہ نے ان کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے وہ ان کی گود میں سر رکھ چکی تھی۔

''تم کتابیں ٹھیک کرو۔ میں پانچ منٹ میں تیار ہوئے جاتا ہوں۔'' انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''واہ! پانچ منٹ۔ پندرہ منٹ میں بھی تیار نہ ہوسکیں گے۔''

''کیوں کوئی عورتوں کی طرح مجھے سنگار تھوڑی کرنا ہے؟''

''بس بس رہنے دیجئے۔ آپ کی صنف نے تو سنگار کرنے میں عورتوں کو بھی مات کر رکھا ہے۔''

وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''یہ محض پروپگینڈا تم لوگوں کا ہے۔ ورنہ مردوں کی مصروفیات انہیں ایسی خرافات کی اجازت ہی کب دیتی ہیں۔''؟

''اللہ تیری شان بس کریں ان قصیدوں کو اچھے نہیں لگتے۔'' شیبہ نے نکٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے کہا۔

''یہ قصیدہ کب ہے؟ عین حقیقت ہے۔'' منیب اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے۔

''ہوں' اس ہوں میں کتنا گہرا طنز تھا۔منیب مسکرا اٹھے۔

سات بجنے میں پانچ منٹ پر وہ سیڑھیاں اُتر رہے تھے۔

اور دو ہی دن بعد جب شیبہ یونیورسٹی سے واپس آ رہی تھی تو دور سے ڈاکٹر اشرف کو برآمدے میں بیٹھا دیکھا۔تیزی سے وہ ان کی طرف لپکی۔نجمی کی شادی کی تفصیل پوچھی اور ماں کی آمد کے متعلق بھی دریافت کیا۔انہوں نے بتایا کہ وہ تقریباً ایک ہفتہ بعد آئیں گی۔

یہ ہفتے کی ایک خوش گوار شام تھی۔شیبہ کے پرچوں کے درمیان تین چھٹیاں آ گئی تھیں۔اسی لیے وہ مطمئن ہو کر منیب کے ساتھ باہر لان میں آ گئی۔آج انکا پکچر جانے کا پروگرام بھی تھا۔چائے سے فارغ ہو کر شیبہ نے تاش کے پتے میز پر جما دیئے اور کھیل شروع ہو گیا ایک دو بار شیبہ نے اپنے پتے اِدھر اُدھر سرکانے کی کوشش کی لیکن پکڑی گئی۔

''ڈھنگ سے کھیلیئے بیگم منیب یہ بے ایمانی نہیں چلے گی۔'' منیب نے اس پر گہری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔''

''ہائے اللہ یہی بات میں آپ سے کہنے والی تھی۔اس نے فوراً جوابی حملہ کیا۔

''خواب الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔یعنی ایک تو چوری اور پھر سینہ زوری''۔انہوں نے پتوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

''آپ تو ہٹ دھرمی سے کام لے رہے ہیں۔میں انصاف سے کھیل رہی ہوں۔''

وہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیا کہنے آپ کے انصاف کے۔'' انہوں نے اسے چڑایا۔

دراصل وہ قصداً بھی ایسی باتیں کرتے تھے اور جب وہ مچلتی۔غصے سے چلاتی۔ہاتھ پاؤں پٹختی۔اُس سے وہ انہیں بے انتہا پیاری لگتی۔وہ بیحد محظوظ ہوتے۔روٹھنے کا مرحلہ قریب آتا

تو اسے منا لیتے۔

اور اب اس کی آنکھ بچا کر انہوں نے دو پتے اٹھا لیے۔لیکن شیبہ نے باقی پتے اسی وقت پھینک دیئے اور پوری شدت سے چلائی۔

''بس میں نہیں کھیلتی بڑے آئے ایماندار کہیں کے۔''

تیزی سے انہوں نے پتے واپس رکھ دیئے اور حیرانی سے بولے۔

''کیا ہوا۔''

کیا کہنے ہیں آپ کے اس انداز معصومیت کے۔'' اس نے آنکھیں شرارت سے نچائیں۔

''آپ مجھے یہ بتائیں پتے کیوں اٹھائے تھے؟ اس نے یکدم دوسرا سوال کر دیا۔

''کونسے پتے، کیسے پتے؟ یہ دیکھو میرے پتے میرے ہاتھ میں ہیں۔ گن لو ان میں ایک بھی فالتو ہوا تو جو چاہے سزا دینا۔''

''بس جناب ہم آپ کے ساتھ کھیلتے ہی نہیں۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''لیکن کہاں؟'' منیب اسے اٹھتے دیکھ کر بولے۔پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے بولے۔

''بیٹھو نا ایک بازی اور ہو جائے۔''

بازی شروع ہو گئی لیکن اس بار شیبہ خود کو ہارتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔شرارت کرنے کو دل چاہا۔مسکراتے ہوئے اس نے منیب کی طرف دیکھا۔جو پوری دل جمعی سے کھیل میں مصروف تھے۔

''دیکھیے وہ کون ہے؟'' اس نے ان کی توجہ دوسری طرف مبذول کرنا چاہی۔

اس کے کہنے پر انہوں نے پلٹ کر دیکھا اور شیبہ سارے پتے اٹھا کر بھاگ کھڑی ہوئی۔اس کی اس ادا پر منیب بے اختیار مسکرا دیئے اور تیزی سے اس کے پیچھے بھاگے ساڑھی کو

دونوں ہاتھوں سے پکڑے وہ آگے بھاگ رہی تھی اور منیب اس کے پیچھے پیچھے تھے۔

تبھی بیگم اشرف کی ٹیکسی گیٹ میں داخل ہوئی۔اس وقت وہ لان کے آخری حصہ میں تھے۔بیگم اشرف نے شیبہ کو تو دور سے پہچان لیا لیکن لڑکا ان کی شناخت میں نہ آ رہا تھا۔ٹیکسی والے کو فوراً رخصت کرتے ہوئے وہ اپنا مختصر سا سامان اٹھا کر ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔یہ بھی غنیمت تھا کہ انہیں کسی نوکر نے نہیں دیکھا۔ان کا دماغ چکرا رہا تھا۔تیزی سے انہوں نے الماری سے دور بین نکالی اور آنکھوں پر لگائی۔یوں لگا جیسے کسی نے انہیں دہکتی آگ میں دھکیل دیا ہو۔

عشق و محبت کا کھیل کھیلا جا رہا تھا۔منیب اسے پکڑے کھڑے تھے ساڑھی کا آنچل ڈھلک کر بازوؤں پر آ گیا تھا۔بھاگنے کی وجہ سے تنفس بے حد تیز ہو رہا تھا۔منیب اس سے پتے چھین رہے تھے اور وہ پتوں کو چھپا رہی تھی۔وہ منیب کے اتنی قریب تھی کہ بیگم اشرف کو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا وہ وہیں بیٹھ گئیں۔

"بیٹی آگ سے کھیل رہی ہے اور باپ کہاں سویا ہوا ہے؟عظیم کردار کا مالک باپ"۔

تھوڑی دیر بعد اٹھیں۔پھر دیکھا۔اب منیب میز کے کنارے بیٹھے تھے اور شیبہ اپنی تمام تر دلفریبیوں سے ان کے شانے پر ہاتھ رکھے جانے کیا کہہ رہی تھی؟ہونٹ ہل رہے تھے۔آنکھیں محبت کے خمار سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

سورج ڈوب رہا تھا۔منیب نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور اس سے کچھ کہا اور ساتھ ہی کلائی بھی آگے کر دی۔فوراً دونوں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے چل پڑے۔

چال میں فاتحانہ شان تھی۔دوربین انہوں نے پھینک دی اور دھڑام سے صوفے پر گر گئیں۔

"کہیں شادی تو نہیں کر دی گئی؟"اُف وہ جل اٹھیں۔

"نہیں نہیں شادی کیسے ہو سکتی ہے؟ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔"شاید یہی طرز سلوک وہ شیبہ کا ہاشم سے دیکھتیں تو خوشی سے پاگل ہو جاتیں۔لیکن اب تو سوال مقابلے کا تھا۔عقل گم تھی۔دماغ

حیران تھا۔بیٹی نے اتنے پر پرزے نکال لیے تھے۔کافی دیر سوچوں میں ڈوبی رہیں کہ یکدم ہارن کی آواز پر چونک اٹھیں۔

ایک مردانہ آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی۔

جلدی کرو نا شیبہ! دیر ہو رہی ہے۔

بجلی کی سی تیزی سے وہ اٹھ کر کھڑکی کے ساتھ آ کھڑی ہوئیں۔کیا دیکھا کاش کبھی نہ دیکھتیں۔منیب کار کے قریب کھڑے نیم باز آنکھوں سے کسی کو آتا دیکھ رہے تھے۔شیبہ پاس آئی اور بیگم اشرف سن ہو کر رہ گئیں پیازی شفون کی بہترین کام دار ساڑھی میں ملبوس ہلکے ہلکے زیور اور بالوں کے جدید اسٹائل سے آراستہ وہ کس شان سے چلی آ رہی تھی۔منیب نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''پاپا کو بتا دیا ہے کہ ہم کب تک آئیں گے؟''

''میں نے عمر سے کہہ دیا ہے۔''اس کا جواب تھا۔کار سٹارٹ ہو گئی اور ساتھ ہی بیگم اشرف کو محسوس ہوا جیسے چھت گر گئی ہو۔سانس تک لینا مشکل ہو رہا تھا۔آنکھوں تلے اندھیرا چھایا جا رہا تھا۔

''خوب! تو گویا میرے جانے کی دیر تھی۔''۔ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئیں۔خادمہ نے انہیں دیکھا تو بھاگی بھاگی قریب آئیں۔

''آپ کب آئیں بیگم صاحبہ؟''

''یہ لڑکا کون تھا۔جس کے ساتھ ابھی ابھی شیبہ باہر گئی ہے۔''انہوں نے خادمہ کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''بیگم صاحبہ وہ صاحبزادی کے شوہر ہیں۔پندرہ دن ہو گئے ہیں ان کی شادی کو۔''

دل چاہا ستون سے سر ٹکرا کر پھوڑ لیں۔

''اتنا بڑا فراڈ! اتنا بڑا دھوکہ۔''انہوں نے کمرے میں پہنچ کر سر دونوں ہاتھوں سے تھام

لیا۔

''تم بھی تو دھوکہ اور فراڈ سے کام لے رہی تھیں۔تم بھی تو یہی کھیل کھیلنا چاہتی تھیں۔''
ضمیر میں زندگی کی رمق ابھی باقی تھی۔

''لیکن میں نے ایسا کیا تو نہیں۔''وہ چیخی۔

''کیا فرق پڑتا ہے؟ اگر تمہارا داؤ چلتا تو تم کیا کم کرتیں......مجبوری تھی۔''

''کیا حیثیت ہے؟ کیا وقعت رہ گئی ہے میری؟ نوکر کیا سوچتے ہونگے یہ گھر کی مالکن ہے۔اب تو سب کے کلیجوں میں ٹھنڈ پڑ گئی ہوگی۔

آہ! اشرف یہ تمہارے ترکش کا آخری تیر تھا جو تم نے میرے دل میں گھونپ کرا سے لہولہان کر دیا۔اب یہاں کیا ہے لہو رس رہا ہے۔کیا کروں؟ میں کہاں جاؤں؟ تکیے پر سر پٹخ دیا۔ آنکھیں بند کرلیں۔خود کو مجبور و بے بس پا رہی تھی۔

ایک خوفناک سا خیال دماغ میں رینگ آیا۔''ٹھیک ہے میرا وجود سب کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے۔اسے ختم ہو جانا چاہیے۔یہی سب سے اچھا علاج ہے۔

خواب آور گولیوں کی خاصی تعداد انہوں نے کھالی اور کمرہ بند کر کے سوگئیں۔گیارہ بجے کے قریب جب ڈاکٹر اشرف گھر آئے تو انہیں بیگم اشرف کی آمد کی اطلاع ملی۔ننکو کو بلا کر انہوں نے بیگم اشرف کا ردعمل پوچھا۔وہ انہیں یہی بتاسکی کہ۔

''صاحب وہ کچھ خاموش تھیں۔افسردہ سی۔آتے ہی کار میں کہیں چلی گئیں۔واپس آئیں تو میں نے کھانا کھانے کے لیے کہا۔لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔اب تو شاید سو رہی ہیں۔''

شیبا اور منیب کہاں ہیں؟''

''وہ شاید باہر گئے ہیں۔''ننکو نے جواب دیا۔

اسی وقت انہوں نے عمر کو بلوایا۔اس سے عامر کے متعلق پوچھا۔

''اُسے تو پاپا! ممی وہیں چھوڑ آئی ہیں۔''یہ عمر کا جواب تھا۔

''عمر تمہاری ممی کا حال کیسا ہے؟''

''خاموش بہت زیادہ تھیں ۔اپنے کمرے میں جاتے ہوئے مجھے برآمدے میں ملیں میں نے ان سے کھڑے ہو کر چند باتیں کیں ۔لیکن انہوں نے کوئی توجہ نہیں دی۔پریشان لگ رہی ہیں۔''

ڈاکٹر اشرف اس بات پر حیران تھے کہ آخر وہ تھوڑی دیر کیلئے کہاں گئی تھیں۔ممکن ہے کسی سے ساز باز کرنے گئی ہو۔اسی وقت خانساماں کو بلایا اور محتاط طریقے سے کھانا پکانے کی ہدایت کی ۔

ویسے وہ پریشان بہت تھے۔آخر احتیاطی تدابیر کہاں تک کام دے سکتی تھیں ۔کمرے میں بے قراری سے ٹہل رہے تھے ۔انہیں شیبہ اور منیب کا شدید انتظار تھا۔تبھی نوکر نے اطلاع دی کہ کوئٹہ سے ٹرنک کال آئی ہے فون پر فریدہ کے بھائی تھے ۔نوکر سے بیگم اشرف کو بلوانے کے لیے کہا۔نوکر نے آ کر بتایا کہ دروازہ اندر سے بند ہے اور میرے بار بار دستک دینے پر بھی نہیں کھولا گیا ۔ڈاکٹر اشرف فون ویسے ہی ......چھوڑ کر تیزی سے بھاگے۔دروازہ زور سے کھٹکھٹایا۔لیکن کوئی اسے کھولنے کے لیے نہیں آیا۔اب تو انہیں تشویش ہوئی ۔خدانخواستہ کہیں کچھ اور ہی نہ کر بیٹھی ہوں۔کھڑکی کا شیشہ توڑ کر چٹخنی کھولی اور اندر کود گئے ۔بیگم اشرف بے ہوش لیٹی تھیں قریب جا کر دیکھا تو وہ زندگی کے آخری سانس لے رہی تھیں ۔اگر چند منٹ کی تاخیر اور ہو جاتی تو شاید ختم ہو چکی ہوتیں ۔ڈرائنگ روم میں بھاگے ....ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر راشد کو فوراً پہنچنے کے لیے فون کیا۔

فوری طبی امداد دی گئی۔لیکن بچنے کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔موت وحیات کی کشمکش جاری تھی ۔کمرے میں مکمل سکوت طاری تھا۔ہسپتال کے قابل ڈاکٹر بستر کے گرد جمع ہو چکے تھے۔آکسیجن دی جا رہی تھی ۔

ساڑھے بارہ بجے جب شیبہ منیب کے ساتھ گھر پہنچی تو خلافِ معمول اسے نوکروں کی

چہل پہل دکھائی دی۔سبھی کمروں میں روشنی دیکھ کراس کا دل گھبرانے لگا۔کار کا دروزہ کھول کرتیزی سے باہر بھاگی۔برآمدے میں اسے ننکو دکھائی دی۔اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔وہ بےحد گھبرائے لہجے میں بولی۔

''ننکو خیریت ہے نا''؟

''بیگم صاحبہ نے کچھ کھالیا ہے۔ان کی حالت سخت خراب ہے۔''

اس کی جان ہی تو نکل گئی۔تیر کی سی تیزی سے وہ ان کے کمرے میں داخل ہوئی۔سفید اُجلے بستر پر وہ بالکل مردوں کی طرح پڑی تھیں۔دیوانوں کی طرح ان کی طرف بڑھی لیکن ڈاکٹر اشرف نے اسے آگے بڑھنے سے پہلے ہی تھام لیا۔اُن سے لپٹتے ہی اس کی سسکیاں نکل گئیں۔ماں کتنی بھی ظالم تھی۔انہوں نے بیٹی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔منیب بھی کمرے میں آگئے تھے۔وہ خاصے پریشان نظر آرہے تھے۔

شیبہ کی سسکیاں بند ہونے کا نام نہ لے رہی تھیں۔

''پاپا میں نے ممی کو قتل کیا ہے؟'' وہ پاگلوں کی طرح بستر کی طرف بڑھی۔لیکن ڈاکٹر اشرف نے اسے دوبارہ پکڑ لیا اور منیب سے اسے دوسرے کمرے میں لے جانے کے لیے کہا۔بازوؤں سے تھام کر منیب اسے باہر لے آئے۔برآمدے میں ستون کے پاس عمر کھڑا تھا۔بھائی پر نظر پڑتے ہی وہ رو پڑی۔عمر بھی رو رہا تھا۔دونوں بہن بھائیوں کو بازوؤں میں سمیٹے منیب اوپر لے آئے۔

وہ تو پاگل ہوئی جارہی تھی۔ڈاکٹر صاحب اوپر آئے۔بیٹی کی بےکلی اور اضطراب دیکھا تو اسے سینے سے لگاتے ہوئے بولے۔

''یوں اپنے ذہن کو پراگندہ مت کرو بیٹے۔دعا کرو کہ نئی زندگی کے ساتھ خدا اسے ایمان دے۔جن اندھیرے راستوں پر وہ بھٹک رہی ہے خدا کرے وہ صراطِ مستقیم سے بدل جائیں۔

ساری رات اس نے رو رو کر اور تڑپ تڑپ کر گزار دی۔ بار بار سسکیاں بھرتے ہوئے کہتی۔

''خدایا تو نے مجھے خوشیاں دی ہیں۔ ان خوشیوں پر گہن نہ لگانا۔ ان کی اتنی بھاری قیمت مجھ سے وصول نہ کرنا۔ میں اس کربناک خیال سے کبھی نجات نہ پا سکوں گی کہ میری ماں نے میری وجہ سے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔'' ساری رات منیب، ڈاکٹر اشرف اور دوسرے ڈاکٹر بیگم اشرف کے سرہانے کھڑے رہے۔ اگلا سارا دن بھی اسی طرح گذر گیا۔

اثر قدرے زائل ہو گیا تھا لیکن بے ہوشی بدستور تھی۔ کبھی کبھی تو محسوس ہوتا جیسے موت آگے بڑھ کر زندگی کے رشتے کو ختم کر رہی ہے۔ ایک دن اور بیت گیا۔ اب زندگی کی کچھ آس بندھتی جا رہی تھی۔ اسی دوران میں انہوں نے دو تین بار...... آنکھیں بھی کھولیں اور اپنے اوپر ڈاکٹر اشرف، منیب شیبہ اور عمر کو جھکے پایا۔

منیب کے لیے تو دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ اس لگن اور جانفشانی سے وہ ان کی تیمار داری کر رہے تھے کہ حقیقی بیٹے بھی نہ کرتے۔

چوتھے دن جب شیبہ پرچہ دے کر واپس آئی تو سیدھی ماں کے کمرے میں آ گئی۔ منیب چمچ کے ذریعے ان کے منہ میں پھلوں کا رس ڈال رہے تھے ان کی کھلی آنکھیں دیکھ کر شیبہ خوشی سے نہال ہو گئی۔ ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولی۔

''ممی آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟''

''بیگم اشرف نے پیار بھری نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔ بولنا چاہا لیکن نقاہت اتنی زیادہ تھی کہ بول نہ سکیں۔ منیب نے انجکشن انہیں دیا۔

رات کے کسی وقت بھی جب بیگم اشرف کی آنکھ کھلی۔ تو وہ منیب کو کرسی پر بیٹھے دیکھتیں۔ نرسوں کی موجودگی کے باوجود بھی بیشتر کام منیب ہی کرتے۔ ان کا یہ رویہ گھر کے بھی افراد کو بے حد متاثر کر چکا تھا۔

ایک رات دو بجے کے قریب بیگم اشرف کی آنکھ کھلی۔انہیں پیاس لگ رہی تھی۔کرسی سے ٹیک لگائے منیب کچھ پڑھ رہے تھے۔شیبہ پڑھتے پڑھتے سو گئی تھی۔بیگم اشرف نے ایک بھرپور نظر ان کے سراپے پر ڈالی۔

دل میں درد سا اٹھا۔میں نے اس انسان کے راستے میں کیسے کیسے کانٹے بوئے؟ لیکن وہ کس لگن سے میری خدمت کر رہا ہے؟ کتنا خلوص ہے اس کی تیمار داری میں؟ کتنی محبت ہے اس کے رویے میں؟ آہ میں ہی کم ظرف ہوں۔'اس قسم کے خیالات دماغ میں گھومنے لگے۔

''خدا شاید مجھے کبھی معاف نہ کرے۔میں نے دو پیار بھرے دلوں کو جدا کرنا چاہا تھا۔''

یوں محسوس ہوا جیسے حلق میں کوئی چیز پھنس گئی ہو۔

''پانی''

ان کی زبان سے نکلا۔

تیزی سے منیب ان کی طرف لپکے۔

''پانی؟انہوں نے ان پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

اور پھر ان کا سر اثبات میں ہلتا دیکھ کر وہ مڑے۔تھرموس سے ٹھنڈا پانی نکالا اس میں گلوکوز حل کیا اور دھیرے سے اپنے بازوؤں کے سہارے انہیں اٹھا کر گلاس ان کے منہ سے لگا دیا۔

''منیب بیٹے مجھے لٹاؤ نہیں۔''لیٹے لیٹے میری ہڈیاں دُکھنے لگی ہیں۔''

انہوں نے تکیے لگائے اور آرام سے انہیں بٹھا دیا۔سامنے بستر پر شیبہ سو رہی تھی۔

نحیف آواز میں ان سے بولیں۔

شیبہ کے پرچے ہو رہے ہیں شاید۔''

''جی ہاں''۔

''تم لوگ اتنی تکلیف کیوں برداشت کر رہے ہو؟ نرس کہاں ہے؟''

''خدا آپ کو صحت دے۔ہمیں کوئی تکلیف نہیں۔

شدتِ کرب سے انہوں نے آنکھیں بند کرلیں۔

کچھ دن اور گذر گئے۔ایک ایک فرد کی محبت اور پیار ان کے سامنے آیا شوہر کی بے چینی۔شیبہ کی حالتِ بیقراری اور سب سے بڑھ کر اس نوجوان کا جذبہ خدمت اور اسما کا دلکش سراپا نظروں کے سامنے آیا۔

غلط فہمیوں کے تو دے ٹوٹ پھوٹ گئے۔

نفرت کی دہکتی آگ گلزار بن گئی۔

سوچوں کے زاویے اپنا رخ بدل چکے تھے۔

''اسما تم حقیقتاً بہت عظیم ہو۔تم نے جس ایثار کو اپنایا۔تم نے جو قربانی دی وہ واقعی بے مثل ہے۔تم نے جو ہیرا میری جھولی میں ڈالا میں نے اس کی کوئی قدر نہ کی''۔

تکیہ پر سر پڑا تھا۔آنکھیں بند تھیں اور وہ ایسی سوچوں میں گھری ہوئی تھیں۔جب ڈاکٹر اشرف کمرے میں آئے۔

''کیسی طبیعت ہے فریدہ؟''انہوں نے بیگم کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

آنکھیں کھلیں۔ڈاکٹر اشرف ان پر جھکے ہوئے تھے۔شوہر کا ہاتھ۔انہوں نے اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔زندگی میں پہلی بار دل کی سچی چاہت اور جذبے سے وہ اس ہاتھ کو اپنی آنکھوں تک لے گئیں۔ہونٹوں سے لگایا۔آنسو چھلک پڑے۔

وہ سسک اٹھیں۔

''اشرف مَیں نے آپ کو...... بہت دکھ...... دیئے ...... ہیں ......اتنے دکھ...... کہ آج ......ان کے ......خیال سے ہی ......میرے ...... رونگٹے ......کھڑے ہو رہے ہیں۔اشرف آپ نے ...... مجھے مرنے ...... کیوں نہ...... دیا...... آپ بہت عظیم ہیں ...... میں آپ کے قابل ......واقعی ......نہ تھی۔''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ندامت کے آنسو اُمل اُمل کر بہہ رہے تھے اور سینے

کے داغ دھو رہے تھے۔

''روؤ نہیں فریدہ! میں خدا کا شکر گذار ہوں یہ تو اس کی رحمت تھی کہ اس نے تمہیں بچا لیا۔انہوں نے ان کا سر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''آپ ...... مجھے معاف ......کر دیں ۔ مجھے معاف ......کر ......دیں ......اشرف ...... میں ......جانتی ہوں ......کہ میں قابلِ معافی ......نہیں ۔''

انہوں نے آہوں اور آنسوؤں کے درمیان کہا۔

''یوں مت کہو فریدہ! خدائے عظیم نے تمہیں معاف کر دیا ہے ۔ یہ معافی نہیں تو اور کیا ہے کہ اس نے تمہاری آنکھوں پر پڑے غلط فہمیوں کے پردوں کو تار تار کر دیا ہے ۔تمہارے قلب کو نیکی کی روشنی سے معمور کر دیا ہے ۔''

انہوں نے بوجھل آواز میں کہا۔

''میں کل گاؤں جانا چاہتی ہوں ۔ میں اسما اور بی جان سے معافی مانگوں گی میں ان کے قدموں پر اپنا سر رکھ دوں گی ۔''

''اشرف''

''میں ......نے اپنی ......راہیں ......بدل ......ڈالی ہیں ......بدل ......ڈالی ہیں'' ......

آواز ہچکیوں میں ڈوب گئی۔

ڈاکٹر اشرف کے چہرے پر طمانیت سے بھرپور دھیمی سی مسکراہٹ تھی آنکھوں کے گوشے نم تھے اور وہ پیار سے ان کے آنسو پونچھ رہے تھے۔

حرفِ آخر

25 جولائی 1967ء

....